قلمکار اور قاری کے درمیان ایک پُل
سہ ماہی
45
نیا ورق
اسد محمد خاں
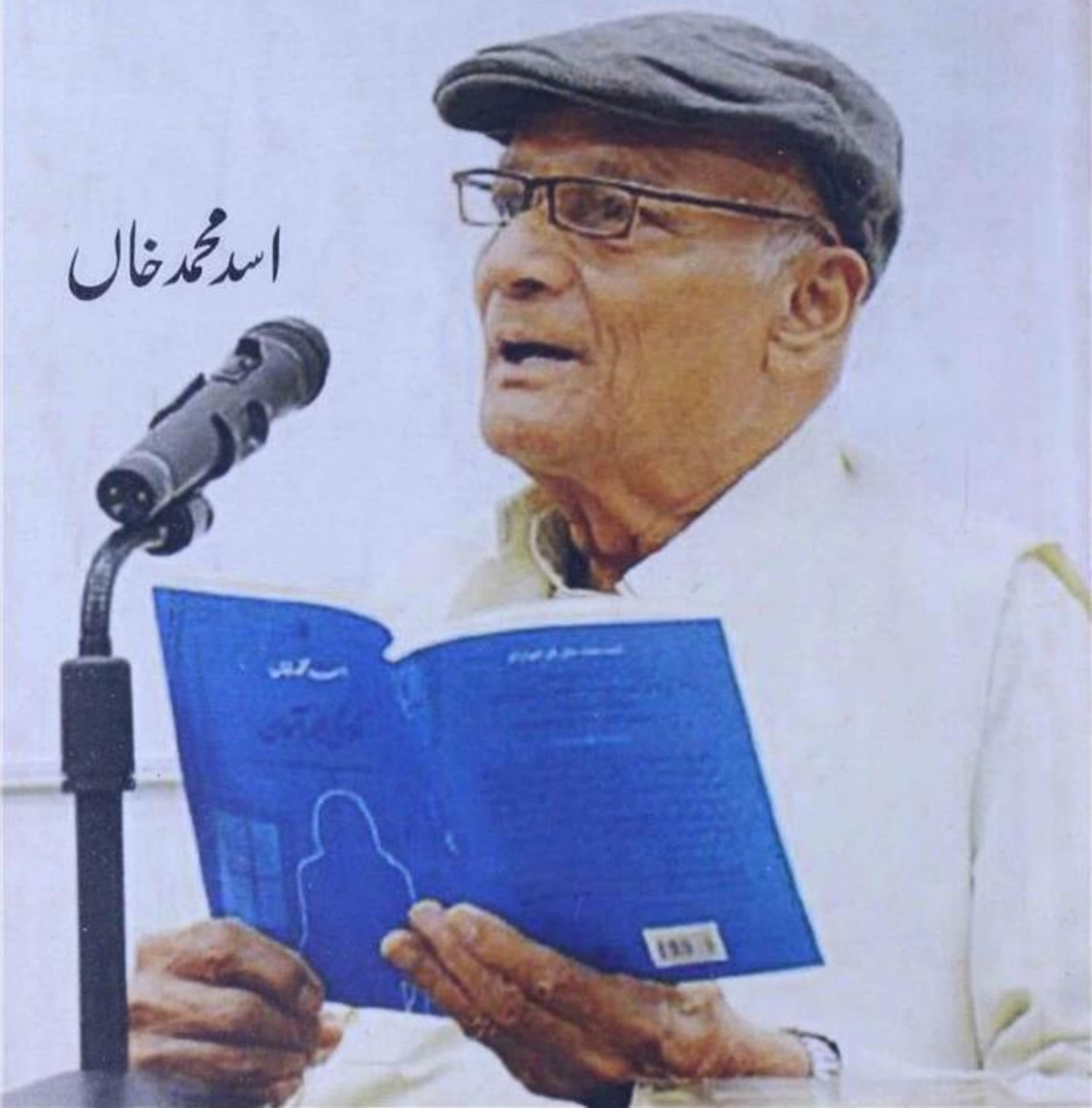
نیا ورق فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام دو روزہ سیمی نار

"وارث علوی - حیات و خدمات" ۱۴/ اور ۱۵ دسمبر ۲۰۱۳ء

استقبالیہ تقریب میں شمیم حنفی صاحب صدارتی خطبہ دیتے ہوئے
دائیں سے جاوید صدیقی، مولانا ابوظفر حسان ندوی، بشر نواز اور قاسم امام
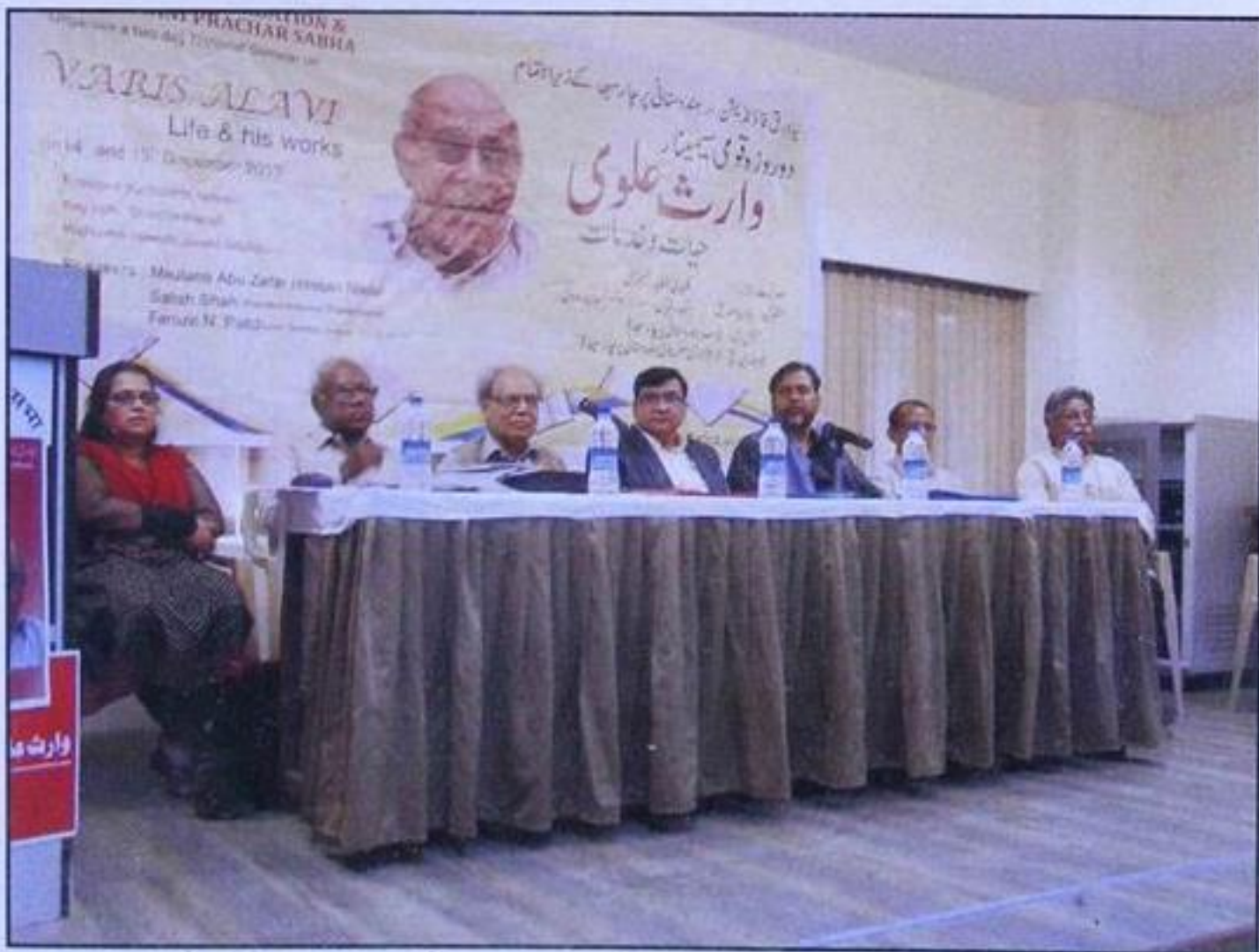
دائیں سے جاوید صدیقی، اسیم کاویانی، ظہیر انور، بیگ احساس، شمیم حنفی، سلیم شہزاد اور انجمن آرا

45

نیاورق

نیاورق

☆ جلد نمبر 17 شمارہ نمبر 45- اپریل تا ستمبر ۲۰۱۵ء

☆ قیمت فی پرچہ پچاس روپے، لائبریریوں سے سو روپے

☆ سالانہ دوسو روپئے رجسٹرڈ ڈاک سے تین سو روپے

☆ بارہ (۱۲) شماروں کی قیمت ساڑھے پانچ سو روپے

☆ لائبریریوں سے سالانہ چارسو روپے (سادہ ڈاک سے)

☆ بیرونی ممالک سے سالانہ پینتیس امریکی ڈالر ☆ اٹھائیس برطانوی پونڈ۔

نوٹ: نیاورق سے متعلق قانونی چارہ جوئی صرف ممبئی کی عدالت میں ممکن ہوگی۔

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر شاداب رشید نے پرتیک آفسیٹ، گائے واڑی، ممبئی سے چھپوا کر دفتر "نیاورق" 36/38 عمر کھاڑی کراس لین ممبئی سے شائع کیا

ساہتیہ اکادمی کی قابل مطالعہ کتابیں

نئی کتابیں

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات	گوپی چند نارنگ	450روپے
آرزو لکھنوی (ہندوستانی ادب کے معمار سیریز)	ضمیر کاظمی	50روپے
یاس یگانہ چنگیزی (ہندوستانی ادب کے معمار سیریز)	شعیب نظام	50روپے
عبدالستار رنجور (ہندوستانی ادب کے معمار سیریز)	کشمیری سے ترجمہ: جاوید مٹجی	50روپے
اسرارالحق مجاز (ہندوستانی ادب کے معمار سیریز)	شارب ردولوی	40روپے
معین احسن جذبی (ہندوستانی ادب کے معمار سیریز)	مشتاق صدف	40روپے
کلیات فراق گورکھپوری (غزلیات) ترتیب:	چودھری ابن النصیر	400روپے
آخری سلام (ہندی ناول) سنتوش کمار گھوش	انگریزی سے ترجمہ: ذکیہ مشہدی	300روپے
خون کا دریا (انگریزی ناول) اندرا پارتھا سارتھی	ترجمہ: فرحت عثمانی	160روپے
قیدی (ڈوگری ناول) دیش بندھو ڈوگرا نوتن	ترجمہ: بلراج بخشی	200روپے
صحت زبان شام موہن لال جگر بریلوی	مقدمہ: شمس بدایونی	100روپے
کنڑ کی نئی کہانیاں (افسانوی مجموعہ)	مرتبہ: خلیل مامون	150روپے
وقت کو سونے نہ دوں گا (تیلگو شعری مجموعہ)	این گوپی ترجمہ: رحمت یوسف زئی	100روپے
23 ہندی کہانیاں انتخاب: جینندر کمار	ترجمہ: وسیم بیگم	175روپے
ہم عصر کشمیری شاعری (کشمیری سے اردو ترجمہ)	ترتیب: عزیز حاجنی	150روپے
انتخاب مراثی دبیر	مقدمہ و انتخاب: سید تقی عابدی	180روپے
اردو کی خواتین فکشن نگار (سمینار)	مرتب: مشتاق صدف	250روپے
فراق گورکھپوری: شاعر، نقاد، دانشور (سمینار)	مرتب: گوپی چند نارنگ	300روپے
سجاد ظہیر: ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک (سمینار)	مرتب: گوپی چند نارنگ	200روپے
اردو کی نئی بستیاں (سمینار)	مرتب: گوپی چند نارنگ	300روپے
انیس اور دبیر — دو صد سالہ سمینار (سمینار)	مرتب: گوپی چند نارنگ	200روپے
ولی دکنی تصوف، انسانیت اور محبت کا شاعر (سمینار)	مرتب: گوپی چند نارنگ	200روپے
اطلاقی تنقید- نئے تناظر (سمینار)	مرتب: گوپی چند نارنگ	250روپے
آزادی کے بعد اردو فکشن (سمینار)	مرتب: ابوالکلام قاسمی	150روپے
بیسویں صدی میں اردو ادب (سمینار)	مرتب: گوپی چند نارنگ	250روپے
تذکرہ (ابوالکلام آزاد) 100 روپے	ترجمان القرآن (چار جلدوں میں)	800روپے
خطوط ابوالکلام آزاد 100 روپے	غبار خاطر (ابوالکلام آزاد)	100روپے
ہندوستانی افسانے ایڈیٹر: ای وی راما کرشنن	چیف ایڈیٹر: مغنی تبسم	250روپے
پاکستانی کہانیاں	مرتب: انتظار حسین، آصف فرخی	150روپے
بلونت سنگھ کی بہترین کہانیاں (بلونت سنگھ)	مرتب: گوپی چند نارنگ	150روپے

رابطہ: ساہتیہ اکادمی سیلز آفس، سواتی، مندر مارگ، نئی دہلی 110001، فون: 011-23745297, 23364204

فیکس: 23364207 ای میل: sahityaakademisale@yahoo.com

انتساب

پیدائش : ۲؍فروری ۱۹۲۹ء
وفات : ۵؍مئی ۲۰۱۵ء

پیدائش : ۱۹۳۱ء
وفات : ۴؍جولائی ۲۰۱۵ء

اقبال متین نے افسانوں اور عبداللہ حسین نے ناولوں میں اپنی اپنی پہچان بنائی۔ اقبال متین نے ایک ناول 'چراغِ تہِ داماں' بھی لکھا جو کافی پسند کیا گیا۔ اُن کے افسانوی مجموعوں پر کئی اعزازات و انعامات سے بھی نوازا گیا۔ افسانہ نگاری کے ساتھ ہی اُنھوں نے شاعری بھی کی جسے کافی سراہا گیا۔

عبداللہ حسین کے ناول 'اُداس نسلیں' کا شمار اردو ادب کے شاہکار ناولوں میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اُن کے 'قید'، 'نشیب'، 'نادار لوگ' اور 'رات' بھی کافی مقبول ناولٹ ہیں۔

اقبال متین اور عبداللہ حسین اردو ادب کے ایسے دو ستون تھے جنھوں نے زندگی بھر اپنے علم و ادب کے ذریعے اردو کو مالا مال رکھا۔

نیاورق ان دونوں فنکاروں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے یہ شمارہ اِن کے نام کرتا ہے۔

نیا ورق 45

دستخط (اداریہ)

افسانے

گوشہ اسد محمد خاں

نظمیں

غزلیں

خاکہ

ترتیب

سادہ ڈاک سے مراسلت کے لیے

Naya Waraq
Post Box No 5030
Chinch Bunder Post Office. Mumbai - 400 009.

رجسٹرڈ خطوط، کوریئر اور ترسیل زر کے لیے

Naya Waraq
36/ 38, Aloo Paroo Bldg,Umerkhadi Cross Lane,
Mumbai - 400 009 Tel : 9869 321477 / 9320 113631 / 2341 1854
E-mail: nayawaraq@yahoo.com, kitabdaar@gmail.com
Please drawn cheque in favour of "nayawaraq"

اداریہ

اکثریت کی منافقت اور ادیب کا موقف

دنیا کی تاریخ میں اقلیت پر اکثریت کے مظالم کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جہاں جہاں اکثریت نے اپنے متشدد پنجے گاڑے ہیں وہاں وہاں اقلیتی طبقے کی آہ و بقا سے پوری دنیا دہل اُٹھی ہے۔ یہی نہیں ظالم اکثریت اپنے ہی اندر کے دیگر اقلیتی فرقوں کو بھی نہیں بخشتی۔ جس کی مثال پاکستان میں قادیانی اور شیعہ مسلک ہیں تو ہندستان میں دلت اور نیچ ذات کے افراد۔

پاکستان میں اکثریتی طبقے نے اپنی اکثریت کے نشے میں چور وہاں کی اقلیتوں پر مظالم ڈھانے، اُن کی زمینیں ہتھیانے اور پرانی دشمنی نکالنے کے لیے 'تحفظِ ناموسِ رسالت' نامی قانون نافذ کر دیا جس کا بے جا استعمال کر اکثریتی طبقے نے کسی نہ کسی طریقے سے اقلیت کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ یہ ایسا قانون ہے جو اکثریتی طبقے کی عقیدت سے جڑا ہوا ہے اور جس کے خلاف آواز اُٹھانے والے سلمان تاثیر جیسے لوگوں کو گولیوں سے بھون دیا جاتا ہے۔

'نیا ورق' (شمارہ نمبر ۳۵) کے اداریے میں ساجد رشید نے پاکستان کے سیاسی حالات اور گورنر سلمان تاثیر کے قتل پر تبصرہ کرتے ہوئے اس بات کا اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ "ہندو آبادی اپنے عقائد کے مطابق اسی طرح کے کچھ قوانین نافذ کرا لیں تو اس ملک (ہندستان) کے دلتوں اور کمزور مسلمانوں کے خلاف ایسے قوانین کا استعمال کس سطح پر ہوگا..."

"بیف بین قانون" اس اندیشے کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ جس کے خلاف ورزی کی صرف افواہ پر ہی دادری کے محمد اخلاق نے اپنی جان گنوادی۔ اور اس سب کے پیچھے اکثریتی طبقے کے جو افراد شامل ہیں اُن پر حکومت کسی بھی قسم کی کارروائی کرنے سے اپنا پلّہ جھاڑ رہی ہے۔ وہیں حکومت میں شامل پارلیمنٹ رُکن کھلے عام میڈیا کے سامنے اس قانون کو توڑنے والوں کے لیے جان سے مار دینے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ ہمارے

وزیر اعظم جو ایک وقت پر سابق وزیر اعظم پر گونگے اور ریموٹ پر چلنے والے وزیر اعظم کا الزام عائد کرتے رہے ہیں، وہی اب نہ صرف گر نگے۔بن گئے ہیں بلکہ گاندھی جی کے تینوں بندروں کی خصوصیات کے ساتھ غیر ملکی دوروں اور بہار کے الیکشن کیمپین میں مصروف ہیں۔ ہندی کے مشہور شاعر اشوک واجپئی نے وزیر اعظم پر طنز کیا ہے کہ "وزیر اعظم اچھے مقرر ہیں لیکن نہ جانے کیوں وہ وہاں خاموش ہو جاتے ہیں جہاں اُن کے بولنے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔"

یو پی کے وزیر اعلیٰ اور پارٹی کے چیف بھی اس طرح بیان دے رہے ہیں جیسے اُن کی حکومت میں اس سے پہلے کبھی کچھ غلط ہوا ہی نہیں تھا۔ دادری کے واقعے پر اشاروں اشاروں میں اُنھوں نے صرف اتنا کہہ کر اپنا پلہ جھاڑ دیا ہے کہ دادری کانڈ کے ذمہ داران، مظفر پور کے ملزمین ہی ہیں۔ افسوس دونوں اضلاع یو پی میں ہی آتے ہیں اور دونوں ہی فسادات میں وزیر اعلیٰ ایک ہی تھے۔ وہیں اُن کے سینئر ایم۔ ایل۔ اے۔ اپنی ہی ریاست میں ہوئے اس سانحے کی شکایت اقوام متحدہ کو خط لکھ کر رہے ہیں!

دادری میں ہوئے اس شرمناک حادثے کے بعد سیاست دانوں کے اس ردِ عمل سے ہمیں کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ کیوں کہ جب سے یہ حکومت بنی ہے، اس نے اپنا موقف آہستہ آہستہ ہی سہی لیکن صاف تو کر ہی دیا ہے کہ اس ملک میں اقلیتوں کو بلکل اسی طرح رہنا ہوگا جس طرح پاکستان اور بنگلہ دیش کی اقلیتیں رہتی ہیں۔ جس پر تسلیمہ نسرین نے چبھتا ہوا جملہ کہا ہے، "یہ ہندستان کو 'ہندو سعودی' بنانا چاہتے ہیں۔"

حکومت کی ایسی دیگر پالیسیوں کی طرح ایک پالیسی یہ بھی ہے کہ عام آدمی کا صرف نوالہ ہی نہیں بلکہ جو تھوڑی بہت سہولیات کی چیزیں اُسے میسر ہیں وہ بھی اُن سے چھین لی جائے۔ پہلے چائے، پھر کیلے، آم، پیاز، دال اور اب بیف، آہستہ آہستہ عوام سے دور کر غیر ملکوں میں اکسپورٹ کر دینا، انہی پالیسیوں میں سے ایک ہے۔ پتہ نہیں اکثریت کی گائے ماتا سے یہ کیسی عقیدت ہے کہ اگر ان کے ہی ملک کے لوگ اُسے کھائیں تو ظالم کہلاتے ہیں مگر دوسری طرف گائے کو پوجنے والے خود ہی اس کے گوشت کو اکسپورٹ کر دوسرے ملکوں میں پروسنے پر پوری دنیا سے سبقت لے جانا چاہتے ہیں۔ World Beef Exports: Ranking of Countries کے مطابق ۲۰۱۵ء میں ۳۲ ملکوں میں ہندستان دنیا میں سب سے زیادہ (ایک ملین ٹن) 'بیف' اکسپورٹ کرنے والا ملک بن گیا ہے۔ 'بیف بین قانون' کے پس پشت یہ حکومت کیا واقعی اکثریتی طبقے کے عقائد کی حفاظت کر رہی ہے یا پھر کارپوریٹ سیکٹر کی اس میں بھی کوئی سازش ہے! خیر ہمارے وزیر اعظم نے تو یہ اعلان پہلے ہی کر دیا تھا کہ وہ ایک بنیا ہیں اور دھندا کرنا جانتے ہیں۔

وزیر اعظم کی بنیا گیری کے چلتے سارے ملک کا امن و امان درہم برہم ہو چکا ہے۔ عام لوگ تو پہلے سے ہی ستائے جا رہے تھے، اب ادیب بھی ان کے نشانے پر آ گئے ہیں۔ دابھولکر، پانسرے اور کلبرگی جیسے ادیبوں کے بہیمانہ قتل نے اکثریتی طبقے میں دہشت پسند عناصر کی پول کھول دی ہے۔ وہیں اکثریتی فرقے کے عقائد کی رکھشا کے لیے بنائی گئی دہشت پسندانہ تنظیموں کے ذریعے دادری میں محمد اخلاق کا قتل، مین پوری میں 'رفیق شفیق' اور بنگلور میں ابراہیم کو مارنے پیٹنے والے معاملات سامنے آ رہے ہیں۔ کل تک جس میڈیا پر ایک طرفہ

رُخ اپنانے کا الزام تھا وہی میڈیا آج پوری ایمانداری سے ان معاملات کو نشر کر کے اپنی کھوئی ہوئی ساکھ بچانے میں لگا ہے۔ یہ پہلا واقعہ نہیں ہے جب میڈیا نے پوری ایمانداری دکھائی ہے۔ پونے میں واقع FTII میں موجودہ حکومت کے ذریعے ہوئی غیر ذمہ دارانہ تقرری پر جب وہاں کے طلبا نے احتجاجی مظاہرہ شروع کیا تو وہاں بھی میڈیا نے پوری دیانت داری سے حکومت مخالف اس مظاہرے کی رپورٹ پیش کی۔ اس مظاہرے کی خوش آئند بات یہ ہے کہ ان کی آواز میں آواز ملا کر اکثریتی طبقے کے وہ لوگ بھی کھڑے ہیں جن کے دم سے آج بھی سیکولرازم کی مشعل روشن ہے اور جن کا آج بھی ہندستان کی جمہوریت پر پورا پورا یقین قائم ودائم ہے۔

خیر حکوت کی اسی مجرمانہ خاموشی اور بے حسی سے تنگ آ کر ملک کے بہت سے قلم کاروں نے حکومت کے خلاف آواز اُٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ مگر اس بار قلم کے بجائے اُنھوں نے اپنا ہتھیار اُن اعزازات کو بنایا ہے جو اُنھیں اسی قلم کے بدولت حاصل ہوئے تھے۔

ساہتیہ اکاڈمی ۲۴ زبانوں کے ادیبوں کو ہر سال ساہتیہ کے انعام سے نوازتی ہے، جو اُن کے ادبی خدمات کا اعتراف ہوتا ہے۔ یہ ادارہ ثقافتی وزارت کے ماتحت آتا ہے جس کا وزیر موجودہ حکومت کا منتخب کردہ ہوتا ہے۔ حکومت کی بے حسی سے بدظن ہو کر نین تارا سہگل، اشوک واجپئی جیسے متعدد ادیبوں کا ساہتیہ اکاڈمی انعامات واپس کرنا اور پنجابی قلم کار دلیپ طور توانا' کا تو پدم شری جیسا قومی انعام لوٹانا خوش آئند اقدام تو ضرور ہے مگر افسوس کہ ہماری اردو زبان سے صرف اکا دکا ادیبوں کے علاوہ کسی نے بھی ساہتیہ اکاڈمی جیسے قومی انعام کو لوٹانے کی جرأت نہیں کی ہے۔ ہاں رحمن عباس، شمیم عباس اور مشتاق کریمی جیسے ادیبوں نے اپنا ریاستی انعام لوٹا کر دنیا کو ایک پیغام دینے کی ادنا سی کوشش تو کی ہے کہ تمام اردو ادیب ایک جیسے نہیں ہیں۔ مگر دوسری طرف اردو زبان کے زیادہ تر ادبا وشعرا اپنے انعامات نہ لوٹانے کے چور دروازے تلاش رہے ہیں اور کچھ ادیب اُن دروازوں پر سے اپنے بڑے بھائیوں کے جوتے تک اُٹھانے کے لیے تیار ہیں۔ کیا پتہ اس جوتا اُٹھائی پر اُنھیں گیان پیٹھ یا پدم بھوشن جیسے انعامات تفویض کر دیے جائیں!! دراصل آج کے یہ نام نہاد ادیب خود پرستی کا شکار، اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر بیٹھ گئے ہیں۔ ایک نظم، غزل، مضمون یا افسانہ کسی رسالے یا اخبار میں چھپوا کر یا کسی دس بارہ افراد کے مجمعے میں سنا کر جھوٹی واہ واہی لوٹ کر بڑے جوش وخروش کے ساتھ فیس بک یا واہٹس ایپ پر اپنا سینہ ٹھونکتے پھرتے ہیں کہ اُنھوں نے اپنی تخلیق میں کس طرح حقیقت کی عکاسی کی ہے یا حکومت کے خلاف آواز بلند کی ہے جب کہ اُن کے محلّے اور پڑوس میں رہنے والے تک اُن کے کارنامے تو دور کی بات ہے نام تک سے ناواقف ہوتے ہیں۔

ظالم سے انصاف کی امید قطعی نہیں کی جاسکتی مگر ظلم جب انتہا کی حد پار کر جائے تو اُسے برداشت کرنا نہ صرف خود پر ظلم ہوگا بلکہ معاشرے میں ہماری ساکھ پر بھی سوال کھڑا کر دے گا۔ تمام زبانوں کے ادبا کو ایک جٹ ہو کر سوچنا ہوگا کہ کیا آج صرف قلم کی طاقت پر ہی بھروسا کیا جاسکتا ہے؟ کیا ایک ادیب کی ذمہ داری صرف اور صرف کسی اخبار، رسالے یا کتاب میں ظلم کے خلاف تحریری احتجاج درج کر دینا ہے؟ میرا خیال ہے

کہ حکومت کی جانب سے دیے گئے اعزازات کو لوٹا کر اپنی ناراضگی اور بے اطمینانی کا مظاہرا اس احتجاج کو اور مؤثر بنادے گا۔ بہرکیف دیگر زبانوں کی طرف سے تو پہلا پتھر پھینکا جاچکا ہے... اب ہماری باری ہے...

اس وقت ملک کے جو حالات نظر آرہے ہیں اُس کے لیے وقت ہو چلا ہے کہ ہر زبان کے ادیب کو اپنے وجود کا نہ صرف احساس دلانا ضروری ہے بلکہ انھیں اپنا موقف بھی طے کرنا ہوگا کہ وہ کس کے ساتھ ہیں اور یہ کام صرف قلم سے نہیں ہو سکتا، اس کے ساتھ احتجاج کے دوسرے متبادل بھی تلاشنے ہوں گے۔ کنڑ کے مشہور قلم کار 'چدا نند اسالی' کا یہ جملہ اس کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے کہ "ادیب کو ہمیشہ حزب مخالف کی جماعت کی طرح کام کرنا چاہیے۔"

☆

۷۰ کے بعد کے افسانہ نگاروں میں ساجد رشید نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اپنی ایک الگ پہچان بنالی تھی۔ لیکن اُن کے چار افسانوی مجموعوں کے منظرِ عام پر آجانے کے بعد بھی اُن کے افسانوں پر جتنی بات ہونی چاہیے تو وہ نہیں ہو سکی۔ اس لیے نیا ورق نے اس ضمن میں پہلا قدم اُٹھایا ہے اور کوشش کی ہے کہ اس شمارے سے ساجد رشید کا ایک افسانہ، تجزیے کے ساتھ شامل کیا جائے تا کہ اُن کے افسانوں کے نئے در کاری پروا ہو سکیں۔ اُمید ہے یہ سلسلہ ہمارے قارئین کو پسند آئے گا۔

☆ شاداب رشید

ناصر راہی

بلّی لوٹن

آپ میں سے ایسے بھی ہوں گے جو جاننا چاہیں گے کہ مولانا شافی کون ہیں اور نوراں کون؟ اور یہ کہ نیند کی وادیوں میں خوابوں کے پرندکیوں اپنے پَر تولتے رہتے ہیں؟

مولانا شافی مدرسہ نورالعلوم نورکہ جس کی بناء ابھی دو سال قبل رکھی گئی ہے، فی الوقت جہاں تحتانیہ، فوقانیہ اور وسطانیہ کے درجات قائم اور رواں ہیں۔ مولانا شافی وہاں صدر مدرس کی کرسی پر فائز ہیں۔ وہ خوش خصال معلم کے علاوہ قاری، عالم، فاضل اور ایک عمدہ معبر بھی ہیں۔ خواب اندر خواب کی تعبیر بتاتے ہیں، نقش اور تعویذ دیتے ہیں۔ علاقے میں ان کی خوب مشہوری ہے۔ آسیبی سایے اور شیطانی حرکات والی پر چھائیوں سے لڑنے کے سبب ان کی خوب چاندی بنی رہتی ہے۔ صدر مدرسی کی تنخواہ بجز الگ۔ اس چھوٹے سے شہر میں ان کی اپنی دیوڑھی آسیب زدہ لوگوں کے لئے تتریہ گاہ ہے، جہاں سے مریضوں کو نصرت حاصل ہوتی ہے۔

نوراں ان کی بیگم ہے جو اب سے بارہ سال پہلے ان کی زوجیت میں آئی ہے۔ وہ پڑھی لکھی، خوبصورت،

خوش گفتار ہے اور خواب بیانی میں بے حد طاق کہ وہ جس خوش بیانی سے رؤیا کی کڑیوں کو لفظوں کے دھاگوں میں پروتی ہے کوئی آہن گر بھی حلقۂ زنجیر کو یوں نہ باندھتا ہوگا۔ اس سے تو بڑا قصّہ گو بھی مات کھا جائے۔ جب جہاں چاہا آنکھوں کے سامنے روشن لفظوں کی کہکشاں رکھ دی۔ میاں جی! ساتھ میرے چل سکو تو چلو!

خواب! خواب تو ہمارے سہ شعور کے فکری اختلاط کا نتیجہ ہوتے ہیں اور اپنا اظہار چاہتے ہیں اور اظہار میں جب باہمی تطابق ہوتا تو ہم ایک دوسرے کے من کے کھوٹ کے رازدار ہوتے یا پھر گوشت سے ایک دوسرے کے ناخن جدا کرتے کرتے تھک سے جاتے تب دکھ اور رنج کے ایک جیسے کالے پرندوں سے نیلا آسمان سیاہ پڑ جاتا تو یہ عمل ہم پر کس قدر اذیت ناک اور تباہ کن ہوتا تو دھرتی آکاش کو شکایت بھری نظروں سے گھورتی ہوئی ہوتی اور مٹی کا سچ جان لینے کے بعد آکاش دھرتی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا منہ پھیر لیتا۔

خواب مشترک ہوں یا نہ ہوں۔ یہ ذرا ضرر رساں کم ہوتے ہیں کہ تشدد اس کی جبلت میں نہیں۔ خواب کے ہاتھوں نہ کبھی جنگ ہوئی ہے نہ کبھی خون بہا ہے۔ مگر پھر بھی کوئی مردِ خدا ایسا نہیں جو اس دُشٹ کو پھانسی کے پھندے تک لے جائے۔

وہ خواب جسے نوراں نے دیکھا تھا۔ رات کا کوئی اجلا اندھیرا پہر تھا۔ نو وارد کوئی بر انداز شہزادہ جان پڑتا تھا۔ گورا رنگ، چھریرا بدن اور قد قدرے دراز تھا۔ اس کی بڑی بڑی سرخ اور چمکدار آنکھیں شیر چیتوں جیسی تھیں۔ اس نے سفید چوڑی دار پاجامہ اور سبز رنگ کی قمیص جس میں رنگ برنگے تاروں سے مور کے سے خوبصورت نقش کشیدہ تھے، پہن رکھے تھے۔ انگلیوں میں بیش قیمت پتھروں سے مندھی ہوئی انگشتریاں اس کی شہزادگی پر دال تھیں۔ جانے کس طرح اور کہاں سے وہ ہمارے بستر کے قریب آن پہنچا اور مجھے میرے نام سے پکار کر کہنے لگا۔ ’’نوراں، میرے ساتھ چلو کہ میں تمھیں لینے آیا ہوں۔ دیکھو تمھاری خاطر میں نے بہت تھکا دینے والی ایک لمبی مسافت طے کی ہے۔ قبل اس کے کہ تمھارے میاں اور بچے بیدار ہوں اٹھ چلو۔‘‘ اتنا کہہ کر اس نے اپنا لمبا ہاتھ میری طرف بڑھایا تھا۔ میں خوف اور سکتے کی ماری، اپنی گنگ ہوئی زبان لیے بستر پر پڑی رہی اور درونِ دل اپنے رب کو یاد کرتی رہی۔ بارے خدا بڑی ہمتوں کے جتان سے زبان پر یہ کلام الٰہی لاسکی۔ **لا اله الاّ انت سبحانک انی کنت من الظالمین**۔ گو کہ قوتِ گویائی مجھ میں پلٹ آئی تھی۔ میں نے آواز پر آواز دی آپ کو، اپنے ہاتھ آپ کے بدن پر ڈالے اور جھنجھوڑے لیکن آپ کی خواب خرگوشی نہ گئی۔ شاید اس کے دل پر اس بابرکت دعا کا اثر ہوا تھا۔ وہ نہ کچھ مجھ سے برہم ہوا اور نہ برافروختہ۔ بلکہ میری نظروں سے وہ فوراً روپوش ہوگیا۔ پھر میں گہری نیند جا سوئی۔

(نوراں نے بتایا تھا کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آیا تھا۔ رات سنائے میں اس نے راہوار کے ہنہنانے کی آواز سنی تھی)

غالباً نوراں داستانی قصے کہانیوں سے گزر کر اپنی زوجیت میں آئی تھی۔ جبھی تو اس نے شب کی رہ گزر میں کسی نوجوان شہزادے کو دیکھا۔ ماضی کی یادوں کے بحر بیکراں سے کون ہے جو ابھر سکا ہے، جسے ابھارنا بھی چاہو اس میں اسی قدر ڈوبتا چلا جاتا ہے کہ حافظے کی شاخوں پر یادوں کے پرند کبھی چہچہانا نہیں بھولتے۔

مدرسہ میں طلبہ اپنے اپنے مدرسوں سے درجہ بدرجہ تدریس پا رہے تھے۔ مولانا شافی ان سے ہو کر اب اپنی کرسی پر آ بیٹھے تھے۔ مگر شعور کی دیواروں میں تردد کے جالے ویسے ہی پڑے ہوئے تھے، جنھیں صاف کرتے ہوئے وہ از خود بڑبڑا رہے تھے کہ نوراں کی نیندوں میں در آنے والا شخص اتنا بے باک اور نڈر بھی ہو سکتا ہے۔ ایسا کردار تو مافوق الفطرت ہی ہو سکتا ہے جو عشق و تعشق کے قلعے منٹوں میں سر کر لیتا ہے۔ بادی النظر میں اس کا مکمل آدمی کو دم بخود کر دینے والا، دل پر گھہرے بچھو کے اور ذہن کو گزند پہنچانے والا تھا۔ انھوں نے دانستہ کبھی بھی ان خواب صورتوں کے آگے آئینہ تعبیر نہیں رکھا۔ البتہ دعائے توفیق خیر کی۔ جب مدرسہ میں مامور ایک کاربند ان کے پاس آیا۔ سلام بجا کر بولا۔ "حضرت قبلہ! کوئی ملاقاتی ہیں، آپ کی شرف یابی چاہتے ہیں، اجازت ہو تو خدمت میں حاضر کروں۔"

مولانا شافی نے جبراً و قہراً کہا۔ "جاؤ، انھیں لے آؤ۔"

انھوں نے اسی وقت اپنے حواس درست کیے۔ گھری، کالی داڑھی پر اپنے ہاتھ پھیرے اور چہرے پر رعونت لائی۔

کاربند ملاقاتی کو اپنے ساتھ لے آیا۔ ان دونوں نے ہاتھ جوڑ کر مولانا کو نمسکار کیے۔ مولانا نے نہایت شستہ و رفتہ انداز میں ان دونوں کو سامنے والی کرسی پر بیٹھ جانے کو کہا۔ ان کا دفتر گھری خوشبو کی مہک سے دمک اٹھا تھا۔ ان میں مرد بڑا فربہ جسم والا اور کشیدہ قامت تھا اور چہرے سے سخت گیری ظاہر تھی۔ عورت سڈول جسم والی، عمر کے یہی پینتیس چھتیس کے پیٹے میں ہوگی۔ اس کی بڑی اور کرنجی آنکھیں، ان سے بے لاگ اور بے اعتنائی نظر آ رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں۔ "بے کار، سب بے کار!"

"کہیے کیسے تکلیف کی؟ بندہ ناچیز آپ لوگوں کی خدمت کے لئے حاضر ہے۔" انھوں نے ان دونوں کے چہروں کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"مولانا صاحب جی، میں سردار سرت چند سنگھ اور آپ ہیں میری دھرم پتنی سلوچنا کور۔ کچھ دنوں سے ایک جیسے خواب نے انھیں پریشان کر رکھا ہے جو سچ پوچھیے، ان کی پریشانی کے کارن یہ دو جانور سگ اور مار رہے ہیں۔ ان کے نام سے ہی ان کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے اور ان کی یہی کمزوری ان کے لئے آزارِ جاں بن جاتی ہے۔"

انھوں نے اسی لمحہ سلوچنا کور کی شعلہ رخی پر اتنی تیز نگاہ مرتکز کر دی اور قدرے ٹھہر کر کہا۔ "دیکھیے، کتے اور سانپ کی بہت ساری خصلتیں ہم میں مشترک ہیں اور پھر ہر شخص اپنی فطرت اور عادت کے مطابق قدرت کی چیزوں کو قبول اور رد کرتا رہتا ہے۔ رد و قبول کی شعوری کشمکش کا نام خواب پریشاں ہے۔ چونکہ آپ جس قدر سگ اور مار کو ناپسند کرتی ہیں اسی قدر خوف زدہ بھی رہتی ہیں۔ بس اس کارن آپ بے خوابی میں مبتلا ہیں۔ اچھا یہ بتائیے کہ سپنے میں اور کیا کچھ دیکھتی ہیں آپ؟ اور اس وقت رات کی کون سی گھڑی ہوتی ہے۔ تفصیل سے بتا پائیں گی تو مجھے سمجھنے اور حل نکالنے میں آسانی ہوگی۔"

مولانا کے استفسار پر نہ چاہتے ہوئے بھی سلوچنا گویا ہوئی۔ "مولانا صاحب جی، ہمارا شاندار ایک کشادہ بنگلہ

ہے، کانٹے دار اونچی چار دیواری سے گھرا ہوا۔ ہمارے بنگلے میں ورٹیکل گارڈن ہیں اور بے شمار موسمی پیڑ دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ بنگلہ کے دو پاٹوں میں آدھی دنیا کے خوبصورت وخوشنما پھولوں کے باغات ہیں کوئی ایسا پھول نہیں جو ہمارے باغ کی ڈالی پر نہ آتا ہو۔ ہاں، پیڑوں کے جھرمٹ میں ایک پیڑ ایسا بھی ہے۔ جس میں برگ و بار نہیں آتے۔۔۔ پھر بھی اس کی شاخوں اور تنوں سے ان گنت سیاہ وسفید دھاریوں والی گلہریاں نیچے اتر کر میرے باغوں میں گھس آتی ہیں۔۔۔ ذراسی دیر میں دیکھتی ہوں کہ ڈالیوں سے تمام پھول مع گلہریوں کے مخفی ہو گئے ہیں اور وہی سگ چار دیواری پھلانگ کر میری طرف چلا آرہا ہے، اپنے تیز اور نوکیلے دانت نکالے اور بھونکتا ہوا۔۔۔ میں لان میں کرسی پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی ہوتی ہوں۔ مارے فیر اور خوف کے اپنا چہرہ اخبار میں چھپا لیتی ہوں۔ جب ایک سیہ مار پھن کاڑھے ہوئے اس کے مقابل آ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کی جگہ کا تعین اب تک نہیں کر پائی ہوں کہ وہ کہاں سے اور کس بانبی سے نکل کر آتا ہے۔ مگر وہ اسے جل دے کر دوسری طرف نکل جانا چاہتا ہے۔۔۔ لیکن اسی آن اسے ڈس کر بڑی تیزی سے رینگتا ہوا میری طرف بڑھا چلا آتا ہے تو کرسی پر سے میں اٹھ کھڑی ہوتی ہوں۔ بھے اور ڈر کے کارن اپنے دربان کو میں اس بار بھی آواز دیتی ہوں۔ وہ بے طرح میری طرف دوڑا چلا آتا ہے اور بغیر ایک پل برباد کئے اسے دُم کی طرف سے اپنی مٹھی کی دو بالائی انگلیوں میں دبوچ کر دور ہوا میں اچھال دیتا ہے۔ خوشی سے میری باچھیں کھل جاتی ہیں تو دیکھتی ہوں کہ باغ کی خالی ڈالیوں میں نت نئے خوشنما پھول پھر آگئے ہیں اور وہ گلہریاں اپنے پیڑوں میں پھر جا چڑھی ہیں مزے سے بس!"

فوق البیان رؤیا کے بعد سلوچنا کور نے اپنے بڑے اور نیلے دیدے دوسری طرف پھیر لیے تھے۔

"آپ کے سپنے میں ایسی کوئی خاص بات نہیں جو آپ کے لیے پریشانی کا سبب بن سکے۔ کوئی سایہ وایہ والی بات بھی نہیں۔ ایسی بھی کوئی بات نہیں جس سے کسی ناگہانی بات کا اندیشہ ہو۔ دراصل آپ بے آرامی کی شکار ہیں۔ اس کے دفع کے لئے پانی دم کر کے میں آپ کو دے دیتا ہوں۔۔۔ رات سونے سے پہلے روزانہ دو بوندے لیا کریں گی تو آپ کی تکلیف جاتی رہے گی۔ سرت چند سنگھ صاحب سے عرض کروں گا، تھوڑی سی توجہ گھر پر بھی دیں تو خوب ہوگا۔"

مگر مولانا شافی کے نزدیک سلوچنا کور کا گزیدہ خواب بلی کے سپنے میں چھیچھڑے جیسا تھا۔ بہر حال، انھوں نے پشت کی طرف رکھی ہوئی الماری کھولی۔ اس میں سے ایک چھوٹی سی بوتل نکال کر کار بند سے پانی بھروایا، پھر دم کر کے سرت چند کی طرف بڑھا دیا۔

"بہت بہت شکریہ جی!" پھر وہ دونوں کرسی پر سے اٹھ گئے۔ سنگھ جی نے پرس سے ہزار ہزار کے دو نوٹ نکالے اور مولانا کی طرف بڑھا دیے۔ احتراماً ہاتھ جوڑ نمسکار کر دفتر سے باہر نکل گئے۔

اپنی کار میں بیٹھنے سے پہلے سلوچنا کور نے بوتل مدرسہ کی باہری دیوار کی اس طرف ڈال دی جدھر خود رو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں، جسے سرت چند نہیں دیکھ سکے تھے۔

مولانا کی طبیعت مکدر ہو چکی تھی۔ یہ تو یاوہ گوئی کے وہ جرثومے ہیں جو نخل حیات کی جڑوں کو کتر کتر کر بالآخر

کاٹ ڈالتے ہیں۔ اف رے! برزبان تسبیح و دردل گاؤ خر!!'' اوران کے چہرے پر صحراؤں جیسی ویرانی چھا گئی تھی۔ اس طرح کے مافوق البیان خواب نوراں کو بھی آتے ہیں۔ تین چھوٹے بڑے بچوں کی ماں ہو کر بھی۔ نہیں، وہ ایسی بوالہوس نہیں، سلوچنا کور کے بالکل گزیدہ خواب ہیں۔ اب سے بارہ برس میں اس نے تین بیٹوں کو جنم دیا۔ شاید وابد کی بھی کوئی گنجائش نہیں۔ وہ کبھی مجھ سے بامراد نہ ہوئی ہو۔ پھر؟ بچوں کے اسکول اور ان کے مدرسہ چلے جانے کے بعد ان کا اپنا گھر کہیں شیطان کا مسکن تو نہیں بن جاتا۔ کہیں جلوت، خلوت سے استفادہ تو نہیں کرتی۔ ہو سکتا ہے۔۔۔۔ ہو سکتا۔۔۔۔ دل کے ویران صحرائی سناٹے سے آواز آئی۔ ماں باپ ہیں تو بس گاؤں ہی دیکھتے ہیں۔ ہزار بار کہا ہے کہ دونوں میں سے کوئی ایک یہاں آرہے، مگر گاؤں کی مٹی پاؤں سے نہیں چھٹتی نہیں۔۔۔۔ نوراں قطعی ایسی نہیں رب الارباب جانتا ہے کہ بدگمانی بری چیز ہے اور وہ اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہے تو پھر میں۔۔۔۔! ان کی نگاہوں کے آگے اس کا گیہواں چہرہ گھوم گیا۔ بچے یاد آئے جو اسکول گئے ہوئے تھے۔ پھر وہ خلوت بھی یاد آئی جہاں سے ابھی ابھی شیطان کو بو پھوٹی تھی۔

ابھی وقفہ استراحت میں کافی دیر تھی، طلبہ اپنے اپنے اسباق سے فارغ ہو چکے تھے۔ مدرسہ کے احاطے میں ادھر ادھر منڈلا رہے تھے۔ ادھر صحن کی دائیں جانب چھوٹی سی کھلی جگہ میں اینٹوں پر چڑھی دیگ پک رہی تھی، جس کے اندر سے بھاپ ہوا میں آتی اور پانی کی بوند بن کر نیچے بیٹھ جاتی تھی۔ ایسے میں مطبخ سے ایک طالب علم چائے کی پیالی ان کی میز پر رکھ گیا۔ انھوں نے دو چار گھونٹ بہ مشکل اپنے حلق سے اتارے، انھیں یاد آیا، ایک صبح نوراں نے ان سے بالکل عجیب وغریب خواب بیان کیا تھا کہ وہ ایک روز شفق سرمئی شام میں ناریل اور پھلدار کیلوں سے گھرے ہوئے اپنے پوکھر میں نہانے پہنچی تو دیکھا، ماں کے نہائے کپڑے سیڑھیوں پر ادھر ادھر پڑے ہیں، اسے یہ سوچ کر حیرت ہوئی کہ ماں کے کپڑے کیوں پڑے ہیں جب کہ وہ خود ہی اپنے کپڑے دھولیا کرتی ہے۔ آج شاید ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ وہ اپنے کپڑے اٹھانا یادھونا بھول گئی ہے۔ بہر حال وہ اپنے سینے تک لہنگا سمیٹ کر پوکھر کے پانیوں میں اتر گئی۔ گرمی کی شام کی تیز ہوا کے تھپیڑوں کی آواز جب پانیوں میں آنے لگی تو اس نے گھبرا کر اپنا سر پانی سے باہر نکالا تو ہمارے پڑوس کا لڑکا شکلو پوکھر کے چبوترے پر کھڑا ٹکٹکی باندھے آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اسی وقت پانی سے نکل کر سیڑھیوں تک آگئی مگر وہاں ماں کے اتارے ہوئے اور نہ خود اس کے کپڑے موجود تھے اور نہ وہاں شکلو کھڑا تھا۔ وہ اس وقت پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ جب آنکھ کھلی تو جانا کہ نگوڑی نیند اسے پانیوں میں لے گئی تھی۔

شکلو محلے کا ایک سیدھا سادا لڑکا تھا جو وقتاً فوقتاً دوسروں کے کام کر دیا کرتا تھا مگر خواب وگمان میں اس کا آنا چہ معنی دارد؟ تو کیا وہ اس کے ذہن میں گھر کر گیا ہے؟ اونہہ۔۔۔۔ محلے کے لڑکے بالوں سے نوراں کے تلوے بھی بات نہیں کرتے۔ شاید انھوں نے نوراں سے کہا تھا ''فضول وہم وخیال کو اپنے دل ودماغ میں جگہ نہ دیا کرو۔ اس طرح اپنی صحت کا تم بہتر خیال رکھ سکوگی۔'' پھر وہ ناشتہ سے فارغ ہو کر مدرسہ کے لئے گھر سے چل پڑے تھے۔ لیکن خود ان کے ذہن میں شکلو مسلط ہو چکا تھا۔ ان کو وہ رویا بھی یاد آیا جسے اپنی شادی سے پہلے نوراں نے دیکھا تھا۔ وہ گھر سے کپڑوں کی گٹھری لے کر تالاب گئی ہوئی تھی۔ بغل کے نل پر کوئی کامنی نامی سہیلی

بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی کہ جب اس کے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھا تو کہا۔" اے نوراں! تو تو بڑی بھاگیہ وان ہے ری، تیرا وِواہ ایک اچھے بَر سے ہوگا۔ تیرے بچّے بھی ہوں گے۔۔۔۔تو اپنے پتی سے بہت پریَن رہے گی، پرنتو۔۔۔!"

"پرنتو کیا بہن؟" نوراں نے غالباً اس سے استفسار کیا تھا۔

"ہاں ری، عورت تو یُگ یُگ کی ماری، کچھ سمے بعد اس پتی سے تمہارا سمبندھ وچھید ہو جائے گا۔۔۔ گھر والے سب کچھ بھول بھلا کر تمہارا دوسرا وِواہ کر دیں گے۔ وہاں تم اور بھی ادھک پرسن رہوگی۔"

مولانا شامی کو یاد آیا۔ یہ سن کر اس وقت انھوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا۔ اور نوراں اس وقت بالکل سمٹ کر سہم سی گئی تھی۔ تب اس نے بڑے معصومانہ انداز میں کہا تھا" جانِ من، سپنے میں آنے والی کوئی ناری کبھی کسی کا وِواہ وچھید نہیں کرا سکتی۔ کیوں کیا خیال ہے آپ کا؟ ویسے میں خوش، آپ سے بہت خوش ہوں۔"

استراحت کے درمیان وہ مدرسہ سے گھر آئے تھے۔ حسب معمول بچے اسکول گئے ہوئے تھے۔ نوراں نے اپنی نازک باہوں کو ان کی گردن میں حمائل کرتے ہوئے کہا۔" آج تو حد ہو گئی آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ کیسی لڑکی سے شادی ہو گئی کہ جب دیکھو یہ دیکھتی ہے جب دیکھو وہ دیکھتی ہے۔"

"تو کیا آج بھی شکلو تمہارے خواب میں آیا تھا؟"

"نہیں جی، وہ بھلا کیوں آنے لگا۔ توبہ کیجئے!"

"اچھا تو بتاؤ کہ پھر کیا دیکھا؟"

"سمندر کنارے ریت کے ایک اونچے ٹیلے پر میں تنہا بیٹھی ہوں، نیچے ساحل پر چند بچے گھروندے بنا رہے ہیں اور کچھ بچے غبارے خرید کر ہواؤں میں اڑاتے جاتے ہیں۔ سمندر کی بلند فضاؤں میں رنگ برنگے غباروں کا اڑنا خوب بھلا لگتا ہے۔ جانے تو بس خدا جانے کہ جانے کہاں سے ایک دھاردار خنجر میرے ہاتھ آجاتا ہے۔ میں ہوا میں اڑتے ہوئے غباروں کے لئے نشانہ باندھنا چاہتی ہوں مگر فوراً یہ احساس دامن گیر ہوتا ہے کہ یہ نوکیلا خنجر ان غباروں میں سے کسی ایک کو بھی نہ چھو سکے گا بلکہ ہوا میں کچھ دور جا کر نیچے ریت پر آرہے گا۔ تبھی میرے بدن کے گوشت کے پارچے کٹے ہوئے نظر آتے ہیں اور خونابہ کی دھار نیچے کی طرف بہتی ہوئی اور میرے دانتوں تلے خون آلودہ میرے پستان کا ایک پارچہ ہے جسے میں خوشی خوشی چبا کر کھانے لگی ہوں۔ عین اسی لمحہ کوئی چیل گرما کر میرے سر پر آ بیٹھتی ہے اور میری آنکھ۔۔۔۔۔"

اتنا سن کر مولانا کے منھ سے برجستہ نکلا" رویش ہبیں حالش مپرس!۔۔۔ بیگم تف ہیں ایسے گزیدہ خواب پر، اللہ اپنے غضب سے محفوظ رکھے۔"

خواب اور در آنے والے نفسی عذاب کی کھلی تعبیر ان کی آنکھوں کے سامنے موجود تھی۔ وہ چاہتے تو اپنی بیگم سے الجھ بھی سکتے تھے۔ مگر خاموشی کو بہتر ہتھیار سمجھا کیوں کہ شیطان کے اس کھیل میں کہیں ٹھہرا ہوا حمل گر نہ جائے۔

عصر کی نماز کے بعد مولانا کے چہرے پر غضب کی بشاشت تھی۔ بچے اسکول سے آکر باہر کھیل رہے

تھے۔نوراں نے ان کے پُرنور چہرے کو جو دیکھا تو آپ کھل اٹھی۔''حضورِ والا، مجھ سے کچھ خفا اور ناراض معلوم ہوتے ہیں۔''

''تم سے خفا تمہارے دشمن ہوں۔میں بھلا کیوں ہونے لگا۔''

''میں جانتی تھی کہ آپ مجھ سے کبھی خفا نہیں ہو سکتے۔''یہ کہہ کر وہ ان کے سینے سے لگ گئی۔اسے خود سے الگ کرتے ہوئے انہوں نے بڑے پیار سے کہا۔''اچھی بیگم، چٹ پٹ چائے پلاؤ تو تمہیں خواب حقیقت سے آشنا کراؤں۔''

''خواب حقیقت؟''نوراں نے اسے اپنی زبان پر دہرایا۔

''ہاں بیگم، خواب حقیقت۔''

تھوڑی دیر میں چائے آگئی۔انہوں نے پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی کہنا شروع کیا۔''جانِ من، مسلسل کئی ایک راتوں سے میں ایک ہی خواب دیکھتا آرہا ہوں۔''

''لیکن بھولے سے بھی آپ نے اس کا ذکر نہیں کیا۔''

''بھئی تمہارے مافوق البیان خیالوں نے کبھی اس کی فرصت ہی نہیں دی کہ میں بیان کرتا۔''

''مگر آپ اور خواب؟''

''تو کیا میں انسان نہیں ہوں؟''

''ہاں ہاں، تو پھر سنائیے نا!''

''ہاں سنو! ایک غبار آلود راستہ ہے۔اس کی ایک طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے سلسلے ہیں جو دور تک چلے گئے ہیں۔راستے کی دوسری جانب پستی میں ایک چوڑی چکلی ندی بہتی ہے۔اسی کچے اور غبار آلود راستے میں ایک ہتھنی جو اپنے پورے دن سے ہے، اب ندی کی طرف اترنے لگی ہے۔میں اس کے پیچھے پیچھے تقریباً دوڑتا ہوا اسے سنبھل کر چلنے کی روش بتانے لگا ہوں۔مگر وہ ہتھنی۔۔۔۔۔''

''آپ اور ہتھنی کے پیچھے؟''

''ہاں، خواب نے مجھے مولوی سے ہتھنی کا فیل بان بنا دیا ہے۔ہتھنی کا واحد فیل بان میں مگر مجھے وہ کینہ توز نظروں سے دیکھتی ہے اور تیز تیز جھومتی ہوئی ندی کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔اس کے سر کے اوپر میری جگہ کوئی دوسرا فیل بان بیٹھا ہے جو اسے آنکس سے مارے جاتا ہے جیسے وہ اس کا اختیار والا ہے۔میں اپنی ہتھنی کو اس کے نام سے پکارتا ہوں۔وہ گہرے سناٹے میں اپنی مہیب آواز نکال کر پھر اسی کینہ توز دیدوں سے مجھے دیکھتے ہوئے ندی میں اتر گئی ہے۔اس کا نام نہاد مہاوت یک لخت اس کے اوپر سے نیچے پانی میں چھلانگ لگا کر کنارے ریت پر آگیا ہے اور آنکس گاڑ کر بیٹھ گیا ہے۔ہتھنی کی دردناک چنگھاڑ کی آواز سن کر کئی مقامی لوگ ہمارے اردگرد آجمع ہوئے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ بھئی کیا ماجرا ہے؟۔۔۔۔ان سے میں بتانے لگا ہوں کہ وہ ہتھنی جو پانیوں میں جا کھڑی ہوئی ہے، اس کا مہاوت میں ہوں نہ کہ یہ شخص جس کے ہاتھ میں آنکس ہے۔''

''اُفوہ! اتنی چھوٹی سی بات پر اتنا تماشہ!''بھیڑ میں سے کسی آدمی نے کہا۔''کیا آدم علیہ السلام اب تک دنیا

میں تشریف نہیں لائے یا پھر تم واحد ایسے بھلے مانس ہو کہ جس کے بعد قضا، حیات کے سارے دروازے بند کردے گی، بابا میرے! اپنے آدم کے یگ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور ایسا۔۔۔۔اس آدمی کی بات سن کر مجمع زبردست قہقہے لگاتا ہے۔اس سے پہلے کہ میرا لہو جوش کھاتا ہوا میری شریانوں سے باہر پھوٹ پڑتا، میں اس تک پہنچ کر اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہوں۔اسے ہر چند پٹخنی پر پٹخنی دیتا چلا گیا ہوں لیکن ہر بار ایسا لگا اس کی جگہ میں ہی پٹخنی کھائے نیچے چت پڑا ہوں۔۔۔۔آخری بار، ہاں! مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔بالکل سرگوشی کے سے انداز میں اس سے کہا، اے بھائی! میں تمھیں چاہ کر بھی شکست نہیں دے سکتا۔اتنا کہہ کر میں نے اسے اپنے رخ سے جدا کیا پھر بڑی سرعت کے ساتھ اپنے کپڑے جھاڑے اور وہاں سے اوپر غبار آلود راستے کی طرف ہو لیا مگر پامردی سے۔" ■■

شیری زئی

جنت کا سفر

شاہ پور پنجاب کا ایک چھوٹا سا گانو تھا۔ آبادی بھی تقریباً چالیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ یہاں کی زمین اس قدر زرخیز تھی کہ زیادہ تر لوگوں کی زندگی کا انحصار کھیتی باڑی پر تھا۔ گانو والوں کو اکثر یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ ہمارے گانو پر اللہ کی رحمت کا خاص سایہ ہے۔ ان کا یقین تھا کہ یہی وجہ ہے جو یہاں کی زمین زراعت کے لیے اس قدر زرخیز ہے۔

چودھری شجاعت یہاں کے ایک بڑے زمین دار تھے جو غریب کاشت کاروں کا بے حد خیال رکھتے تھے یہ انھیں کے اثر ورسوخ اور پرُخلوص کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ گانو میں سرکاری امداد کے ذریعے کئی فلاحی کام عمل میں آئے۔ بچوں کے لیے ایک جدید طرز پر اسکول قائم کیا اور چھوٹے سرکاری ہسپتال کی عمارت تعمیر کروائی، جہاں ضروری بنیادی طبی سہولیات فراہم کی گئیں۔ اس کے علاوہ کئی جگہ پکی سڑکیں بنوائی گئیں اور مسجد، امام بارگاہ اور اقلیتوں کی عبادت گاہ کی تعمیری دیکھ ریکھ کا باقاعدہ انتظام بھی کیا گیا۔ گانو کی فضا اتنی سازگار اور پرُامن تھی کہ یہاں کے سارے رہنے والے سماجی بھید بھاؤ اور مذہبی تعصبات سے بے نیاز تھے۔ اگر کبھی گانو والوں کے درمیان کس بات پر تنازعہ کھڑا ہو جاتا تو چودھری شجاعت پنچایت بلا کر اپنی حکمت عملی سے باہمی تصفیہ کرانے میں

مدد کرتے۔ پھر کسی کی کیا مجال کہ اس فیصلے کی کوئی حکم عدولی کر سکے، کیوں کہ سب ہی جانتے تھے کہ چودھری صاحب ہر ایک کے ساتھ ہمدردی اور انصاف سے پیش آتے ہیں۔ پچھلے ہی سال کی بات ہے کہ مسجد کے مدرس مولوی کرم دین نے سبق نہ یاد کرنے پر ایک بچے کی اتنے زور سے پٹائی کی کہ اس بے چارے کے ہاتھ کی ہڈی پر کافی چوٹ آئی اور خون بہنے لگا۔ بچے کے ماں باپ فوراً چودھری صاحب کے پاس شکایت لے کر پہونچ گئے۔ چودھری صاحب نے پہلے تو اسی وقت بچے کا ہسپتال میں علاج وغیرہ کرایا پھر اس کے بعد مولوی کرم دین کو اپنے گھر طلب کیا اور اس کو بڑے طریقے سے تنبیہ کرتے ہوئے سمجھایا "اس طرح اگر بچوں کی پٹائی کروگے تو بچے تم سے کیا خاک پڑھیں گے؟" گانو میں اس طرح اگر کوئی بھی تنازعاتی معاملہ رونما ہوتا تو چودھری صاحب اس کو حسن وخوبی سے نمٹادیا کرتے۔

مولوی کرم دین اس گانو میں نیا نیا آیا تھا۔ وہ چوبیس پچیس برس کا نوجوان تھا۔ اس کی گھنی سی داڑھی تھی اور سر کے بال کافی بڑھے ہوئے تھے اسلامیات میں بی اے کی ڈگری حاصل کی تھی، لیکن ابھی تک اسے کوئی معقول نوکری نہیں مل پائی تھی۔ ایک دن کسی اخبار میں ایک اشتہار اس کی نظر سے گزرا جس میں لکھا تھا 'شاہ پور میں مسجد میں بچوں کو پڑھانے کے لیے ایک ٹیچر کی ضرورت ہے۔' کرم دین نے فوراً ٹیچر کے لیے درخواست دی اور قسمت سے اسے ملازمت بھی فوراً ہی مل گئی۔ کرم دین کی ساری زندگی شروع سے لے کر اب تک ایک بڑے شہر میں گزری تھی چنانچہ اس کے لیے کسی گانو میں رہنا شہر کے طرزِ زندگی سے بالکل انوکھا تھا۔ منتظمین مسجد کی جانب سے مسجد کے ہی ایک کشادہ احاطے کے اندر کسی حجرے نما کمرے میں اس کی رہایش کا انتظام کردیا گیا۔ اس سے متصل ایک اور کمرہ تھا جس میں حسن نامی ایک ۲۶ سالہ نوجوان رہتا تھا وہ بھی وہاں برسرِ ملازمت تھا۔ اس کے ذمے مسجد کے تمام انتظامی امور کی دیکھ بھال تھی۔ کچھ ہی دن گزرے ہوں گے کہ مولوی کرم دین اور حسن کے درمیان ابتدائی علیک سلیک کے بعد رفتہ رفتہ اچھے خاصے مراسم قائم ہوگئے۔ اب وہ دونوں کام سے فارغ ہونے کے بعد آپس میں بیٹھ کر دنیا بھر کی باتیں کرتے اور اکثر کھانا وغیرہ بھی ساتھ ہی کھایا کرتے۔ حسن فرصت کے اوقات میں کرم دین کو اپنے ساتھ باہر لے جاتا اور گانو کے ماحول سے روشناس کراتا۔ مولوی کرم دین کو یہاں کے گانو والوں کی طرزِ معاشرت شہر کی بہ نسبت بڑی عجیب سی محسوس ہوتی تھی۔ گانو میں سب ہی لوگ خوش حال تھے جو بلا کسی تفریق کے ایک دوسرے کے دکھ درد میں شامل ہوجاتے۔ گانو والے کہا کرتے تھے کہ یہاں اللہ کی عجیب شان ہے کہ کوئی شخص بھوکا نہیں رہتا۔ کرم دین کو معاً اپنے شہر کے وہ پرانے دن یاد آنے لگتے جب کہ اس نے اکثر تنگ دستی کے عالم میں صرف چنے کھا کر اور پانی پی کر گذارہ کیا تھا۔ اس وقت وہ تلاشِ معاش میں سرگرداں رہا کرتا تھا۔ کبھی کبھار تو یوں بھی ہوتا کہ وہ اپنے کمرے میں بند بیمار پڑا رہتا اور پاس پڑوس سے کوئی اس کے پاس پرسانِ حال تک نہیں آتا۔ اس کے نزدیک اس گانو کا دوستانہ ماحول شہر کے کمرشل طور طریقوں سے بالکل مختلف تھا۔ اس نے گانو میں ایک عجیب طرح کی فرحت محسوس کی۔ صاف ستھری فضا، پکی سڑکیں جن کے دونوں کنارے گھروں کی قطاریں اور دور تک پھیلے ہوئے بڑے بڑے کھیت، جن کے اطراف پانی کی نہروں کا جال، گانو کے یہ تمام مناظر کرم دین کو بے حد متاثر

کرتے۔گانو میں پانی بجلی کی کوئی خاص کمی نہیں تھی۔نہروں کی وجہ سے کھیتوں میں نکاسی آب کا خاصا اچھا انتظام تھا۔اناج کی فصل بھی خوب اچھی ہوتی۔فصل کا زاید اناج شہر کی منڈیوں میں فروخت کر دیا جاتا،گانو میں اس طرح ہر شخص کی شرح آمدنی میں بھی آہستہ آہستہ اضافہ ہونا شروع ہو گیا تھا۔تقریباً اب گانو کے اکثر گھروں میں ٹیلی وژن بھی آ گیا تھا۔گھر والے اکثر شام کو ٹیلیوژن کے پاس جمع ہو جاتے اور پروگرام سے لطف اندوز ہوتے۔عورتیں اپنے گھریلو کام کاج سے فارغ ہو کر زیادہ تر ڈرامے اور دیگر تفریحی پروگرام دیکھنے میں لگ جاتیں اور مرد عام طور سے خبریں وغیرہ دیکھنے میں اپنے فرصت کے اوقات گذارتے۔اس طرح گانو کے لوگوں میں سیاسی سوجھ بوجھ بھی غیر شعوری طور پر فروغ پانے لگی۔

کرم دین اور حسن فرصت کے دوران آپس میں مل کر خوب سیاسی اور غیر سیاسی گپیں مارتے۔ایک دن دونوں نے پروگرام بنایا کہ آیندہ اتوار کے روز کیوں نہ گانو کے میلے میں جا کر تفریح کی جائے۔یہ میلہ ہر سال شاہ پور میں گرمیوں کے دنوں میں لگتا۔پاس کے قصبے دیہات سے بھی لوگ میلہ دیکھنے آتے جہاں بچوں اور بڑوں کے لیے ہر طرح کے دلچسپ تفریح کے کھیل تماشے ہوتے۔کہیں ایک بڑا سا جائنٹ وھیل ہوتا اور کہیں طرح طرح کے کھانوں کے اسٹال لگائے جاتے جن پر اکثر عورتیں نظر آتیں۔میلے سے جو بھی زائد منافع حاصل ہوتا اس کو گانو کے امدادی کاموں پر صرف کر دیا جاتا۔

اتوار کا دن تھا۔اپنے پلان کے مطابق کرم دین اور حسن دونوں صبح ہی صبح اٹھے اور نہا دھو کر،اچھے کپڑوں میں ملبوس ہو کر میلے کی جانب چل پڑے۔راستے میں انھوں نے دیکھا بہت سے مرد،عورتیں،بچے سب بنے سنورے رنگ برنگے کپڑے پہنے،میلے کے راستے پر اپنا اپنا ٹولا بنائے چلے جا رہے ہیں۔کرم دین کے لیے یہ سب کچھ نیا نیا سا تھا۔اسے معلوم تھا کہ شہر میں بھی کچھ میلے ٹھیلوں کا انتظام کیا جاتا ہے،مگر اس کو وہاں جانے کا کبھی کوئی موقع نہیں مل سکا۔کرم دین نے دراصل ایک انتہائی غریب گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا لڑکا تھا جب اس کی عمر ابھی سولہ سال کی بھی نہیں ہوئی تھی تو بدقسمتی سے اس کے والدین کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا۔حالاں کہ اس کے کچھ دُور کے عزیز واقارب بھی وہیں رہتے تھے لیکن رفتہ رفتہ کچھ عرصے بعد انھوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔اب وہ اس دنیا میں بل کل اکیلا تھا اس نے جیسے تیسے کر کے ایک شریف پہلوان نامی لوہار کی دکان میں ایک معمولی مزدور کی حیثیت سے عارضی نوکری حاصل کر لی۔کرم دین کو جنون کی حد تک آگے پڑھنے کا شوق تھا چنانچہ اس نے اپنی چھوٹی موٹی عارضی نوکریوں کے درمیان بھی جس طرح بن پڑا اپنی پڑھائی کو جاری رکھا اور بمشکل تمام کالج میں داخلہ لے لیا۔وہ حساب کے مضمون میں بہت تیز تھا۔اسکول پاس کرنے کے بعد اسے اپنی ان تھک کوشش سے بہت جلد دو تین گھروں میں بچوں کو Maths اور قران شریف پڑھانے کا ٹیوشن مل گیا۔اب وہ دن میں کالج جاتا اور شام کو ٹیوشن میں مصروف رہتا۔فائنل امتحان میں اس نے اسلامیات میں امتیازی نمبر حاصل کیے۔اس بے چارے کو قوی امید تھی کہ پڑھائی سے فارغ ہونے کے بعد اسے ایک اچھی خاصی نوکری ضرور مل جائے گی لیکن افسوس اس کا یہ خواب بہت جلد ٹوٹ گیا۔اس نے نہ جانے کتنی جگہ نوکری کی درخواستیں بھیجیں لیکن کہیں کامیابی نہیں نصیب ہوئی۔فی زمانہ بغیر کسی

بغیر کسی سفارش کے نوکری حاصل کرنا کرم دین جیسے بے وسیلہ شخص کے لیے ناممکن تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک ذہنی خلفشار میں مبتلا رہنے لگا۔ جب وہ یہ دیکھتا کہ اسی کی عمر کے اور لڑکے اس قدر شاندار ملازمتوں پر فائز ہیں تو وہ رشک و رقابت کی آگ میں جلنے لگتا اور اس کے وجود پر کم تری کا احساس شدت سے غالب آجاتا۔ ہر روز صبح اٹھنے کے بعد اس کا یہی وتیرہ ہوتا کہ وہ قریب کی لائبریری جائے اور اخباروں میں اشتہارات دیکھ کر نوکری کے لیے درخواستیں دے۔ رات ہوتی تو اس کی آنکھیں ایک عالی شان جاب کے ملنے اور خوب مال و دولت کمانے کے سنہرے خواب بننے لگتیں۔ وہ تو اس کی قسمت نے ساتھ دیا کہ شاہ پور میں مسجد کے بچوں کو پڑھانے کی ملازمت اسے مل گئی نہیں تو وہ بری طرح قنوطیت میں ڈوب کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا۔ حالاں کہ اب شاہ پور کے پُرسکون ماحول میں رہ کر اس کے خیالات بڑی حد تک بدل گئے تھے، تاہم اس کے دل میں دنیاوی دولت سے مالا مال ہونے کا جنون ہنوز باقی تھا۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے اتفاقاً ایک مقامی سیاسی پارٹی کے کسی لیڈر سے اس کا رابطہ ہوا جس نے اسے آئندہ ہونے والے لوکل بوڈیز الیکشن میں حصہ لینے کا مشورہ دیا، میلے میں جاتے جاتے کرم دین اس لیڈر کے مشورے پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنے میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک حسن کی آواز نے اسے چونکا دیا۔'ارے کہاں کھو گیا مولوی؟ میری تو آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں، چل کسی اسٹال پر جا کر عمدہ سا کھانا کھاتے ہیں۔'

'یار تم جہاں لے جاؤ گے وہیں بیٹھ کر کھالیں گے۔ تم خود ہی کسی مزے دار کھانے کے اسٹال کا انتخاب کرلو۔' کرم دین نے میلے کے اسٹالوں کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔

میلے کی جگہ پر بھانت بھانت کے لوگوں کا ازدہام تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے اپنے بڑوں کے کاندھوں پر سوار مزے سے میلے کی ہوا کھا رہے تھے۔ کہیں ڈھول تاشے بج رہے تھے اور کہیں کوئی مداری ڈگڈگی بجا کر تماشائیوں کو جمع کر رہا تھا۔ باجوں گانوں کا اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز تک نہیں سنائی دے رہی تھی۔ لیکن حسن اور کرم دین اسٹالوں کا جائزہ لینے میں مصروف تھے کہ کہیں سے اچھے چٹ پٹے کھانوں کی خوشبو انھیں محسوس ہو اور وہ اس پر ہلّہ بول دیں۔ اچانک انھیں ایک صاف ستھرا کھانے کا اسٹال نظر آیا، جہاں ایک خوب صورت معصوم سی لڑکی جس کا سن مشکل سے سولہ سترہ برس کا ہوگا، تیل بھری دہکتی کڑھائی میں ایک عجب شان بے نیازی سے پوریاں تل رہی تھی کرم دین کی آنکھیں اس پر گویا جم کر رہ گئیں۔ کڑھائی سے قدرے دور دوسری ایک اور لڑکی کھڑی تھی جو پوریاں بیلتی جاتی اور بیل کر کڑھائی کے پاس والی لڑکی کو دیتی رہتی۔ کرم دین کو اس سے پہلے اس طرح نزدیک سے کسی پیکرِ حسن و ادا کو دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ پوریاں تلتے وقت اس کے دوپٹے کا پلو گھڑی گھڑی سر سے ڈھلک کر سینے پر اتر آتا، اور ریشم سے ملائم بالوں کی لٹیں اس کے چہرے پر بکھر جاتیں۔ گرم تیل اور چولھے کی گرمی سے اس کے چہرے پر پسینے کی ہلکی ہلکی بوندیں چمک اٹھی تھیں اور آگ کی تپش سے اس کے رخسار ایک دم سرخ ہو گئے تھے۔ اس نے جلدی سے پوریاں کڑھائی سے نکالیں اور اپنے ڈھلکے ہوئے آنچل کو اٹھا کر بے نیازی سے سر پہ ڈال لیا۔ اسی دوران دوسری لڑکی کی طرف دیکھ کر شوخی سے کہنے لگی' زرینہ! ذرا ہاتھ ہولا رکھ۔ اتنی تیزی سے پوریاں بیلے گی تو میں کس طرح تل

پاؤں گی۔ تلنے میں تھوڑا ٹائم تو لگتا ہے نا؟'

'اچھا تو کہتی ہے تو ٹھیک ہے۔ لے! اب میں پوریاں تلنے میں بریک لگا کر وقفہ کر دیتی ہوں،' زرینہ ابھی اپنا جملہ پورا کرنے ہی نہ پائی تھی کہ وہ ہنسنے لگی اور پھر چھیڑتے ہوئے بولی۔ 'پر ریشم! تو ہے بڑی سست۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں تجھے۔ تجھے تو کام کرنے میں مشکل ہی پڑتی ہے۔ مجھے تو یہی فکر ہے کہ کل کبھار تو کسی اچھے خاندان میں بیاہی گئی تو کیا کرے گی؟' ریشم نے تڑک کر جواب دیا 'ارے بدھو! میں جس سے بیاہ کروں گی ناوہ تھوڑا ہی مجھ سے گھر ور کے کام کروائے گا! رانی بنا کر رکھے گا رانی۔ اس پر دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑیں کرم دین جوان دونوں کو کنکھیوں سے مسلسل دیکھ رہا تھا ان کی باتیں سن کر اسے اس گھڑی یوں محسوس ہوا کہ فضا میں جیسے جل ترنگ بج اٹھے ہوں۔ کرم دین عین جب ان کی باتوں سے حظ اٹھا رہا تھا کہ حسن نے اپنی آواز سے اس کی محویت کو زائل کر دیا۔ 'ارے بھئی اب آگے بھی چلے گا یا یہیں کھڑا رہ کر یہاں کی ساری خوش بو اپنے وجود میں بھر لے گا۔ ابھی تو آگے بہت سارے اسٹال باقی ہیں۔' کرم دین نہایت ہی بے دلی سے حسن کے ساتھ چل پڑا۔ دونوں جب خراماں خراماں ہر اسٹال کا معائنہ کرتے ہوئے کھانے کے آخری اسٹال پر پہونچے تو حسن نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا 'بس یار واپس چلتے ہیں۔ میرا تو آج تکے کباب کھانے کا جی کر رہا ہے۔ جس کا اسٹال ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔' کرم دین جو کہیں اور کھویا ہوا تھا اس نے فوراً حسن کی بات سن کر ایک تجویز پیش کی 'ایسا کرتے ہیں یار کہ تکے کبابوں کو ایک پلاسٹک کاغذ میں بندھوا لیتے ہیں، پھر اس کے بعد حلوہ پوری اسٹال پر بیٹھ کر مزے لے لے کر کھائیں گے میرا دراصل آج حلوہ پوری پر جی للچا رہا ہے۔ کیا خیال ہے؟' حسن کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا اس نے واپس لوٹ کر تکے کباب خریدے اور پھر دونوں حلوہ پوری کے اسٹال پر جا کر سامنے پڑے ہوئے لکڑی کے بنچوں پر بیٹھ گئے جیسے ہی بیٹھے تو سامنے بڑی سی انگیٹھی کے پاس پنکھا جھلتے ہوئے لڑکے کو ریشم نے آواز دے کر سامنے بنچ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا 'اوئے پی جے، جا، جا کر کسٹمر سے آڈر لے لے۔ کرم دین نے بغور اس لڑکے کا جائزہ لیا۔ وہ پتلون قمیص پہنے ایک سانولے رنگ کا نوجوان اسمارٹ لڑکا تھا جو شکل سے پڑھا لکھا دکھتا تھا۔ پی جے نے ریشم کی آواز سن کر جب مڑ کر بنچ کی جانب دیکھا تو حسن سے بڑی گرم جوشی سے مخاطب ہوا 'ارے واہ مسٹر حسن آپ؟ بڑے دن بعد نظر آئے۔ بولیے کیا لاؤں آپ لوگوں کے لیے۔ یہاں چھولے حلوہ پوری کے علاوہ میٹھی لسی بھی ہے۔' حسن جو اس سے اچھی طرح واقف تھا ہنس کے کہنے لگا 'کیا کہوں؟ بس کام کاج سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ پھر کرم دین کا تعارف کراتے ہوئے بتایا 'ارے ہاں! یہ ہیں ہماری مسجد کے نئے ٹیچر مولوی کرم دین۔ ان کا آج حلوہ پوری کھانے کا بڑا دل کر رہا تھا۔ سو تم حلوہ پوری کا آڈر لو اور ساتھ میں دو گلاس لسی بھی لے آنا۔' پی جے نے بڑے تپاک سے خیر مقدم کرتے ہوئے کرم دین کو دیکھا اور کہا 'شاہ پور تو ایسا گانو ہے مولوی صاحب کہ یہاں جو بھی آتا ہے پھر واپس جانے کا نام ہی نہیں لیتا۔ آپ لوگ بیٹھیے میں ابھی آپ کا آڈر لے کر آیا' کرم دین کا ذہن پی جے کو دیکھ کر عجیب پراگندہ خیالات کی آماج گاہ بن گیا۔ اُسے ایسا لگا کہ پی جے نے گویا اس کی آنکھوں سے ساری حقیقت بھانپ لی ہے سچ تو یہ ہے کہ محض حلوہ پوری کے لیے یہاں آنا تو ایک بہانا تھا۔ لیکن اس نے فوراً ہی کچھ لمحوں بعد اس خیال کو اپنے

ذہن سے جھٹک دیا اور حسن کی جانب دیکھ کر اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا'یار یہ پی جے ہے کون؟ اور اس کا نام پی جے؟ یہ کیسے پڑا؟'حسن نے وضاحت کرتے ہوئے کرم دین کو بتایا'ارے یہ ایک پڑھا لکھا محنتی لڑکا ہے۔اصل میں یہ گاؤں کے اسکول میں انگریزی پڑھاتا ہے اور اپنی فرصت کے اوقات گاؤں والوں کی خدمت میں صرف کرتا ہے۔مسجد سے ذرا دُور تقریباً تین کلو کے فاصلے پر ایک عیسائی کالونی ہے۔یہ وہیں اپنے ماں باپ اور دو چھوٹی بہنوں کے ساتھ رہتا ہے۔اس کا نام ویسے تو پرویز جانسن ہے لیکن اس کے سب گھر والے اس کو پی جے کہ کر بلاتے ہیں اور اسی نام سے یہ گاؤں بھر میں مشہور ہے' کرم دین پی جے کے بارے میں یہ ساری معلومات ظاہراً بڑے انہماک سے سن رہا تھا مگر اس کی خاموشی کسی اور خیال کے تانے بانے بُننے میں لگی ہوئی تھی کہ اتنے میں پی جے ایک بڑی سی ٹرے میں گرما گرم حلوہ پوری لے کر آ گیا اس نے ٹرے میں سے پوری اور حلوے کی پلیٹوں کو میز پر رکھا۔حسن نے ہنستے ہوئے اُس کا شکریہ ادا کیا اور کرم دین کا دوبارہ تعارف بھی کرا دیا۔پی جے نے بڑے احترام سے ہاتھ ملایا اور کہا کہ آپ کو یہاں کسی قسم کا پرابلم ہو تو مجھے بتا دیجیے گا، میں آپ کی ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔اس اثنا اس نے ریشم کے بلانے کی آواز سنی،'اوئے پی جے وہ ٹیبل نمبر چار پر لوگ آئے بیٹھے ہیں۔اُن کا بھی ذرا جلدی سے آڈر لے لے۔'اور پی جے'اچھا بعد میں ملیں گے'یہ کہتا ہوا دوسرے ٹیبل کی جانب مڑ گیا۔مولوی کرم دین کے چہرے سے نہ جانے ایسا کیوں عیاں ہو رہا تھا کہ اسے ریشم کا اپنے منہ سے پی جے کا نام لے کر اس طرح بے تکلفی سے پکارنا سخت ناگوار گذر رہا ہو۔اس نے بڑی بے دلی سے حلوہ پوری کو زہر مار کیا اور حسن سے کہا'بہت ہو گیا اب یہاں، چلو گھر واپس چلتے ہیں۔'دونوں اٹھ کے وہاں سے سیدھے گھر کے راستے چل پڑے۔راستے بھر کرم دین خاموش رہا لیکن حسن کو کرم دین کی اس کی ذہنی کیفیت کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا۔کچھ دیر بعد کرم دین سے خاموش نہیں رہا گیا اس نے عمداً اِدھر اُدھر کی بات کرتے ہوئے کہا کہ'ہم کو ان کرستان کم بختوں سے ذرا دُور ہی رہنا چاہیے۔'حسن نے ہنستے ہوئے جواب دیا'نہیں یار! آپ جناب مولوی ٹھیرے نئے نئے یہاں وارد ہوئے ہیں اور رہا پی جے اور اس کی فیملی، سو وہ تو چالیس پچاس برسوں سے یہاں آباد ہے۔پی جے تو اس دن خود یہ بتا رہا تھا کہ اس کے سارے بزرگ شاہ پور ہی میں ہی دفن ہیں۔تم یہاں کے لوگوں کو نہیں جانتے کرم دین! یہاں چودھری شجاعت صاحب کی بدولت گاؤں میں تعلیم کا اتنا اچھا اثر ہوا ہے کہ سب چھوٹے اپنے بڑوں کا ادب کرتے ہیں اور ہر شخص ایک دوسرے کی مذہبی رسومات کا احترام کرتا ہے۔جہاں تک پی جے اور اس کے افرادِ کنبہ کا تعلق ہے تو پورا گاؤں ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے جانتے ہو پی جے کا باپ بھی اسی اسکول میں پڑھاتا تھا جہاں اب وہ ٹیچر ہے۔اس کی ماں یہیں ہسپتال میں مڈ وائف تھی۔اس گاؤں کے اکثر بچوں کی اسی کے ہاتھوں زچگی ہوئی ہے۔اب تو خیر دونوں رٹائرڈ ہو چکے ہیں۔لیکن اب بھی اگر آدھی رات کو کسی گھر سے امرجنسی میں بلاوا آ جائے تو اس کی ماں مدد کرنے سے کبھی انکار نہیں کرتی۔اور اس کا بیٹا پی جے بھی عجیب قماش کا بندہ ہے ابھی کچھ ہی روز پہلے کی بات ہے چودھری صاحب نے اس کو بلا کر خوشخبری سنائی کہ پی جے تم کو اسکول میں ہیڈ ٹیچر کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے۔مگر معلوم ہے اس کا کیا ردِ عمل تھا؟ اس نے یہ کہ کر بڑے ادب سے معذرت کر لی کہ نئی

الحال مجھے ان ذمے داریوں سے دور ہی رکھیں۔ میں اپنے موجودہ جاب سے بے حد مطمئن ہوں کیوں کہ مجھے اس میں باآسانی موقع مل جاتا ہے کہ میں گانو والوں کے کچھ حد تک خدمت کر سکوں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس کام میں جو روحانی خوشی ملتی ہے، وہ زیادہ تنخواہ کا بدل نہیں ہو سکتی۔ اب تم ہی کہو کرم دین یہ پی جے ہے نا، نرا پاگل؟ اگر مجھے کسی نے ایسی آفر دی ہوتی تو میں جھٹ سے قبول کر لیتا۔' کرم دین نے پی جے کے بارے میں یہ ساری باتیں بڑے تحمل مگر قدرے تکدر سے سنیں اور پوچھا 'یہ لوگوں کی خدمت کا کیا کام کرتا ہے؟' 'کوئی ایک کام ہو تو بتاؤں یار۔ کسی کا بچہ بیمار ہو تو یہ اسے ہسپتال وغیرہ لے جائے گا۔ کسی کا لڑکا پڑھائی میں کمزور ہے تو یہ اس کو فری ٹیوشن دے گا۔ کسی کو کوئی فارم وغیرہ کے کاغذات بھروانے ہوں تو یہ فوراً بھر دے گا، اس کے علاوہ گانو میں جتنے بھی معذور بچے ہیں یہ کب سے ان کی دل و جان سے خدمت کر رہا ہے۔ وہ ریشم ہے نا جو وہاں پوریاں تل رہی تھی اس کا ایک چھوٹا بھائی رشید ہے وہی جو اپنی مسجد میں قرآن شریف پڑھنے آتا ہے، بے چارہ چلنے پھرنے سے پیدائشی معذور ہے حال ہی میں ایک چیرٹی کے ذریعے کسی باہر ملک سے اس کی مصنوعی ٹانگیں لگوائی گئی ہیں سچ کہہ رہا ہوں پی جے یہ اُس کی اس قدر دیکھ بھال کرتا ہے کہ کوئی سگا بھی نہیں کرے گا۔' پی جے کے حق میں اتنی رطب اللسانی کرم دین کی برداشت سے اب باہر تھی۔ اس نے نہایت حقارت سے کہا 'کچھ بھی ہو۔ ہے تو کم بخت یہ عیسائی کی اولاد۔ اور پھر اس طرح کے کام تو کوئی بھی مسلمان ثواب کی خاطر کر سکتا ہے اس میں کونسی بڑی بات ہے؟' حسن نے کچھ سوچ کر کرم دین کی بات ہنس کر ٹال دی۔

دونوں اب گھر پہونچ چکے تھے۔ دونوں اللہ حافظ کہہ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ کرم دین کو آج خاصا دور تک پیدل چلنا پڑا، جس کا وہ بالکل عادی نہیں تھا چنانچہ وہ تھک کے چور ہو گیا تھا، کمرے میں گھستے ہی اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ جیسے ہی آنکھیں بند کر کے اس نے سونا چاہا تو ریشم کا خوب صورت چہرہ اس کے خیالوں میں چمک اٹھا۔ اس کا کھلکھلا کر ہنسنا، موتی جیسے دانت، گورے گورے رنگ پر پسینے کی ہلکی ہلکی بوندیں۔ مولوی کرم دین کو دفعتاً ایسا محسوس ہوا کہ ریشم کے چولھے کی ساری گرمی اس کے بدن میں سرایت کر گئی ہے۔ جیسے کسی دہکتی آگ کی تپش سے اس کا سارا جسم جلنے لگا ہو۔ وہ ہڑبڑا کر جلدی سے اٹھا اور باہر صحن میں دوڑ کر ٹھنڈے پانی کی ساری بالٹی اپنے اوپر انڈیل دی۔ پھر اس کی ہیجانی کیفیت میں ایک ٹھہراؤ سا نظر آنے لگا۔ اب وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے کمرے میں واپس آ کر فوراً اپنے کپڑے تبدیل کیے۔ ایک ٹھنڈا گلاس دودھ کا پیا اور چارپائی پر دراز ہو گیا۔ لیکن نیند اس کی آنکھوں سے آج کوسوں دور تھی، وہ سوچ میں گم ہو گیا۔ کاش اس کی ماں حیات ہوتی جو ہمیشہ کہا کرتی تھی 'ذرا پڑھائی میں دھیان لگا اور پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن جا تو میں تیرے لیے ایک اچھی سی پیاری لڑکی بیاہ کر لا دوں گی' ماں کو اگر چڑھ تھی تو بس صرف ایک ہی بات سے کہ اس کا لڑکا ہر بات پر جھوٹ بولا کرتا ہے اسی لیے وہ جھوٹ کی عادت پر کرم دین کی خوب پٹائی بھی کرتی۔ ماں کو جھوٹ سے سخت نفرت تھی مگر اس کا سپوت تو بچپن سے ہی جھوٹ کا ماہر ہو گیا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کرم دین دوستوں کے ساتھ دیر دیر تک گھر سے باہر رہتا اور جب گھر آتا تو ماں کے پوچھنے پر اسکول لائبریری میں پڑھنے کا بہانا بنا دیتا۔ ماں بے چاری کو کیا معلوم کہ لائبریری کیا بلا ہے جو اتنی دیر تک بچوں سے

چھٹی رہتی ہے۔ ایک دن کرم دین نے بڑی صفائی سے اسکول ٹیچر کے پرس سے دس روپے نکال لیے۔ جب ہیڈ ماسٹر کو معلوم ہوا تو اس نے چھٹی ہونے سے پہلے کلاس میں آکر سبھوں کے بستوں کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ کرم دین تاڑ گیا اس نے بڑی ہوشیاری سے دس روپے کا نوٹ اپنے قریب کے ساتھی کی جیب میں چپکے سے ڈال دیا۔ اس واقعے کو اتنے سال بیت گئے لیکن کرم دین آج تک یہ یاد کر کے خوش ہوتا ہے کہ اس کی چالاکی سے چوری کا کسی کو علم نہیں ہو سکا۔ اگر چہ اس کا ساتھی بے چارہ بار بار رو رو کر چلاتا رہا کہ میں نے نہیں چرائے پیسے۔ مگر سب یہی کہتے رہے کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے بعد سے کرم دین نے ڈر کے مارے کافی عرصے تک جھوٹ کا سہارا نہیں لیا۔ جھوٹ دراصل اس کی گھٹی میں اوائل عمر ہی سے پڑ چکا تھا اور اب وہ اپنے ہر غلط کام کے دفاع کے لیے جھوٹ کو ضروری سمجھنے لگا تھا۔

کرم دین کو یہ بھی بُرا لگتا تھا کہ اسے کوئی مولوی جی کے نام سے پکارے وہ اپنے آپ کو مولوی کہلوانا قطعاً پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کی داڑھی تو ایک فریب تھی جو اس نے دینی درس و تدریس کے لیے رکھ چھوڑی تھی۔ جس کی بدولت اسے ٹیوشن آسانی سے مل جاتے تھے لیکن ستم ظریفی سے اسے نوکری ملی بھی تو مسجد میں تاہم اس نے دل میں طے کر رکھا تھا اگر مسجد میں مولوی بن کر پڑھانے کی بجائے کوئی اچھی سی ملازمت ہاتھ لگ گئی تو وہ مولوی اور اس کی داڑھی دونوں کا صفایا کر دے گا۔ اس کا دراصل یہ پلان تھا کہ کچھ تجربے کے ساتھ ساتھ کچھ پیسے بھی جمع ہو جائیں تو وہ مولوی ملا کا ڈھونگ چھوڑ کر کوئی اور معقول کام حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

میلے سے لوٹنے کے بعد کرم دین کے دل و دماغ پر ریشم بری طرح مسلط ہو چکی تھی۔ رات بھر بستر پر پڑا وہ یہی سوچتا رہا کاش اس کی ماں زندہ ہوتی تو وہ ریشم کے گھر اپنا رشتہ بھجوا دیتا۔ اسی سوچ میں کروٹیں بدلتے بدلتے صبح ہو گئی۔ آج جمعہ کا روز تھا۔ مولوی کرم دین نے اپنے ذہن میں آج کے لیے ایک خاص اسکیم کا خاکہ تیار کر لیا تھا۔ جلدی جلدی نہا دھو کر فارغ ہونے کے بعد اس نے صبح کے سارے ضروری کام کاج نمٹائے اور گھر سے نکل پڑا۔ اس کے قدم اسی راستے کی جانب بڑھنے لگے جہاں ریشم کے گھر کا اسے اندازہ تھا۔ گلی کا نام تو معلوم تھا مگر ریشم کے گھر کا کوئی نمبر وغیرہ اس کے پاس نہیں تھا کسی سے پوچھے تو کیسے پوچھے؟ وہاں پہونچ کر پاگلوں کی طرح وہ گلی کی سڑک کے چکر لگاتا رہا مگر اسے ریشم کا گھر نہیں مل سکا۔ چناں چہ ناامید ہو کر واپس لوٹنا چاہتا تھا کہ اچانک اس کی نظر پی جے پر پڑی جو گلی کے نکڑ پر واقع ایک گھر سے باہر نکل رہا تھا۔ کرم دین اسے دیکھتے ہی تیز قدموں سے آگے بڑھ کر گلی کے نکڑ پر جا کر رک گیا۔ پی جے نے جو دیکھا کہ مولوی کرم دین وہاں موجود ہے تو بڑے تپاک سے سلام کیا اور حیرت سے پوچھا 'خیریت ہے مولوی صاحب؟ صبح ہی صبح آپ یہاں کیسے نکل پڑے؟'' یوں ہی وہ آج جمعہ کا دن ہے سو میں یہاں جمعہ بازار سے کچھ پھل سبزی خریدنے نکل آیا۔ اب مسجد جا رہا ہوں' کرم دین نے بڑی سیاست سے وضاحت پیش کرنے کی کوشش کی۔ 'ارے اچھا ہوا مولوی صاحب آپ قسمت سے یہاں مل گئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ آج آپ کے اسٹوڈنٹ رشید کو مسجد آنے میں کچھ دیر ہو جائے گی۔ کیوں کہ آج مجھے اس کو ہسپتال لے کر جانا ہے۔ اس نے جو مصنوعی ٹانگیں لگوائی ہیں نا ڈاکٹر آج ان کا معائنہ کرنے والے ہیں۔ کرم دین نے سنی ان سنی کرتے ہوئے انداز میں جواب دیا 'ہاں!

ٹھیک ہے اس کے بعد جیسے ہی پی جے جانے کے لیے مڑا تو کرم دین نے فوراً پکارتے ہوئے دریافت کیا 'ارے وہ رشید بھی تو یہیں کہیں رہتا ہے نا؟' پی جے نے اشارے سے بتاتے ہوئے کہا 'ہاں آپ کو نہیں معلوم وہ سامنے کالے گیٹ والے گھر میں جہاں سے میں ابھی ابھی نکل کر آیا ہوں ۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ مسجد میں ملاقات ہوگی۔' یہ کہتا ہوا پی جے اپنی سائکل پر پھرتی سے سوار ہوگیا۔ کرم دین جوش اضطراب میں کالے گیٹ کے سامنے کھڑا پی جے کی جانب اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہوگیا۔ چند ہی لمحوں میں کرم دین کالے گیٹ کے پاس کھڑا تھا۔ اس کو گھر کے ہر روزن سے ریشم کا چہرہ جھانکتا ہوا نظر آنے لگا۔ اس نے دروازے پر بے اختیار دو تین بار دستک دی۔ رشید کے والد سلیمان صاحب نے دروازہ کھولا۔ مولوی صاحب سے وہ اچھی طرح واقف تھے لہٰذا بڑے احترام سے انھوں نے خیر مقدم کرتے ہوئے کرم دین کو اندر آنے کو کہا۔ کرم دین کو اور کیا چاہیے تھا سلام وغیرہ کے بعد بڑے ہمدردانہ لہجے میں دریافت کیا کہ رشید میاں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا؟ یہ پی جے سے ابھی ابھی معلوم ہوا۔ سلیمان صاحب نے کرم دین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وضاحت کی 'نہیں کچھ معمولی سا درد ہے۔ آج پی جے اسے ہسپتال لے جائے گا۔ وہاں اس کی ٹانگوں کا چیک اپ وغیرہ ہونے والا ہے۔' اس کے بعد سلیمان صاحب نے بطور تواضع چائے اور کچھ مٹھائی پیش کی۔ لیکن کرم دین نے مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جانے کی اجازت چاہی کہ مجھے جلد مسجد واپس پہنچنا ہے انشاء اللہ پھر فرصت سے حاضر ہوں گا۔ میرے لائق کوئی کام ہو تو بتائیے گا۔ ویسے بھی ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے دکھ درد کا خیال رکھنا شرعاً لازمی ہے۔ اچھا اللہ حافظ۔' یہ کہہ کر کرم دین رشید کے گھر سے رخصت ہوا اور ریشم کی حسرت دیدار لیے ناامیدی سے منہ لٹکائے گھر کی جانب چل پڑا۔ راستے بھر وہ اسی سوچ کے عذاب میں مبتلا رہا کہ ریشم گھر میں ہوتی تو ضرور نظر آتی۔ اتنی صبح ہی صبح وہ کہاں جا سکتی ہے؟ اس کی صورت سے تو ایسا نہیں لگتا کہ وہ کالج میں پڑھتی ہے اور اس قدر سویرے کون کالج جاتا ہے؟' ریشم سے متعلق وہ اس طرح کی بے سروپا باتیں سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا تھا۔ اس کے نزدیک کالج جانے والی ہر لڑکی آزاد طبع ہوتی ہے۔ 'لیکن ریشم جس کا چہرہ اس کی معصومیت اور نیک کردار کا ترجمان ہے ہرگز کالج جانے والی لڑکیوں میں شامل نہیں ہوسکتی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ پی جے کے بہکاوے میں آکر وہ معصوم کہیں غلط جگہ چلی گئی ہو۔ رشید کی مدد کرنا تو حقیقت میں پی جے کا ایک فریب ہے۔' سارے راستے کرم دین کے دل و دماغ پر اسی قسم کے بے ہودہ خیالات کی یورش ہوتی رہی۔ اسے اب پی جے سے سخت نفرت سی ہونے لگ گئی تھی۔ اور جب اسے یہ خیال آتا کہ پی جے تو ایک کرسچین چوزہ ہے جو پاک صاف مسلمان گھروں میں گھس کر گندگی پھیلاتا ہے تو اس کا چہرہ غصے اور انتقام کی آگ میں جل کر سرخ ہو جاتا۔ بہر حال وہ بمشکل تمام اس ذہنی انتشار سے گزر کر گھر پہونچ ہی گیا۔

حسن جو وہاں کب سے کرم دین کا انتظار کر رہا تھا اس کو اس طرح حواس باختہ دیکھ کر بے ساختہ ہنستے ہوئے پوچھ بیٹھا 'ارے مولانا یہ کیا شکل بنالی ہے۔ ایسا لگتا ہے کسی کو قتل کر کے آرہے ہو۔ خیریت تو ہے؟' 'نہیں کچھ نہیں وہ سبزی والے سے ذرا تو تو میں میں ہوگئی تھی۔ سالے اتنے مہنگے دام مانگتے ہیں۔' یہ کہہ کر کرم دین چپ

ہوگیا۔ حسن نے بات کو ٹالتے ہوئے کہا' ارے یہ منافع نہیں کمائیں گے تو کھائیں گے کہاں سے۔ ویسے مہنگائی نے سارے ملک کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے تم غصے کو تھوک دو اور جا کر کچھ دیر آرام کرلو میں اتنے فرسٹ کلاس چائے بنا کر لاتا ہوں۔' کرم دین نے چپ رہنے ہی میں اس گھڑی عافیت سمجھی حالانکہ وہ غصے کی آگ میں متواتر جل رہا تھا۔ اب پی جے کا وجود اس کے لیے وہاں ایک لمحہ بھی برداشت کے قابل نہیں تھا۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ وقت ہوگیا تھا۔ طالب علم بچے مدرسے میں آچکے تھے جلدی سے اس نے کپڑے تبدیل کیے اور حسن کی چائے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مسجد چلا گیا۔ وہاں سب بچے کلاس میں موجود تھے جیسے ہی اس نے حاضری لینا شروع کی۔ رشید بیساکھیوں کی مدد سے کلاس میں داخل ہوا اور اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ کرم دین کے ذہن و دماغ اس وقت بری طرح منتشر تھے۔ بچوں کو اپنی اس حالت میں کچھ پڑھانا اس کے لیے سخت مشکل ہو رہا تھا۔ اچانک اس کے دل میں کیا آیا کہ اس نے پڑھانے لکھانے کی بجائے اپنی بے سر پیر کی باتوں کا ایک پلندہ کھول دیا۔ 'تم کو معلوم ہے بچو کہ یہ ہمارا پاکستان، پیارا پاکستان کیوں بنا؟ قایداعظم نے اس لیے پاکستان بنایا کہ یہاں ہماری ایک آزاد اسلامی ریاست قائم ہو۔ تمھیں معلوم ہے کہ یہ ملک صرف اور صرف ہم مسلمانوں کے لیے بنایا گیا ہے۔ ساری کلاس بغیر کچھ سمجھے بوجھے خاموشی سے اپنے ٹیچر کو تکتی رہی۔ کرم دین کا وعظ بدستور جاری رہا۔ بچو تم نہیں جانتے تمھارا اب کیا فرض بنتا ہے تم کو چاہیے کہ غیر مسلموں سے کوئی واسطہ نہ رکھو خاص طور سے کرستانوں سے۔ یہ لوگ بس۔ پوچھو مت۔ کتنے خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ بڑی چالاکی سے لوگوں کو اپنے جال میں پھنسا لیتے ہیں۔ کلاس کے کسی بچے نے اُٹھ کر نہایت ہی معصومیت سے دریافت کیا' مولوی صاب! یہ سب، ایسا کیوں کرتے ہیں؟' 'میں بتاتا ہوں۔' کرم دین نے بڑی ہوشیاری سے ایک من گھڑت واقعہ سنایا' ابھی حال ہی کی بات ہے کہ افریقہ کے کسی مسلم ملک میں جتنے کرپچین تھے ان سبھوں کو وہاں سے ملک بدر کرنے کا سرکاری آڈر دے دیا گیا۔ جانتے ہو کیوں؟ اس لیے کہ وہ کافر اپنے امدادی کاموں کے بہانے غریبوں کو بہکا کر عیسائی بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ زبردستی۔ بچوں کا ذہن دراصل اس ناپختہ عمر میں دوسروں کی باتوں کا اثر بہت جلد قبول کرلیتا ہے اور خاص کر مذہب کے نام پر فساد پھیلانے والے مولوی ملاؤں کی غلط صحیح جذباتی باتیں انھیں فوراً متاثر کرتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ کلاس کا وقت ختم ہو، کرم دین نے سبھوں کو تاکید کی کہ آیندہ وہ کسی کرپچین سے کوئی مدد وغیرہ نہیں لیں گے۔ کلاس ختم ہوئی اور طلبا اپنے استاد کی نصیحتوں کی بکو اس ساتھ لیے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ اس کے بعد کرم دین کو جہاں بھی موقع ملتا باقاعدہ کرپچین کمیونٹی کی مخالفت کرنا شروع کر دیتا۔ حسن کو جب اس کا پتا چلا تو اس نے کرم دین کو آڑے ہاتھ لے کر اپنے غم و غصے کا اظہار کیا' تمھیں معلوم ہے جو تم یہ حرکت کر رہے ہو اس سے کتنا فساد برپا ہوگا۔ اگر چودھری شجاعت صاحب کو اس کا علم ہوگیا تو وہ تمھیں فوراً یہاں سے چلتا کر دیں گے۔' لیکن کرم دین پر جنون کا سا عالم طاری تھا،' نکالتے ہیں تو نکالنے دو۔ مجھے سچ بات کے کہنے میں کسی کی پرواہ نہیں۔ میں تو وہی کہوں گا جو میرا مذہب مجھے سکھاتا ہے۔ حسن نے بڑے آرام سے پہلے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن جب کرم دین کی غیر عقلی منطق ناقابل برداشت ہوگئی تو وہ اس پر غصے سے برس پڑا' تم جیسے مولویوں نے ہی ساری دنیا میں اسلام کو

بدنام کر رکھا ہے۔ ہمارا مذہب تو اس بات کے خلاف ہے کہ رنگ نسل اور مذہب کی بنیاد پر کسی سے نفرت کی جائے۔' کرم دین نے جب بات اس قدر بگڑتی دیکھی تو معاملے کی نزاکت کے پیش نظر بڑی سیاست سے حسن کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔'سوری یار۔ چل چھوڑ۔کوئی اور بات کرتے ہیں۔تو بھی کیایاد کرے گا آج میں ایک تیری شاندار ضیافت کرتا ہوں وہ پہلوان کا مشہور بادشاہ ریسٹورنٹ ہے نا اس میں چل کر کھاتے ہیں۔کیا تندوری مرغ چھولے اور کباب بناتا ہے حسن نے بھی اب عمداً اس باہمی بدمزگی کو کسی حد تک بھول جانا ہی مناسب سمجھا۔اس نے کرم دین کے باہر کھانے کی تجویز کی تائید کرتے ہوئے کہا۔'ہاں بھئی آج بڑے زوروں کی بھوک لگ رہی ہے اور ویسے آج کچھ کھانا بنانے کی فرصت ہی نہیں ملی۔چلو، چلتے ہیں۔دونوں نے پہلوان کے اڈے پر جا کر دھاوا بولا اور خوب شکم سیر ہو کر کھانے کی عیاشی کی۔مرغی پراٹھے، چھولے، سیخ کباب اور اس کے بعد گاجر کا مرغن حلوا جو خالص گھی سے مہک رہا تھا۔خوب جی بھر کر اس طرح کھایا کہ جیسے کئی دنوں کے بھوکے ہوں۔دراصل ہر روز خود ہی جس طرح بھی بن پڑتا دونوں روکھا سوکھا پکاتے اور اس پر اکتفا کر لیتے اس طرح پیسوں کی بچت سے بھی خاصا فائدہ ہو جاتا۔کھانے کے بعد کشمیری چائے جو بالائی سے زری بھری تھی مزے لے لے کر پی اور جب بل ادا کر کیا تو کرم دین نے پہلوان صاحب سے ان کے لذیذ پکوان کی تعریف کرتے ہوئے کہا' پہلوان صاب! سارے شاہ پور میں آپ کی دھوم ہے۔آپ کے ہاں کے کھانے سے تو اپنی ماں کے ہاتھ کا پکا ہوا یاد آجاتا ہے۔''بس خدا کا فضل ہے جی اور آپ لوگوں کی مہربانی ہے کہ آپ جیسے کرم فرما یہاں تشریف لاتے ہیں۔ہم ویسے شادی بیاہ میں بھی کھانا سپلائی کرتے ہیں۔اگلے مہینے وہ اپنے سلیمان صاب ہیں نا انھوں نے بھی ہماری ہی جگہ پر شادی کے کھانے کا آڈر بک کرایا ہے۔' کرم دین کے چہرے کا رنگ یہ سنتے ہی فق ہو گیا اور انتہائی تشویش سے دریافت کرنے کی کوشش کی کہ یہ سلیمان کون ہیں؟ حسن جو کرم دین کی جانب سے کھانے کی مسلسل مدح سرائی سن کر قدرے تنگ آچکا تھا، کرم دین کا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔'چل بھائی بہت دیر ہوگئی۔میں تجھے بتاتا ہوں یہ سلیمان صاحب کون ہیں۔یہ رشید اور ریشم کے والد صاحب ہیں اوہ ہو! اس ہنگامے میں تجھے میں بتانا ہی بھول گیا کہ سلیمان صاحب نے ہم دونوں کو تقریب شادی میں مدعو کیا ہے۔آج ہی صبح ان کی جانب سے دعوت کا کارڈ ملا ہے۔اگلے ماہ کی دس تاریخ کو ریشم کی شادی ہے۔'اس خبر سے کرم دین پر ایک بجلی سی گرگئی۔اسے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔اس کے قدم تیزی سے گھر کی جانب بڑھ گئے۔مسجد پہونچ کر حسن کو اللہ حافظ کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ریشم کی شادی کی خبر اس کے کانوں میں کسی گرتی ہوئی دیوار کے شور کی طرح گونجنے لگی اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا سارا وجود ریزہ ریزہ ہو کر خاک ہو گیا ہے۔اس نے ریشم کو اپنی زندگی کے ایک ارمان بھرے خواب میں پرو لیا تھا۔ اس کے تصور میں ایک چھوٹا سا پیار بھرا گھر تھا جس میں وہ ریشم کو دلہن بنا کر لائے گا اور جب شام کو کام کاج سے تھکا ہارا گھر لوٹے گا تو آنگن میں کھیلتے ہوئے ننھے منے بچے اس سے لپٹ جایا کریں گے۔کرم دین شروع ہی سے زندگی کی تلخ سچائیوں کا سامنا کرنے سے گریزاں تھا۔اس نے اپنے اطراف جھوٹ اور فریب کا ایک سنہری جال بن رکھا تھا جس سے نکلنا اس کے لیے دشوار تھا۔اس کی حالت اس خبر سے نیم پاگل جیسی ہوگئی۔

ساری رات اس نے جاگ کر گزاری بستر پر پڑے پڑے اس کے دل میں اپنے مقصد کے حصول کے لیے طرح طرح کے غلط خیالات جنم لے رہے تھے۔کہ اچانک اس نے دروازے پر کسی کی دستک سنی۔اس نے اٹھ کر جیسے ہی دروازہ کھولا تو حسن کو پایا۔حسن نے کرم دین کو دیکھتے ہی پوچھا 'ارے تم ابھی تک بستر سے باہر نہیں نکلے، چودھری شجاعت صاحب فجر کی نماز کے لیے مسجد تشریف لائے ہیں اور تم سے ملنا چاہتے ہیں۔' یہ سنتے ہی کرم دین نے جلدی سے پریشانی کے عالم میں کپڑے تبدیل کیے اور کمرے سے نکل کر باہر آیا تو دیکھا کہ حسن قریب راہداری میں اس کا انتظار کر رہا ہے۔جوں ہی حسن کی کرم دین پر نگاہ پڑی اس نے کرم دین سے کہا کہ جلد جاؤ مسجد کے دفتر میں چودھری صاحب تمہارا کب سے انتظار کر رہے ہیں اور ہاں ساتھ میں پی جے بھی ہے۔' پی جے کا نام سن کر تو کرم دین کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔غرا کے بولا 'اس بدمعاش پی جے کی کیسے ہمت ہوئی کہ وہ مسجد کی پاک صاف جگہ پر اپنے ناپاک قدم رکھے'اس سے پہلے وہ کچھ اور اول فول بکتا حسن نے سختی سے اسے چپ کرا دیا۔اور اپنے ساتھ لے کر تیزی سے دفتر کی جانب چلنے کا اشارہ کیا۔جیسے ہی وہ دفتر کے کمرے میں داخل ہوئے، چودھری صاحب نے دونوں کو بیٹھنے کے لیے کہا۔اس وقت سارے کمرے میں ایک پُر اسرار سی خاموشی طاری تھی۔چودھری صاحب کے یوں اچانک بلانے پر کرم دین کے چہرے پر قدرے خوف و حیرت کے آثار نمایاں تھے کچھ تامل کے بعد چودھری صاحب کرم دین سے مخاطب ہوئے'مجھے آپ کے بارے میں کچھ اچھی خبریں نہیں مل رہی ہیں۔پی جے کا کہنا ہے کہ آپ نے اس کی کمیونٹی کے خلاف بچوں کو ورغلانا شروع کر دیا ہے۔آپ کے گمراہ غلط پروپگنڈے کی وجہ سے بے چارے کچھ کرسچین خاندان شاہ پور چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہونے کی سوچ رہے ہیں نہایت ہی سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ آپ کو نوکری سے فارغ کر دیا جائے اسی میں آپ کی اور دیگر گانو والوں کی بھلائی ہے۔آپ کو ایک مہینے کی تنخواہ ایڈوانس دے دی جائے گی اور آپ کو ایک ہفتے کے اندر اپنا کمرہ خالی کرنا پڑے گا میں کسی طور سے کوئی مذہبی فتنہ برداشت نہیں کر سکتا۔اگر آپ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں۔' کرم دین اندر ہی اندر آگ بگولا ہو رہا تھا اس نے بڑی سرد مہری سے جواب دیا'نہیں مجھے کچھ نہیں کہنا۔اس کا جواب سنتے ہی چودھری صاحب اور پی جے اٹھ کر دفتر کے کمرے سے باہر چلے گئے۔حسن نے کرم دین کی جانب استفہامیہ انداز سے دیکھا۔کرم دین کا سارا وجود غصے اور نفرت کی آگ میں جل بھن رہا تھا'یہ دو ٹکے کا چوڑا پی جے، کرستان کی اولاد اس کو تو میں ایسا برباد کروں گا کہ اس کا نام ونشان تک باقی نہیں رہے گا۔' کرم دین خدا کے لیے اپنے پر قابو رکھو۔چلو میں تمہارے کمرے تک تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔حسن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی اس اثنا اچانک اس کی نظر کرسی کے قریب ایک بریف کیس پر پڑی جو پی جے کا تھا شاید وہ عجلت میں اسے لے جانا بھول گیا تھا۔حسن نے بریف کیس کو اپنی تحویل میں لیتے ہوئے کہا'خیر اسے جب احساس ہوگا تو وہ یہیں ڈھونڈتا ہوا واپس لوٹ کے آئے گا۔اسے یہیں رہنے دیتے ہیں ورنہ مجھے جا کر اسے دینا پڑے گا۔' حسن کرم دین کو اپنے کمرے میں لے گیا تاکہ جو کچھ آج پیش آیا ہے وہ اس کے بارے میں کرم دین کو تنہائی میں نرمی سے سمجھا بجھا سکے۔اس نے دل جوئی کرتے ہوئے کہا' کرم دین تم اتنے یہاں

کمرے میں آرام کرو میں تمہارے لیے بڑھیا سا ناشتہ تیار کر کے لاتا ہوں۔ کرم دین پر خاموشی طاری تھی لیکن اس کا دماغ پی جے کے خلاف کسی انتقامی سازش کی سوچ میں الجھا ہوا تھا۔ حسن نے کرم دین کو مسلسل خاموش دیکھ کر ازراہِ ہمدردی سمجھانے کی کوشش کی 'تم زیادہ پریشان مت ہو، دیکھو! چودھری صاحب نہایت رحم دل بندے ہیں، تمھیں ضرور ایک اور موقع دیں گے' یہ کہ کر حسن ناشتہ بنانے اندر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کرم دین پر پاگل پن کا ایسا بھوت سوار تھا کہ وہ چاہتا تھا پی جے سے اس کی اس کمینی حرکت کا ایسا بدلہ لے جسے وہ عمر بھر نہ بھول سکے۔ یکا یک اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی در آئی اور اس کے ہونٹوں پر ایک گھناؤنی مسکراہٹ تیرنے لگی۔ اس کے کچھ ہی لمحوں بعد اس کے چہرے پر یک عجیب سا ٹھہراؤ پیدا ہو گیا وہ اب اپنے آپ کو نہایت ہی پرسکون محسوس کر رہا تھا تقریباً آدھا گھنٹے کے عرصے بعد حسن ناشتے کی تھالی لیے کرم دین کے کمرے میں داخل ہوا 'ارے تمہارے کمرے میں یہ دھواں کیسے بھرا ہوا ہے؟ سب ٹھیک تو ہے؟' حسن نے یہ کہتے ہوئے کمرے کی بند کھڑکیوں کو تیزی سے بڑھ کر کھول دیا 'ہاں ٹھیک تو ہے تم فکر مت کرو میں وہ اپنے پرانے بے کار کاغذات جلا رہا تھا اسی لیے دھواں بھر گیا' کرم دین نے بڑے اطمینان سے جواب دیا اور ناشتے کی تھالی پر ٹوٹ پڑا اس کی اشتہا شاید اس وقت بہت تیز ہو گئی تھی۔ چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے اس نے فاتحانہ لہجے میں کہا 'کل میں تمہارے شاہ پور گانو کو چھوڑ کر اپنے شہر چلا جاؤں گا۔ مجھے اس جگہ رہنے کا قطعی کوئی شوق نہیں ہے جہاں مسلمانوں کی بے عزتی ہو' حسن کرم دین کے اس ردعمل سے سخت حیران ہوا اور سوچنے لگا کہ اس شخص کو اپنے کیے پر ابھی تک قطعاً کوئی افسوس نہیں ہے۔ حسن کے لیے اب اس کی باتیں ناقابل برداشت تھیں وہ بغیر کچھ کہے وہاں سے باہر نکل آیا اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ 'ارے تم بھی اوروں کی طرح داغ مفارقت دے رہے ہو' کرم دین نے ہنستے ہوئے اس طرح اس سے پوچھا کہ جیسے وہ کوئی طنزیہ نشتر چبھو رہا ہو کرم دین نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور بشانِ بے نیازی سے کرسی ٹیبل پر ٹانگیں پھیلا کر پی جے سے انتقام کے بارے میں سوچنے لگ گیا۔

شام ہو چکی تھی۔ کرم دین اپنے پلنگ پر لیٹا آنکھیں موندے پی جے کے خلاف اپنے فاتحانہ اقدام کی کامیابی کے خواب بن رہا تھا کہ دفعتاً دروازے کی متواتر تیز دستک نے اسے چونکا دیا 'کون؟' کرم دین ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ 'کرم دین جلدی دروازہ کھول۔ میں کب سے آواز دے رہا ہوں' حسن کی اس طرح آمد پر کرم دین کا ماتھا ٹھنکا اور اس نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ حسن بہت گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا 'تمھیں معلوم ہے کہ باہر کیا ہنگامہ ہو رہا ہے؟ پولیس والے پی جے کو گرفتار کر کے لے گئے ہیں۔ سنا ہے اس کے بریف کیس میں قران پاک کے جلے ہوئے کچھ صفحے پائے گئے ہیں۔ اس پر قران پاک کی بے حرمتی کا الزام ہے۔ ٹی وی پر بھی اس واقعے کی خبر آگئی ہے۔ جس کے نتیجے میں لوگوں نے مشتعل ہو کر کچین کالونی پر حملہ کر دیا ہے اور وہ اب ان کے گھر جلانے جا رہے ہیں۔ چودھری شجاعت اس صورت حال سے سخت پریشان ہیں۔ جانتے ہو اس گانو کے اندر آج تک پولیس والوں نے اپنے قدم نہیں رکھے ہیں۔ چودھری صاحب کو سخت تشویش ہے کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہوا اور پولیس کو اس واقعے کی کس طرح اطلاع موصول ہوئی۔ مولوی کرم دین بڑے

اطمینان سے سے حسن کی روداد سنتا رہا اور دل ہی دل میں اپنی کارستانی پر خوش ہوتا رہا۔ کرم دین کی باتیں سننے کے بعد اس نے بڑی شانِ بے نیازی سے اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا 'حسن صاحب دیکھا آپ نے جیسا جو کرتا ہے ویسا ہی وہ بھرتا ہے میں تو شروع ہی سے اس کی مذموم حرکتوں کی جانب توجہ مبذول کرا رہا تھا مگر کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی تھی۔ کرم دین نے اپنے اس جملے کی ادائیگی میں اپنی برہمی کا بڑی شد ومد کے ساتھ اظہار کیا۔ اب سور کا بچہ ساری عمر جیل میں سڑتا رہے گا۔'' لیکن میرا دل نہیں مانتا کہ پی جے اس قماش کا لڑکا ہے۔ میں اس کے کردار سے اچھی طرح واقف ہوں۔ ہو نہ ہو ضرور اس کے پیچھے کسی سازش کا ہاتھ ہے۔' حسن کے ان جملوں سے پی جے کے بارے میں اس کے وثوق اور تذبذب کے ملے جلے جذبات صاف عیاں تھے۔

حسن کی آنکھیں اس ساری گفتگو کے درمیان کمرے کا غیر شعوری طور سے جائزہ لینے میں مصروف تھیں کہ اچانک اسے یاد آیا کہ جب صبح وہ کرم دین کے کمرے میں داخل ہوا تھا تو اس نے کچھ کاغذات جلانے کا ذکر کیا تھا جس کی بو اس نے کمرے کے اندر آتے ہی محسوس کی تھی اس خیال کے ذہن میں آتے ہی معاملے کی حقیقت کا سراغ اس کے ہاتھ لگ گیا۔ جب پی جے کے بریف کیس سے جلے ہوئے صفحات برآمد ہوئے تھے تو کرم دین مسجد میں اسی ہی جائے وقوع پر موجود تھا۔ اب حسن کا ذہن اس واقعے کی تہ تک پہونچ چکا تھا۔ حسن کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ کرم دین اس حد تک کمینہ بن سکتا ہے۔ اس نے طیش میں آ کر کرم دین کا گریبان زور سے اپنی گرفت میں لے کے کھینچا اور حقارت سے چلا کر کہا' تو انسان نہیں جانور سے بھی بدتر ہے تجھ کو مولوی کہنا بھی ایک عالم دین کی توہین ہے۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تو اس حد تک گر سکتا ہے۔ تو نے اپنی ناپاک ہوس کو پورا کرنے کے لیے اپنے ہی مذہب کی مقدس کتاب کی بے حرمتی کی۔' کرم دین کے چہرے پر اس وقت قطعاً ندامت کے کوئی آثار نمایاں نہیں تھے۔ اس نے بڑی ڈھٹائی سے اپنی خباثت کا اقرار کرلیا۔

'ہاں میں نے یہ سب کچھ کیا جس پر مجھے کوئی ندامت نہیں ہے بلکہ فخر ہے کہ میں نے ایک کافر کی اسلام دشمنی سازش سے ملک وقوم کو نجات دلانے کا یہ جائز حربہ استعمال کیا۔ میرے پاس اس کے سوا اور کوئی مناسب راستہ نہیں تھا۔ اگر میں اس طرح کا یہ اقدام نہیں اٹھاتا تو یہ دشمن اسلام شاہ پور کے تمام بھولے بھولے مسلمانوں کو ورغلا کر کرسچین بنا دیتا۔ ایسے شیطان نما انسانوں سے چھٹکارا دلانا میرے لیے ایک اولین اسلامی فریضہ ہے۔ شکر ہے باری تعالیٰ کا میں نے اپنے لیے جنت کا راستہ ہموار کرلیا۔'

کرم دین کی یہ ساری خرافات سن کر حسن کی آنکھوں میں غصے کے مارے خون اتر آیا۔ اس کے جذبات قابو سے باہر ہو گئے تھے اس نے کرم دین کے منھ پر زور سے ایک طمانچہ جڑ دیا اور چلا کر کہا۔ 'کمینے تجھے اب جنت کا راستہ ملے گا یا جہنم کا یہ تجھے ابھی پتہ چل جائے گا' یہ کہہ کر حسن تیزی سے کمرے کے باہر نکل گیا اور چودھری صاحب اور پولیس کے حکام کو ساری حقیقت سے آگاہ کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد پولیس آئی اور پھر پولیس وین میں مولوی کرم دین ہتھکڑیاں پہنے جنت کے سفر پر گام زن ہو گیا۔ ■■

شمس الحق عثمانی

ملزم خواجہ احمد عباس کے دفاع میں ایک بیان

افسانہ 'سردار جی' پر دائر مقدمے کے زمانے میں، شاعرہ سروجنی نائیڈو نے، بہ حیثیت گورنر اتر پردیش، خواجہ احمد عباس سے افسانہ سنا، متاثر ہوئیں اور کہا:

''بھلا تو امید کرتا ہے کہ اِس ملک میں ایسی لطیف طنز اور ادبی باریکی کو عام لوگ سمجھ پائیں گے، خصوصاً ایسے وقت میں جب فرقہ وارانہ منافرت اِس وقت تک]؟ اِس حد تک] بڑھی ہوئی ہے۔''

(رام لال نابھوی۔ ''خواجہ احمد عباس کا مشہور افسانہ: سردار جی''، مشمولہ: خواجہ احمد عباس: افکار، گفتار، کردار۔ مرتب: راج نرائن راز۔ ص: ۱۷۵)

ایک شاعرہ نے، لطیف طنز اور ادبی باریکی کو ایسے وقت میں عام لوگوں کے لیے ناقابلِ فہم تصور کیا تھا کہ جب معاشرے میں فرقہ وارانہ منافرت، بھانت بھانت سے اپنے رنگ دکھا رہی تھی۔

افسانے کی اشاعت اور یوپی حکومت کی جانب سے اُس پر مقدمے کا دور (سنہ ۱۹۴۸، ۱۹۴۹) تو بے شک، برِّصغیر پر حاوی ذہنی اختلال کا دور تھا جس میں افسانہ ''سردار جی'' کے بین السطور میں کارفرما لطیف طنز تک، عوام تو کیا، خواص کہے جانے والے بہت سے صحافیوں کی فہم بھی رسائی نہ پا سکی — لیکن اسے کیا کہیں کہ مذکورہ افسانے کی سیر حاصل تفہیم کا قرض تاحال ہماری تنقید پر واجب ہے — صرف ایک مثال: افسانے کے اختتامی حصے میں، شیخ برہان الدین اور سردار جی کا یہ مُکالمہ:

''سردار جی یہ تم نے کیا کیا؟''

''مجھے کرجا اُتارنا تھا بیٹا!''

''قرضہ؟''

''ہاں! راول پنڈی میں تمھارے جیسے ہی ایک مسلمان نے اپنی جان دے کر میری اور میرے گھر والوں کی جان اور اجت بچائی تھی۔''

''کیا نام تھا اُس کا سردار جی؟''

''گلام رسول۔''

''غلام رسول!''

اس مکالمے اور مدتوں پہلے غلام رسول کے ایک پُرتضحیک بیان کی بنا پر کیا گیا افسانے کا اختتام، متقاضی تھے کہ اردو فکشن کی تنقید، دونوں امور میں برتی گئی فنی مہارت اور بلاغت کی توضیح کے ذریعے، خواجہ احمد عباس کے ایماو مقصد تک پہنچتی، مگر یہ نہ ہو۔ صرف افسانہ سردار جی عرف میری موت ہی نہیں بلکہ ابابیل، ایک لڑکی، بارہ گھنٹے، روپے آنے پائی، شکراللہ کا، نیلی ساڑی اور ناول انقلاب کے لیے بھی یہ نہ ہوسکا — اس ناہوت کا سبب، احمد عباس کو بس نرا صحافی تصور کرنے والا ذہن ہے — جس نے، ارادی اور غیر ارادی طور پر، اُن کے افسانوں اور ناول انقلاب کو بھی ایسی تحریریں باور کیا جو اولین قرائت میں ہی اپنے تمام جہات و معانی، الم نشرح کر دیتی ہیں — ایسا لگتا ہے کہ ہر ہفتے "Last Page" اور ''آزاد قلم'' کے پیش نظر احمد عباس کے افسانوں اور ناول انقلاب کے تئیں، ادبی حلقوں میں بھی کچھ ویسی ہی عصبیت جڑ پکڑ گئی جیسی کہ افسانہ ''سردار جی'' کی اشاعت اول کے دنوں میں عام سکھوں اور مسلمانوں پر غالب تھی — اور جس کی گزند سے اُن کے حواس، مسز نائیڈو کے لفظوں میں، ادب کی لطافت اور باریکی تک رسائی سے قاصر ہو گئے تھے۔

کیونکہ ہر عصبیت نارسائیوں کی کوکھ ہے لہٰذا احمد عباس کی جملہ تحریروں کو صحافیانہ جلد بازی سے مملو تصور کرنے والا ذہن، اُن کی تصانیف میں کارفرما متعدد لطافتوں اور باریکیوں کے بھید نہ پاسکا۔

ہمہ گیر انسان دوستی اور معاشرے میں کارفرما عیوب کی جرأت مندانہ پردہ دری، خواجہ احمد عباس کی شخصیت اور تحریروں کی اساسی قوت اور کشش رہی ہیں — اور اِن کا سرچشمہ، درست طور پر، وہ آبائی ذہنی ورثہ قرار دیا گیا ہے، جس کی ثروت مندی میں خواجہ الطاف حسین حالیؔ سے خواجہ غلام السیدین تک متعدد روشن خیال، ذی علم اور دردمند شخصیات کی فکری و عملی کوششیں معاون رہیں۔

اس امر کی تفصیل ہماری فکری تاریخ کا اہم باب ہے کہ حالیؔ نے کیوں علی گڑھ تحریک کے منہج و مقاصد کو اس حد تک جزوِ جاں بنالیا تھا کہ سید احمد خاں، حالیؔ کی لکھی مسدس کو اپنا توشۂ آخرت ماننے لگے تھے — من تو شدم، تو من شدی — اور یہ نکتہ بھی کسی تفصیل کا محتاج نہیں کہ حالیؔ نے مسدس میں جس مد و جزر کا بیان کیا ہے اُس کا جزر اُنھیں برِصغیر کے مسلم معاشرے میں سب سے زیادہ نظر آیا تھا — غالباً یہی حالیؔ کا سب سے بڑا دُکھ ہے — اور اک ذرا ہمدردانہ نظر ڈالیں تو محسوس کر سکتے ہیں کہ خواجہ حالیؔ کے دکھ کا دامن خواجہ احمد عباس تک پھیلا ہوا ہے۔

احمد عباس کے وہ افسانے جو مسلم گھرانوں کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں یا جن میں مسلمان عورتوں مردوں کو کردار بنایا گیا ہے، ذرا تحمل کے ساتھ، بہ غور پڑھے جائیں تو محسوس کیا جا سکتا ہے کہ واقعات کے بیان اور کردار کے احوال کے ساتھ ہی افسانہ نگار نے اُس معاشرت اور ماحول کے ایسے پہلوؤں کی جانب اشارے کیے ہیں جو کرداروں کی طبائع پر منفی اثرات کا سبب ہوئے۔

افسانہ ''نیلی ساڑی'' کا مرکزی کردار، ایک لڑکی، سلیمہ ہے۔ احمد عباس نے یہ افسانہ، بمبئی کی ایک عدالت کے روبہ رو سلیمہ کے بیان کی شکل میں تحریر کیا ہے۔ وہ وہاں ایک ایسے شخص کے قتل کے الزام میں پیش ہوئی ہے جس نے قحبہ خانے کی مالکن کے حکم پر اُس کا چہرہ تیزاب سے جلایا تھا۔ چہرہ جلنے کی اذیت کے باوجود سلیمہ نے تیزاب کی بوتل چھین کر اُس کے سر پر دے ماری، بوتل میں بچا تیزاب چہرے سے ہوتا ہوا اُس کے منہ میں چلا گیا اور اُس کی موت واقع ہوگئی۔

یوپی کے قصبہ شکوہ آباد میں جنمی سلیمہ کے عدالتی بیان کا صرف ابتدائی حصہ، آئندہ سطور میں بہ اختصار درج ہے تا کہ احمد عباس کے بظاہر سادہ بیانیہ کی کچھ پرتیں کھل سکیں:

سلیمہ نے عدالت کو بتایا: میرے والد کریم بخش کچھ نہیں کرتے تھے، کسی زمانے میں زمیں دار تھے، زمینوں پر سیلنگ لگی تو معاوضے کے کاغذات بیچ کر کھاتے رہے۔ میری ماں، میرے پیدا ہوتے ہی مر گئیں۔ پھر میرے والد نے دوسری شادی کر لی۔ میری سوتیلی ماں، کریمن، ذات کی نائن تھی مگر شکل وصورت کی ذرا اچھی تھی۔ جب ہی تو میرے والد نے بیوی کے مرنے کے دو مہینے بعد ہی اُس سے نکاح پڑھوا لیا۔ محلّے والے کہتے تھے کہ اُن کا معاملہ کریمن کے ساتھ پہلے سے چل رہا تھا۔

کریمن نے مجھ سے کبھی سوتیلی ماں جیسا سلوک نہیں کیا۔ وہ مجھے ہمیشہ سینما ساتھ لے جاتی تھی اور ہر طرح کے ناز اُٹھاتی تھی۔

جب تک میں پندرہ برس کی ہوئی تو سینما کی پکّی شوقین بن چکی تھی۔ فلموں سے میں نے بہت کچھ سیکھا، مثلاً ہیروئن کی طرح کپڑے پہننا، اُن کے جیسے بال بنوانا یا کٹوانا۔ اُس زمانے میں سادھنا نئی نئی ''لو ان شملہ'' میں آئی تھی۔ اُس کی طرح ''فرنج'' میں نے بھی بنالی کہ میرا ماتھا بھی بڑا تھا اور فرنج یعنی کٹے ہوئے بالوں کی جھالر میرے چہرے پر بھی اچھی لگتی تھی۔

اگلے دن میرے خالہ زاد بھائی محمود علی نے جو مجھ سے پانچ چھ برس بڑے ہوں گے، میرے بال دیکھ کر کہا: ''کیوں سلیمہ ''لو ان شملہ'' تو دیکھا، ''لو ان شکوہ آباد'' کے بارے میں کیا رائے ہے؟'' اتنی بے شرمی کی بات سن کر میں وہاں سے بھاگ گئی۔ محمود بھائی، جاتے جاتے اتنا کہہ گئے کہ وہ دو دن کے بعد علی گڑھ جا رہے ہیں۔ کسی کو سینما چلنا ہو تو اُن کے ساتھ وہ کل چل سکتا ہے۔

میں نے اماں سے پوچھا، میں کریمن کو اماں کہتی تھی ''چلو گی اماں؟'' اماں نے کوئی بہانہ کر دیا۔ ابا تو]؟ بھی] سینما جانے کو تیار نہیں تھے۔ اماں نے کہا: ''اپنے گھر کا ہی تو لڑکا ہے، تُو اُس کے ساتھ چلی جا، بُرقع اوڑھ کے۔''

افسانے کے ابتدائی حصے کی اِس تلخیص سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ احمد عباس نے بہ ظاہر سیدھے سادے بیانیے میں وہ دُکھ سمویا ہے، جو کریم بخش جیسے نہ جانے کتنے: تن آسان، بدراہ اور بے فکرے، افراد کے مشاہدے اور تصور نے اُن کے ذہن و دل میں پیدا کیا تھا۔ معاشرے کے ایسے افراد کے باعث، احمد عباس جیسوں کو جو ذہنی اذیتیں سہنی پڑیں، اُن کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ گھر سے برقع اوڑھ کر نکلنے والی فلم زدہ سلیمہ نے، سینما ہاؤس کے باکس میں محمود علی کی تمام دست درازیوں کو بہ لذت تمام اپنے تن بدن پر لیا — مزید یہ کہ بقول سلیمہ:

"گرمیوں کی چھٹی میں محمود بھائی پھر شکوہ آباد آئے۔

کبھی خالہ اماں کے گھر جانے کے بہانے ہم اُن کے ہاں ملتے۔ کبھی کچھ نہ کچھ بہانہ نکال کر وہ ہمارے ہاں آجاتے۔ کبھی سینما ہم اماں کو ساتھ لے کر چلے جاتے۔ اور کبھی ہم خود ہی سینما چلے جاتے۔ اس دن میں نیلی ساڑی پہنتی۔

نیلا رنگ میرا محبوب رنگ تھا اور محمود کو بھی بے حد پسند تھا اور تب "باکس" میں بیٹھ کر ہی پکچر دیکھتے۔ بلکہ پکچر برائے نام ہی دیکھی جاتی۔"

برائے نام پکچر وغیرہ کا انجام، ایک روز سلیمہ نے محمود کو یہ بتایا کہ "... مجھے تو ابھی سے اُبکائیاں آنے لگی ہیں۔ نہ جانے کب بھانڈا پھوٹ جائے۔"

سلیمہ نے عدالت کو بتایا کہ یہ سن کر محمود علی نے اُسے دو چار دن میں کوئی ترکیب نکالنے کی تسلی دی۔ تین دن بعد بندو سقّے کے ذریعے، محمود کا خط ملا جس میں بس تین سطریں تھیں:

"جانِ من، آج تم آدھی رات کے بعد کسی ٹرین سے آگرہ آجاؤ۔

میں وہاں تمھیں ملوں گا۔ وہاں میں نے قاضی کا انتظام کر رکھا ہے۔

تمہارا محمود

نوٹ: نیلی ساڑی پہننا۔"

میں نے خط کو کئی بار پڑھا۔ بالکل "مسلم سوشل" کی فلمی سچوایشن تھی۔ میں نے بھی ویسی ہی تیاری کی جیسی مسلم سوشل فلم کی ہیروئن کرتی ہے۔"

اِس طویل افسانے میں شامل، سلیمہ کے ساتھ پیش آنے والے آئندہ واقعات بھی خواجہ احمد عباس نے اس طور خلق کیے ہیں کہ یہ بہ یک نظر فلمی کہانی محسوس ہوتا ہے — لیکن ادب کے اُس مہذب قاری پر جو فن پارے کو چار چھ بار بھی پڑھ سکتا ہے، یہ افسانہ پہلی بات تو وہی منکشف کرے گا جس کی جانب گذشتہ سطور میں اشارہ کیا گیا کہ خواجہ احمد عباس نے بھی خواجہ حالیؔ کی طرح اپنے معاشرے کے تن آسان و بے عمل اور کوتاہ بیں افراد کو ہدفِ تنقید بنایا ہے — افسانے میں چھپی دوسری بات: خواجہ احمد عباس نے، اپنے دور میں پیدا شدہ اس بے راہ روی کو بھی ہدف بنایا ہے جو سطحی رومانٹک فلموں کے باعث، معاشرے میں عام ہوئی ہے — بالکل ویسے ہی، جیسے اپنی مسدّس میں خواجہ حالیؔ نے ایک مخصوص طرزِ شاعری کو عفونت میں سنڈاس سے بدتر قرار دیا تھا۔

صحافت کی سادہ و راست بیانی میں ادبی رمزیت کو آمیز کرنے والے: خواجہ احمد عباس کا افسانہ "نیلی ساڑی"

برِ صغیر کے مسلم معاشرے میں رائج ایک ایسے تصور کو بھی، انتہائی فن کارانہ ڈھنگ سے، رد کرتا ہے جس کی بنا پر یہ معاشرہ، خود اپنے آپ میں نت نئی منافرتوں اور عصبیتوں کے زہر پالتا رہا ہے:

سلیمہ نے جب عدالت کو یہ بتایا تھا کہ محمود علی نے اُسے دو چار دن میں کوئی ترکیب نکالنے کی تسلی دی تو یہ بھی کہا تھا کہ تین دن بعد، بندو سقے کے ذریعے، اُسے محمود کا خط ملا۔

قبل ازیں، سلیمہ اپنے بیان میں بندو کا ذکر اُس موقع پر کر چکی ہے جب وہ سینما ہاؤس کے "باکس" میں محمود علی کی دست درازیوں سے لذت یاب ہو چکی تھی۔ سلیمہ نے بتایا:

"اگلے دن تو محمود بھائی علی گڑھ چلے گئے اور میں اُن کی یاد کو سینے سے لگائے اسکول چلی گئی۔ اسکول سے لوٹی تو دروازے پر ہی میں نے بُرقع اُتارا اور اندر گھس رہی تھی کہ بندو سقے سے مُڈ بھیڑ ہوگئی۔ وہ اندر سے خالی مشک کندھے پر لٹکائے باہر نکل رہا تھا اور میں اندر جا رہی تھی۔ ہم دونوں کا معانقہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ دو پل کے لیے ہم ایک دوسرے کے مقابل ٹھٹھک کر رہ گئے۔ میں نے دیکھا کہ سقے کا لونڈا مجھ سے ذرا ہی بڑا تھا اور جس کے ابھی مونچھیں بھی نہ نکلی تھیں، مُنہ پھاڑے میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ میں بھلا سقے کے لونڈے کو کب خاطر میں لانے لگی تھی۔ پھر بھی گھبراہٹ میں اُس کو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ پھر چونکی ہو کر اندر چلی گئی اور یہ واقعہ دوپہر کے سناٹے میں کھو یا رہا۔ کسی نے ہم کو دیکھا نہیں تھا لیکن نشۂ حُسن میں ڈوبی ہوئی میری خوشی کا کیا ٹھکانا کہ کل محمود بھائی جس صورت پر مرمٹے تھے، آج اس صورت کو دیکھ کر ایک سانولا سلونا سقے کا لونڈا گھن چکر ہو گیا تھا۔

سقے کے لونڈے کو میں کب مُنہ لگانے والی تھی مگر مجھے یہ اچھا لگتا تھا کہ میرے حُسن کے پُجاریوں میں ایک کا اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد جب بھی مجھے موقع ملتا میں کسی نہ کسی بہانے سے بندو کے سامنے آجاتی یا اُسے اپنی ایک جھلک دکھا کر فوراً پردہ کر لیتی جیسے غلطی سے سامنا ہو گیا ہو۔ وہ بے چارہ تو یہ امید ہی کبھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ معاملہ آگے بڑھے گا۔ ایک شریف زادی سے چھیڑ چھاڑ کی پاداش میں ابا اُسے مار مار کے ادھ موا نہ کر ڈالتے۔ مگر اس آنا کانی میں مجھے بڑا مزہ آتا۔ وہ مرے یا جیے مجھے کیا غرض؟"

سلیمہ نے، تیسری بار بندو کا ذکر تب کیا جب وہ "مسلم سوشل فلم کی ہیروئن" کی طرح گھر سے فرار ہوئی تھی:

"گلی کے موڑ پر پہنچی تھی کہ سامنے بندو دکھائی دیا۔ یہ کم بخت یہاں اس وقت کیا کر رہا تھا؟ پاس گئی تو دیکھا کہ وہ تو میرے راستے میں اڑا کھڑا ہے۔ "بی بی جی۔ آپ اس وقت کہاں جا رہی ہیں؟"

"تم کون ہوتے ہو مجھ سے سوال جواب کرنے والے؟"

"یہ سمجھ لیجیے کہ آپ کے خاندان کا نمک کھایا ہے۔ اُس نمک کا حق پورا کر رہا ہوں۔ بی بی جی واپس چلی جائیے۔"

میں بُرقع میں سے مُنہ نکالے دراتی ہوئی سیدھی چلی گئی۔ آخر وقت پر وہ راستے سے ہٹ

گیا— "بی بی جی ۔۔۔ مت ۔" وہ وہیں کھڑا تھا اس لیے اس کی آواز پوری نہ آئی۔
"بی بی جی ۔۔۔"
"بی بی ۔۔۔"

سلیمہ نے عدالت کو بہ تفصیل بتایا کہ اُسے جب محمود علی نہ آگرہ اسٹیشن پر ملا نہ علی گڑھ یونی ورسٹی کے ہوسٹل میں تو وہ اس پستہ قد آدمی کے ساتھ جو آگرہ سے ہی اس کا پیچھا کر رہا تھا، ہیروئن بننے کے لیے بمبئی آگئی۔ اس آدمی نے سلیمہ کو نیلی ساڑی سے پہچانا تھا کیونکہ محمود علی نے، دو سو روپے لے کر، یہ اطلاع دی تھی کہ گھر سے بھاگ کر آنے والی لڑکی اس ٹرین سے آئے گی اور یہ کپڑے پہنے ہوگی۔ پستہ قد آدمی اُسے میرین ڈرائیو کے ایک جنگلا بند فلیٹ میں لے گیا جو مس للیتا کماری کا قحبہ خانہ ثابت ہوا۔ سلیمہ کا تن بدن چھ سال اس کا تابع رہا۔ چھٹی کے ایک روز وہ جوہو جا نکلی۔ وہاں اس نے دیکھا کہ ایک شخص، پورے دن سر کے بل آدھا زمین میں گڑا رہنے کے بعد، آنکھوں میں سے ریت نکال رہا تھا۔

"۔۔۔ لوگ تالیاں بجا رہے تھے جیسے کھنا کھن گر رہے تھے اور میں مُنہ پھاڑے دیکھ رہی تھی جیسے سچ مچ کوئی مُردہ زندہ ہو گیا ہو اور میں ایک معجزہ دیکھ رہی ہوں کیونکہ میرے سامنے شکوہ آباد کا وہ سقے کا لونڈا کھڑا تھا۔ بندو۔

میں نے کہا: "بندو؟"

اس نے کہا: "جی بی بی جی۔"

"تم شکوہ آباد سے کب آئے؟"

"چھ سال ہو گئے۔"

"یہاں کہاں رہتا ہے؟"

اس نے کہا: "مہالکشمی کے پاس ایک جھونپڑ پٹی میں۔"

"مجھے وہاں لے جا سکتا ہے؟"

"بی بی جی—" اس کا منہ خوشی اور تعجب سے پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔

"تمھاری بی بی ساتھ رہتی ہے کیا؟"

"بی بی جی۔ میری شادی نہیں ہوئی۔"

"پھر تو ٹھیک ہے— میں تمھارے ساتھ رہ سکتی ہوں۔"

اس کا حال تو یہ تھا کہ شادی مرگ نہ ہو جائے۔

"چلیے بی بی جی۔"

"چلو۔"

۔۔۔ جھونپڑی میں ایک ٹوٹی پھوٹی کھٹیا تھی۔ میں اس پر ایسی سوئی جیسے دُنیا کی خبر نہ ہو۔ چھ سال کے بعد میں سچ مچ کی چھٹی منا رہی تھی۔

صبح کو میں نے دیکھا بندو جھونپڑی کے باہر سو رہا تھا۔
میں نے اُسے اُٹھایا۔
"۔۔۔مجھے تو بہت اچھی نیند آئی تم بھی اندر کیوں نہیں آ گئے؟"
"بی بی جی۔ اندر تو ایک ہی چار پائی تھی اور آپ اس پر ایسی تھکی ہاری سو رہی تھیں جیسے ایک بچہ سو رہا ہو۔"
"مجھے تو ساتھ سونے کی عادت ہے۔ تم ہی آ جاتے۔"
"بی بی جی!"
"نام بتاؤں دو چار کے؟" اور میں بتانے ہی لگی تھی مگر اس نے اتنی لجاجت سے "بی بی جی" کہا کہ میں چُپ رہ گئی۔
پھر وہ کہنے لگا: "قاضی جی جب نکاح پڑھ دیں گے تب ٹھیک ہے۔" (الخ)

سلیمہ کے بیان میں بندو کا یہ ذکر: چوتھا اور طویل ترین ہے۔ یہ طویل ترین غالباً اس باعث ہے کہ صنف افسانہ میں ایمائیت کا حسن پیدا کرنے والے خواجہ احمد عباس "نیلی ساڑی" کے بین السطور سے یہ بات قاری کے باطن میں پیوست کرنا چاہتے تھے؛ صحافت کے سادہ و راست لفظوں سے نہیں کہ ایک ستّے کا لونڈا بندو، بہ مقابلہ محمود علی خاں، شکوہ آباد سے بمبئی تک کس کس طرح: حقِ نمک، معاشرتی آداب اور انسانی قدروں کی پاس داری کرتا رہا۔

اس بھرے پُرے بین السطور میں، یہ رمز در رمز بھی خواجہ احمد عباس نے ہی خلق کیا ہے کہ بندو بھی، سلیمہ کی طرح، چھ سال سے بمبئی میں ہے اور اس نے تا حال شادی نہیں کی ہے — فن شناس افسانہ نگار نے یہ بات قاری پر چھوڑ دی ہے کہ وہ اس رمز کو پہنچ کر، خود فیصلہ کرے کہ نجیب و شریف کون ہے؟ — عظمت و احترام کا حق دار کون؟ — اور کراہت، ملامت اور حقارت کس کے حصے میں آنی چاہیے؟ — بندو ستّے جیسوں کے یا محمود علی خاں جیسوں کے؟"

■■

سید خالد قادری

فیودور دوستوئفسکی اور اُس کی تین اہم تخلیقات

فیودور دوستوئفسکی کو اس کے اولین ناول 'Poor Folk' کی 1845ء میں اشاعت کے ساتھ ہی خاصی شہرت حاصل ہوگئی تھی۔ اس وقت اس کی عمر صرف 24 سال تھی۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے یہ ایک سیاسی و معاشی مسائل پر توجہ مرکوز کرنے والی تصنیف تھی جسے مغرب میں پولیٹکل ناول کا نام دیا جاتا رہا ہے۔ مگر اس کے مصنف کے اپنے متنازعہ نظریات کے باعث اگلے تین چار برسوں کے اندر ہی نہ صرف اُس کا ادبی کیرئیر بلکہ اُس کی زندگی بھی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ یوں تو جوئے کی لت کے باعث مفلسی، قید و بند اور جلاوطنی وغیرہ ہمیشہ ہی اس کا مقدر رہے مگر اس مخصوص دور میں اُس کی زندگی جس قسم کے آزمائشی، غیر معمولی اور بھیانک تجربات سے گذری غالباً اُس کا بھی اُسکے مستقبل کا ایک بڑا ادیب بننے میں اہم رول رہا۔ 1849ء میں سینٹ پیٹرزبرگ کی خفیہ پولیس کو ایک انڈر گراونڈ سوشلسٹ سیل سے متعلق اطلاعات ملیں جو 'Petrashevsky group' کے نام سے تخریبی سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ زار نکولس اول نے اس گروپ کے ممبران کے لیے سخت ترین سزاء تجویز کی۔ چنانچہ دوستوئفسکی اور اس کے ساتھیوں کو گرفتاری کے بعد موت کی سزا سنائی گئی۔ / 22 دسمبر 1849ء کو جب اس کے بیس (۲۰) ساتھیوں کو سینٹ پیٹرزبرگ پلازا میں لا کر گولیوں سے اُڑایا جا رہا تھا دوستوئفسکی وہاں سب زیرو درجہ حرارت میں ٹھٹھرتا ہوا تقریباً ننگا کھڑا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر اس سے قبل کہ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے گولی ماری جاتی سزا دیے جانے کی یہ

کاروائی اچانک معطل کردی گئی۔ کچھ نامعلوم وجوہات کی بناء پر چند خاطیوں کے ساتھ نرمی برتی جاتی تھی۔ اب دوستوئفسکی کو چارسال سائیبریا کی جیل میں کاٹنے کے بعد اگلے چارسال وہیں فوج کی ملازمت کرنی تھی۔ اس موقع پر اس نے اپنے بھائی کو لکھا تھا۔

''موت سے آمنا سامنا ہونے پر بھی نہ ہی میں نے ہمت ہاری نہ ہی کسی قسم کی کوئی شکایت کی۔ زندگی جو ہر طرف ہے ہر جگہ ہے وہی زندگی ہمارے اندر بھی ہے''۔ کسی بھی عام انسان کو لرزہ براندام کردینے والا شاید اس کا یہی تجربہ تھا جو بعد میں Notes From the Underground میں اس کے راوی کے ذریعہ دوبارہ بیان کیا گیا ہے۔

" A man I met last year ----- was led out along with others on to a scaffold and had his sentence of death read out to him, for political affences. About twenty minutes later a repreive was read out and a milder punishment substituted ----- he was dying at 27, healthy and strong ------ he says that nothing was more terrible at that moment than the nagging thought: 'what - if I didn't have to die'!...... I would turn every minute into an age, nothing would be wasted, every munite would he accounted for."

اس کردار کے لیے جسے دوستوئفسکی کا ہمزاد کہا جاسکتا ہے موت کے منھ سے اچانک غیر متوقع طور پر باہر آجانے کے بعد زندگی اتنی بیش قیمت بن گئی کہ وہ اس کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرنا چاہتا تھا۔ خود دوستوئفسکی جیسے ایک Budding ادیب کے سلسلے میں بھی شاید اس سے زیادہ بھیانک مگر ساتھ ہی اس کی تخلیقیت کو جلا دینے والی کسی اور Apprentice ship کا تصور کرنا دشوار ہوگا۔

اگر دوستوئفسکی کا شمار ہم شیکپیر کی طرح ان ادیبوں میں کریں جنہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے دنیا و انسانیت سے متعلق ہماری فہم و ادراک میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے بلکہ یوں کہیں کہ اسے بدل کر رکھ دیا ہے تو اس کے قاری کے لیے اس ذہنی تبدیلی کی ابتدا 'Notes from the under- ground' سے ہی ہوجاتی ہے۔۔۔۔۔۔ اس کا مرکزی کردار ایک وجودی سوچ کا انسان ہے جسے بظاہر ایک انتہا درجے کا Cynic تصور کیا جائے گا۔ وہ نام نہاد مہذب سماج سے کٹا ہوا، یورپین کلچر و ثقافت کا منکر، اپنے آپ میں سمٹا اور ہر جانی مانی چیز کو رد کرنے والا غیض و غضب سے بھرا انسان ہے جو جرم و سزا کے از کار رفتہ قوانین سے ماورا ایک قسم کی دانشورانہ بغاوت سے اپنی منطق سے لیس ہے۔۔۔۔۔۔ دنیا بھر کے شعر و ادب میں ایسے outsiders ہمیشہ ہی قارئین کی ہمدردی کے مستحق اور ان کی خصوصی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ یہ ایسے اینٹی ہیروز ہیں جن کا وجود محرومی، اکیلے پن، خود اذیتی یا اپنے آپ کی تذلیل سے عبارت رہا ہے مگر قابل غور بات یہ ہے کہ یہی صورت حال خود ان کے لئے نارمل ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔ کیا یہ احتجاج و بغاوت یا غم و غصے کے باوجود کسی گہری نفسیاتی سطح پر ان کے لئے طمانیت بخش اور لذت آمیز بھی ہوتی ہے اس کا اندازہ ۱۹ویں صدی

کے فکشن کے قاری کو دوستوئفسکی کے Notes From the underground پڑھ کر ہی ہوسکا ہوگا جو یہ احساس دلاتی ہے کہ خود کو گرانے یا بے مصرف و ناکارہ بنا کر پیش کرنا بھی ایک موثر strategy ہوسکتی ہے جس کے ایک سے زیادہ نفسیاتی محرک ڈھونڈے جاسکتے ہیں جیسے کہ کسی مخصوص سماجی وثقافتی یا معاشی نظام کے پروردہ لوگوں کے وجود اور حکمتِ عملی یا اقتدار کو رد کرنے کے لیے ان کی ضد بن کر سامنے آنے کا شدید جذبہ یا ایسی صورت حال سے شدید مایوسی کے نتیجے میں احتجاج و بغاوت کے اظہار کے کسی طریقہ کار کے ایجاد کیے جانے ضرورت یا پھر ہمہ اقسام کی ناقابل قبول سماجی و اخلاقی ذمہ داریاں یا اصول وقواعد کی جکڑ سے آزادی کی طلب وغیرہ

یہاں دوستوئفسکی کا پروٹوگونسٹ ۱۹ویں صدی کے روس کے مخصوص تاریخی وتہذیبی پس منظر میں اپنے ملک کے ایسے انسانوں کا نمائندہ بن کر سامنے آتا ہے جو اپنی زندگی کے اہم ترین شعبوں میں مادہ پرست یورپ کی فکری وثقافتی برتری کو برداشت نہ کرسکتے تھے اور نتیجتاً غم وغصہ اور نفرت و بغاوت سے بھرے ہوئے تھے۔ مگر اس انڈر گراونڈ کی طرح ان کا بھی dilemma تھا کہ یورپین enlightenment کے بعد کی فضا میں تعلیم وتربیت کے حصول کے بعد یہ یورپین بن کر رہنے سے انکار اور اس کے فکر وفلسفہ یا ادب وثقافت سے بیگانگی کا اعلان ایک طرح سے خود اپنے آپ سے جنگ کرنے کے مترادف تھا۔ اس انڈر گراونڈ کی نفسیات یا اس کے وجود کی معنویت کو سمجھنے میں کچھ مدد مل سکتی ہے اگر ہم اس کے خالق کی زندگی کے ان دنوں کے حالات وتجرابات سے بھی کسی قدر واقف ہوسکیں جب اس نے اس کردار کی تخلیق کی تھی۔

اس سے تقریباً ایک سال پہلے 1863 میں اپنی بیوی کی شدید علالت کے صدمے اور اپنے رسالے ' "Time کو جاری رکھنے میں ناکامی کے ساتھ ساتھ سینٹ پیٹرزبرگ کی سیاسی وثقافتی فضا سے بیزاری نے دوستوئفسکی کو راہ فرار کے طور پر یورپ کے سفر پر مجبور کیا تھا۔ اس سفر کا ایک مزید مقصد پیرس میں اپنی محبوبہ Appolinaria suslova کی صحبت میں کچھ خوشگوار لمحات گذارنا بھی تھا۔۔۔۔ مگر بدقسمتی سے اس کی قماربازی کی لت اسے سیدھے پیرس نہ لے جاکر weisden لے گئی جہاں وہ اپنا زیادہ تر سرمایہ جوئے میں گنوا بیٹھا۔ قلاش ہوکر suslova کے پاس پیرس پہنچنے پر بھی اسے تغافل و بے اعتنائی کا سامنا تھا کہ اس نے اب تک ایک نیا ساتھی ڈھونڈ لیا تھا۔۔۔۔ خوشامد والتجا کے بعد بھی ٹھکرایا جانا، آہ وفریاد کا بے سود ہونا اور محرومی و بے بسی یا نفرت وذلت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آنا۔ دوستوئفسکی کے یہ حالات ایسے ہی تھے جیسے اس کی سابقہ ناولوں 'The Gambler ' اور "The Idiot" کے مرکزی کرداروں کے جن کی زندگیوں میں خود اپنی کمزوریوں کے علاوہ مغرور اور جفا پیشہ عورتیں بھی دکھوں کی سوغات لے کر آتی ہیں اور ان کی مردانہ انا کو اسطرح پاش پاش کردیتی ہیں کہ خود اپنی نظر میں ان کا وجود ناکارہ و بے وقعت ہوکر رہ جاتا ہے (اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان مخصوص کرداروں کی تخلیق سے قبل شاید ان کا خالق خود بھی اُس کرب سے گذر چکا تھا۔) روس واپس آنے پر دوستوئفسکی نے اپنی بیوی کو بستر مرگ پر پایا۔ اس درمیان اس کے بھائی Michail نے ایک دوسرے رسالے 'Epoch' کی اشاعت کے حقوق حاصل کرلیے تھے مگر خاصی جدوجہد کے باوجود وہ

اس سال مارچ میں اس کا صرف ایک ہی شمارہ نکال سکا جس میں دوستوئفسکی کے 'Notes From the underground' کے پہلے Version کو جگہ ملی روس کے کسی اخبار یا ادبی رسالے نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں شائع کیا۔

دراصل اس کا پہلا مسودہ ایک طویل انشائیے کا سا تھا جو Churnishevsky کی تصنیف بہ عنوان 'what's to Be done' کے جواب میں لکھا گیا تھا جو ایک سال قبل شائع ہوئی تھی اور جس کا روس کی نئی نسل کے نوجوانوں پر گہرا اثر ہوا تھا۔ Churnishevsky کا فکری حریف ہونے کے باعث دوستوئفسکی اس اثر کو زائل کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ یہ مسئلہ ایشیاء اور یورپ یا مشرق و مغرب کے ٹکراؤ سے زیادہ یورپین یا مغربی بنام مقامی و علاقائی سوچ ترجیحات اور ثقافت و کلچر سے متعلق تھا۔۔۔۔۔ ساتھ ہی یہ مزید پیچیدہ اس لیے تھا کہ خود دوستوئفسکی اور اس کے جیسے دوسرے ہم وطنوں کا ذہن اس پر بٹا ہوا تھا۔ وہ مغربی آزادروی سے متنفر اور وہاں کی مادیت پرستی کے منکر ہوتے ہوئے بھی ان کی عقلیت پسندی (Rationalism) اور علم دوستی کے قائل تھے کہ ان کی اپنی تربیت بھی ایسے ہی ذہنی رویوں کے زیر اثر ہوئی تھی۔ خود دوستوئفسکی نے بھی انجینئرنگ کی ٹریننگ حاصل کی تھی اور اس کے ذہن کے سانچے مغربی اور صرف مغربی تھے جس کا ثبوت اس کے آخری ایام کے معروف ترین ناول The Brothers Karamazove لکھے جانے کے دوران لیے گئے نوٹس میں ملتا ہے۔ یہاں اس نے اس بات پر پچھتاوا ظاہر کیا ہے کہ وہ اپنے ملک کا فکرو فلسفہ اور اس کی قدیم روایات و اقدار کے متعلق بہت کم جانتا ہے اور اس بات پر بھی جھنجھلاہٹ تھی کہ شخصی آزادی و انفرادیت (liberal individualism) اور انسانی حقوق وغیرہ سے متعلق اس کے اپنے خیالات بھی یورپین تعلیم کی ہی دین تھے۔ (اپنے یورپ کے سفر سے واپسی پر اپنے ہی جرنل 'Time' میں اس نے 'Winter Notes of Summer Impressions' کے عنوان سے جو مضمون شائع کیا تھا اس میں وہاں کی بورژوا مادیت، زر پرستی اور وسیع تر شخصی آزادی وغیرہ کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا تھا اور انہیں یورپین سوسائیٹی کے روبہ زوال ہونے کی نشانیاں قرار دیا تھا۔ یہاں تک کہ روس کی بہ نسبت اسے وہاں کے مذہبی رہنما بھی زر پرست اور مغرور لگے تھے)

ان باتوں کو ذہن میں رکھا جائے تو دوستوئفسکی کی معرکتہ الآرا تصنیف 'Notes from the underground' کی انفرادیت و معنویت کا راز جاننے کے لئے ہمیں اس تاریک space تک رسائی حاصل کرنی ہوگی جو اس کے عقلیت پسند ذہن اور برانگیختہ قلب کے درمیان ہمیشہ موجود رہا۔ اس کے بعد شاید اس کی دوسری اہم تخلیقات ' Crime And Punishment'، 'The Demons' اور The Brothers Karamazove کی تفہیم کے دروازے بھی قاری پر بہ آسانی سے کھل جائیں۔ قارئین کے ایک طبقے کا یہ خیال بھی پوری طرح غلط نہیں کہ دوستوئفسکی نے فکشن کو اپنی انفرادی سوچ اور آئیڈیولوجی کی تشریح و تبلیغ کا ذریعہ بنایا مگر یہاں یہ مقصد ان میں خلق کی گئی تصوراتی دنیا اور اس میں موجود کرداروں کے توسط سے

اس فنی مہارت سے پورا کیا گیا ہے کہ ان کی ادبی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ بلکہ اس زمانے اور سیاق و سباق کو ذہن میں رکھا جائے جس میں وہ وجود میں آئیں تو یہ تاثر بھی قائم ہوتا ہے کہ دوستوئفسکی کی تخلیقات نے روس اور یورپ کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے ادب میں نہ صرف نظریاتی فکشن (Ideological Novel) کے لیے جگہ بنائی بلکہ بحیثیت ایک صنف اسے وقار بھی بخشا۔

'Notes from the undrground' کا پہلا نصف حصہ جتنا ایک ناول کہا جا سکتا ہے اتنا ہی ایک طویل انشائیہ بھی۔ چنانچہ وہ اکثر الگ سے بھی شائع کیا جاتا رہا ہے۔ یہ سینٹ پیٹرزبرگ کے ایک چالیس سالہ انسان کا طنز و تضاد اور احتجاج و بغاوت سے پُر خود اپنے آپ سے یا پھر ایک تصوراتی سامع سے کیا گیا مکالمہ ہے۔ وہ اپنی ادنیٰ سی وراثت کے بل پر نہ صرف ملازمت ترک کر دیتا ہے بلکہ معاشرے اور سماج سے ربط ضبط بھی۔ نتیجتاً وہ خود ساختہ جلاوطنی کا شکار اور ایک Recluse بن کر جیتا ہے اور اپنے وجود کی اس صورت حال کو روپوشی یا underground ہونا کہتا ہے۔ دوستوئفسکی یہاں اپنے اس کردار کے توسط سے پہلی نظریاتی ضرب اس دور کے معروف و مقبول نظریہ ساز Chernishkevsky کے 'Reasonable egotism' کے تصور پر لگاتا ہے۔ Chernishkevsky انسان کو فطرتاً نیک قرار دیتا ہے جس کا ذہن سائنس اور عقل کی معاونت سے مزید معقول و روشن خیال بن سکتا ہے چنانچہ اگر وہ سماج کے بجائے اپنے ذاتی مقاصد کی تکمیل میں بھی لگا رہے تب بھی اس کی شراکت سے ایک صحتمند، تعقل پسند و آئیڈیل معاشرہ کا حصول ممکن ہے۔ انڈر گراونڈ اس نظریے کو گمراہ کن مانتا ہے۔ اس کا استدلال ہے کہ پوری طرح ہوش مند اور بھلے برے کا تصور رکھنے والے انسانوں کے سلسلے میں بھی یہ ضروری ہے کہ ان کے افعال میں ہمیشہ ان کی بھلائی ہی مضمر ہو۔ اس کے مطابق انسانی عقل کا استعمال پہلے سے طے شدہ اور یکساں نہ ہو کر متضاد اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ اس لیے وہ بہت کچھ ایسا بھی کرتا ہے جو نامناسب، نقصان دہ یا غیر متوقع ہوتا ہے۔ وہ مغربی نظام فکر کے موثر ترین ہتھیار Logic (اپنی بات کو پُر زور دلیلوں سے سچ ثابت کرنا) کو بھی بے اعتبار سمجھتا ہے کہ اس کے نزدیک دو اور دو ہمیشہ چار نہیں ہوتے۔

یہاں اس بات کی اتنی اہمیت نہیں کہ انڈر گراونڈ Chernishkevsky کے نظریات کی رد کے ذریعے یورپین فکر و فلسفہ کو کس طرح منہدم کرتا ہے جو ان دنوں روس کی نوجوان نسل کے دل و دماغ پر حاوی تھا۔ نوٹ کرنے کی بات یہ ہے دوستوئفسکی اپنے اس غیر روایتی اور نا بھلائے جا سکنے والے کردار کی تشکیل میں پوری طرح کامیاب ہے کہ وہ نہ صرف اس کے نظریات کا فطری و قابل یقین spokesman بن گیا ہے بلکہ اس کے مستقبل کے فکشن کے پروٹوگونسٹس کا اولین نمائندہ اور ان کے ذریعے سامنے لائی جانے والی سوچ کا پیش رو بھی۔۔۔۔ انسان کا خود اپنے مفاد کے منافی افعال پر مائل رہنا۔ درد و آزار سے لذت کا حصول، خود کی تذلیل میں راحت یا بظاہر نامناسب، متنازعہ یا غیر مروجہ سوچ یا طرز زندگی کا پُر زور دفاع۔۔۔۔ ایسے تمام ذہنی زاویے جو اس دور کے logical اور تعقل پسند مغربی ذہنوں کے لیے آسانی سے سمجھ میں آنے والے نہ تھے۔ انسان اور انسانی معاشرے سے متعلق دوستوئفسکی کی اس الگ اور یکسر غیر روایتی سوچ کو 'Notes

'From the underground کے دنوں سے ہی ایک واضح شکل ملنی شروع ہوگئی تھی۔ بے اطمینانی، مایوسی اور ناکامی نے اسے کامیاب، مغرور اور صاحب حیثیت یا سیاسی اور مذہبی طور سے با اقتدار لوگوں سے پہلے سے ہی متنفر کر رکھا تھا۔ ساتھ ہی اسے روس کے ایسے تعلیم یافتہ اور دانشور کہے جانے والے طبقے پر بھی غصہ تھا جو ثقافتی برتری کا دعوے دار تھا اور روس پر یورپ کو فوقیت دیتا تھا۔ مگر مغرب کا اس درجہ حریف ہونے کے باوجود وہ اس سے لڑ نہ سکتا تھا کہ وہ خود بھی اسی مغربی نظام تعلیم کا پروردہ تھا اور بحیثیت ادیب بھی ایک یورپین صنف ادب (فکشن۔ناول) کو برت رہا تھا۔ غالباً یہی اس کے اندر پل رہے غصے اور فرسٹریشن کی بنیادی وجہ تھی۔ چنانچہ Notes from the underground کی تصنیف کا محرک اس کے خالق کی ایک ایسی کہانی لکھنے کی شدید خواہش کہی جا سکتی ہے جو اپنے ہیرو کو شعور و لا شعور کے ان تمام احساسات و ارتعاشات سے گذار سکے اور جس کی تصوراتی کائنات اپنی معروضیت کے دامن میں اس کی تمام تر ذہنی کشمکش اور فکر و احساس کے تضادات سمیٹ لے۔ شاید اس محرک نے یہاں دوستوئفسکی کے تخیل کو ایسی جلا دی کہ وہ اپنی فکشنل کائنات کی تہوں میں اتر گیا اور انسان کے باطن میں پوشیدہ وہ باتیں ڈھونڈ لایا جو بظاہر پوری طرح متضاد اور آسانی سے نہ سمجھ میں آنے والی ہیں۔ اس کی یہ تصنیف ہمیں اس منطق کو قبول کرنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ انسان کے لئے پسپائی اور ذلت بھی نہ صرف گوارا بلکہ راحت افزا ہو سکتی ہے کہ ایسے میں وہ خود اپنی تذلیل کا سامان کرنے کی جانب مائل بر عمل ہو۔ اسے لگاؤ یا رغبت ہو سکتی ہے خود اپنے جسم کی غلاظت اور بدبو سے یا پھر اپنی کم مائیگی، ناکامی اور شکست کی تشہیر سے۔

دوستوئفسکی کے ناول 'Demons' کو مغربی نقادوں نے سیاسی ناول، کے زمرے میں اعلیٰ ترین مقام عطا کیا تھا۔ انسان کے باطن کی جیسی بصیرت افروز اور چونکا دینے والی تصویر اس ناول کا مصنف پیش کرتا ہے وہ شاید ہی کہیں اور دیکھی جا سکے۔ اس کی طاقت و اقتدار کے حصول کی طلب، دوسروں کو فریب دینے کے ساتھ ساتھ خود کو بھی بھلا وے میں رکھنے کی صلاحیت، نیتیں، علتیں، محبتیں اور نفرتیں یا پھر معاف کر دینے کا حوصلہ اور عقیدے کی بھوک۔ قاری کو یہاں جو بات متاثر کرتی ہے وہ مصنف کا یہاں ان سبھی کو ایک ہی قالب میں یکجا دیکھ سکتا ہے۔

دوستوئفسکی نے اس ناول کے تانے بانے 1869 میں بُننے شروع کیے تھے جب وہ ۴۸ سال کا تھا اور قرض داروں سے بچنے کی غرض سے یورپ (Florence and Dresden) میں رہ رہا تھا۔ اس وقت تک وہ The Idiot اور 'The Eternal Husband' شائع کر چکا تھا اور ''لامذہبیت۔ ایک عظیم گنہگار کی سرگذشت'' (Life of a great sinner-Etheism کے عنوان سے عقیدے اور الحاد کے موضوع پر ایک ناول لکھنے کی سوچ رہا تھا۔

مگر انہی دنوں روسی اخباروں میں Ivanov نامی ایک معروف اسٹوڈنٹ لیڈر کے اس کے ہی ساتھیوں کے ہاتھوں سنسنی خیز سیاسی قتل کی خبر نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی اور اس نے روس کے مغرب پسند ملحدوں اور انقلابیوں کے یوٹوپین آئیڈیلس کے پیچھے چھپی طاقت و اقتدار کی بے پناہ ہوس کو اپنی اگلی ناول کا

موضوع بنانا زیادہ ضروری سمجھا۔ چنانچہ اس دور کے روس کی سیاسی اُتھل پتھل کے شیطانی سرغنہ Nechaye کو اس نے 'Demons' میں Stephanovich verhovensky کے افسانوی کردار میں پیش کیا جو اپنے چار ساتھیوں Shigarelov' virginisky' Tolchenko اور lamshin کے ساتھ سیاسی سازش کر کے اپنے حریف تصور کیے جانے والے Shatov کا شہر کے پارک میں قتل کر کے اس کی لاش نہر میں پھینک دیتا ہے۔ دغا، فریب، سیاست اور قتل سے متعلق اس ناول کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے دوستوئفسکی ہمیں اس کے ذریعے صرف روس کے ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے انتہا پسندوں کی خونی سیاست کی ایک جھلک دکھانا چاہتا ہے۔ جس کی ابتداء ایک مثالی انسانی معاشرے کے حصول کے لیے اتحاد و انقلاب کے نعروں سے ہوتی ہے مگر لالچ، خود غرضی اور مفادات کے ٹکراؤ کے باعث یہی آگے چل کر دھوکے فریب، سازش اور قتل و خون کی اس راہ پر چل پڑتی ہے جو مطلق العنانیت یا آمریت پر ختم ہوتی ہے۔ اس ناول کی فضا کے تشدد اور خوف و دہشت سے پُر ہونے کے باوجود دوستوئفسکی کی مخصوص strategy بیانیہ اسے ایک ایسی دلچسپ کہانی بنا دیتی ہے جس میں قاری کا involvement کسی بھی اسٹیج پر کم نہیں ہوتا۔

'Demons' وہی ناول ہے جس میں دوستوئفسکی نے Turgeneu سے اپنی فکری و دانشورانہ رقابت کے اظہار کے لیے اس سے ملتا جلتا Karamazov کا کردار وضع کیا ہے جو دراصل Turgenev کا کیریکچر ہے جس سے وہ بیک وقت محبت اور نفرت دونوں کرتا تھا۔ (Turgenev حقیقی زندگی میں ایک ثروت مند زمیندار تھا جو ملحدوں اور یورپ کی مغربی سوچ رکھنے والوں کا طرفدار ہونے کے باعث روس کے مقامی کلچر و ثقافت کو کم وقعت گردانتا تھا چنانچہ اکثر دوستوئفسکی کی 'Demons' کو Turgenev کی ناول Fathers And Sons کا جواب تصور کیا جاتا ہے۔ ان باتوں سے قطع نظر دوستوئفسکی کے Demons کو اپنے دور کا ایک ایسا فکشنل بیانیہ کہا جاسکتا ہے جو مرکز سے دور یورپ کے ایک سرے پر بسنے والے ریڈیکل دانشوروں کے وہ خفیہ منصوبے اور شرمناک افعال سامنے لاتی ہے جن پر دبیز پردے ڈال کر رکھے گئے تھے۔ دوستوئفسکی کی 'The Brothers Karamazov' جیسی معرکتہ الآرا ناول کی شہرت بیرونی دنیا تک پہونچی جب Constance garnett کا کیا ہوا اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا۔ اس ناول نے نہ صرف اس دور کے قارئین کو جھنجھوڑ ڈالا بلکہ ان میں سے کئی کی زندگیاں بدل دیں۔ بقول ایک مغربی مبصر Borges کے۔

> "دوستوئفسکی کو پڑھ کر دریافت کرنا پہلی بار محبت ہونے کی مانند تھا یا سمندر کو پہلی بار دیکھنے کی طرح ۔۔۔۔۔ زندگی کے ایسے لمحات جنہیں نہ بھلائے جاسکنے والے کہا جائیگا۔"

کچھ دوسرے لوگوں کے نزدیک دوستوئفسکی کو پہلی بار پڑھنا اپنی معصومیت کے خاتمہ کی طرح تھا۔۔۔ آخر دوستوئفسکی کے فکشن سے قارئین کے مکالمے کی کیا نوعیت تھی کہ وہ ان کے لیے اس قدر موثر تھا؟ کیا وہ ایسا تھا جیسے کسی چیز پر قطعی اور آخر تک بھروسہ کرنا دشوار ہونے کے باوجود ہم خدا اور اس کے وجود پر اعتقاد کی اندرونی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟۔۔ یا یہ اس حقیقت کے اعتراف کی طرح تھا کہ ہمارے اندر ایک شیطان رہتا ہے

جو ہمارے اصول و عقائد کو رد کرنے کے درپے ہے؟۔ یا پھر یہ فکشن اس بات کو منکشف کرتا تھا کہ زندگی کی حقیقی مسرت کا انحصار جذبات کی شدت،، رشتوں کی گہرائی یا بلند سوچ اور اعلیٰ افکار پر نہیں بلکہ اس حلیمی اور خاکساری پر ہے۔جو غرور اور شان شوکت کے ہر تصور کی نفی کرتی ہے۔ یہ اس حیرت میں بھی مضمر ہو سکتا ہے جس میں دوستوفسکی ہمیں ڈال دیتا ہے فادر Karamazov کے جیتے جاگتے کردار کے ذریعے یہ ثابت کر کے انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو اپنی آہ و بکا میں بھی ہمیشہ سچا اور دیانت دار نہیں ہوتا بلکہ ان لمحات میں بھی کوئی نہ کوئی چال چل رہا ہوتا ہے۔ اور انسان یا انسانی زندگی سے متعلق وہ اپنا یہ سارا مشاہدہ، دانش مندی اور بصیرت ہم تک براہِ راست نہیں بلکہ اپنے فکشن کے ایسے کرداروں کے توسط سے پہونچاتا ہے جو پوری طرح حقیقی اور زندہ ہونے کا التباس پیدا کرتے ہیں۔ 'The Brothers Karamazov ' کی کہانی کا پلاٹ غیر معمولی طور پر پر درست چست اور کسا ہوا ہے جس کے بیانیہ میں کوئی جھول ڈھونڈ نکالنا دشوار ہے مگر باریکی سے اور باہم بنئے واقعات کے ساتھ چلتے چلتے ہم درمیان تک آجائیں تو ذہن و ادراک پر اثر انداز ہونے والا یہ انکشاف ہوتا ہے کہ یہ کہانی ایک ایسی دنیا کی ہے جو ابھی بھی ناقص و خام اور تکمیلیت کے مراحل میں ہے۔

ایک وہ فکشن نگار ہوتے ہیں جو دنیا کو مکمل اور بے نقص مان کر صرف اس کی اوپری سطح پر دکھائی دینے والے واقعات و مظاہر کے رنگا رنگ و دلپذیر بیانیہ پر ہی توجہ مرکوز رکھتے ہیں اور ان بنیادی اصولوں یا نظام کی کھوج میں دلچسپی نہیں رکھتے جن پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ دوسرے وہ ہوتے ہیں جو دنیا میں کچھ نہ کچھ کم پا کر اسے خام و نامکمل تصور کرتے ہیں۔ دوستوفسکی کا تعلق فکشن نگاروں کے اس دوسرے گروہ سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں اور اس کے کرداروں کے ذریعے اس دنیا کو پرت در پرت کھولنا چاہتا ہے تاکہ اس کی گہرائیوں میں اتر کر سچ اور جھوٹ کی پرکھ کر سکے، نیکی اور بدی کے معیار جان سکے، محبت اور نفرت اور عقیدے و الحاد کے محرکات سمجھ سکے۔ شاید یہی وجہ ہوگی کہ اس کی کہانیوں کے ایسے قاری جو کسی نہ کسی درجے میں مصنف کے تخلیقی تجربے کے حصے دار بن پاتے ہیں اس کی خلق کی گئی تصوراتی دنیا پر حاوی تشویش، خوف اور بے یقینی کی صورت حال کا نہ صرف احساس کر سکتے ہیں بلکہ اس کے لئے خود کو اور اپنے جیسے دوسرے لوگوں کو بھی ذمہ دار ماننے لگتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ان کا ان کہانیوں سے مکالمہ دنیا اور معاشرے کے حوالے سے خود اپنی ذات سے مکالمے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہاں اُسے کئی اہم اور بنیادی سوالوں کا سامنا ہو سکتا ہے ۔۔۔۔ یقین یا اعتقاد کی کیا حد ہو سکتی ہے؟ خدا اور مذہب پر عقیدہ ہمیں کس سمت اور کتنی دور لے جا سکتا ہے؟ کسی نظریے یا عقیدے پر مضبوطی سے قائم رہنے سے کیا صورت حال پیدا ہوتی ہے؟ یا انسان کے فکری و روحانی رویوں کا اس کے روز مرہ یا سماجی زندگی میں کس حد تک دخل جائز ہے؟ ۔۔ دوستوفسکی کا بحیثیت ایک تخلیق کار انسانی وجود سے جڑے ایسے پیچیدہ سوالوں سے مسلسل اور گہرا سروکار رہا ہے۔ اور غالباً The Brothers Karamazov میں اس نے ان سوالات کے جوابات مزید تندہی سے تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ ناول ایک بڑی فکشنل تخلیق ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی و انسانی معاشرے سے متعلق ایک

بنیادی Text یا اہم نصابی کتاب بھی کہا جاسکتی جسے ایسے لوگوں کو ضرور پڑھنا چاہیے جو معصوم یا Naive ہونے کے سبب ان دونوں کو اپنے آپ میں مکمل یا مثالی خیال کرتے ہیں۔ یہ ناول پوری طرح کامیاب ہے عکاسی کرنے میں انسان کی پوشیدہ خواہشات کی اس کی حرص وہوس کی اس کے دکھ اور کرب کی اور اُس کے احساس جُرم کی جو خصوصاً اس ناول کی کہانی میں Patricide (بیٹے کے ذریعے باپ کا قتل) کے motive کے درآنے سے پیدا ہوا ہے اور اس پوری ناول میں لہو کی ایک گہری سُرخ لکیر بن کر پھیلا ہوا ہے۔ شاید یہی وجہ ہوگی کہ فرائیڈ نے دوستوئفسکی پر لکھے اپنے مشہور مضمون میں The Brothers Karamazov کو نشان زد کرتے ہوئے اُسے Sophocles ایڈی پس اور شیکسپیر کے ہملیٹ کے ساتھ شامل کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جو موضوع یا movtive ان تینوں بڑی ادبی تخلیقات میں مشترک ہے اور انہیں سنسنی خیز بناتا ہے وہ patricide کا ہے۔ نیز یہ کہ اس ناول میں روس کے سادہ دل عوام کی روایات واقدار اور رسوم وعقائد کو جس فنی مہارت کے ساتھ یورپ کی جدید ترقی یافتہ دنیا کی بدلی ہوئی ترجیحات جیسے کہ تجارتی مسابقت وسرمایہ کاری، جنگ جوئی واقتدار کی کشمکش اور انحراف وبغاوت کے بمقابل پیش کیا گیا ہے اس کا ذکر بھی نقادوں نے تحسین آمیز الفاظ میں کیا ہے۔۔۔۔۔ان میں سے اکثر کا خیال ہے کہ افکار ونظریات کے حوالے سے دوستوئفسکی کے 'The Idiot' کو اس کے اس ناول کا پیش رو مانا جانا چاہیے۔۔۔۔۔۔۔ یہاں فادر karamazov کا کردار بھی اس امر کا روشن ثبوت بن کر سامنے آتا ہے کہ ایک بڑے تخلیق کار کی وسیع تر انسانی ہمدردیاں اس کے خلق کیے گئے بظاہر Villainous کرداروں کو بھی مکمل villain یا پوری طرح غیر انسانی نہیں بننے دیتیں۔۔۔ چنانچہ قاری کے لئے تمام تر منفی صفات کے باوجود فادر karamazov سے نفرت کرنا ضروری نہیں۔ اس کے اُجڈ طور طریقے، جھوٹ اور فریب یا عیش پسندی۔۔۔۔۔ ان سب سے واقف ہو جانے باوجود اسے یہ کردار اپنے آس پاس کی جیتی جاگتی حقیقی دنیا سے ہی اٹھایا گیا لگتا ہے۔

ایسا سمجھا جانا بھی شاید غلط نہیں کہ زیادہ تر بڑے تخلیق کار اپنی تحریروں میں خود اپنے نظریات وعقائد سے بر سرِ پیکار نظر آتے ہیں۔۔۔۔ یا یوں کہا جائے کہ وہ غیر ارادی طور پر ہی سہی اسے ایسے سنجیدہ مباحث کا موضوع بناتے ہیں کہ یہ التباس ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی ہی سوچ پر سوالات قائم کر رہے ہیں۔ اسے Ideological dispersal کی غرض سے مصنف کے ذریعے اختیار کی گئی بیانیہ strategy کا ایک اہم حصہ بھی مانا جاسکتا ہے۔ دوستوئفسکی کے بھی کرداروں کی ذہنی کشمکش فکری تضادات اور روحانی کرب کی قاری تک ترسیل اسی فنی Device کے ذریعے اتنے موثر انداز سے ہو سکی ہے۔

کردار نگاری کے ضمن میں بھی مغربی فکشن نگاروں میں شاید ہی کوئی دوستوئفسکی کا حریف بن سکے۔۔۔۔۔ منفرد اور متنوع کرداروں کی اتنی کثیر تعداد۔۔۔۔۔ جیتے جاگتے زندہ اور اپنے ہمہ جہت وجود پر اصرار کرتے ہوئے۔۔۔ برٹش وکٹورین ناولسٹ چارلس ڈکنس بھی اپنے ناقابل فراموش کرداروں کے لیے جانا جاتا ہے اور ان کی تعداد بھی قابل لحاظ ہے مگر اس کے بیشتر کردار اپنی شخصیت کے کسی ایک مخصوص اور دلچسپ پہلو یا اس

سماجی صورت حال کے لیے ہی یاد رکھے جاتے ہیں جوان پر اثر انداز ہوئی۔ دوستوئفسکی کے کردار اپنے تمام تر ہمہ جہت وجود کے ساتھ ہمیں Haunt کرتے ہیں اور ہم انہیں شدت سے پسند ناپسند یا رد کرتے ہیں، انسانی سطح پر ان سے قربت، یگانگت یا بیگانگی محسوس کرتے ہیں اور ان کے موقف سے مباحثے کی ضرورت کے طور پر ایک ذہنی و جذباتی مکالمہ قائم کر لیتے ہیں۔۔۔۔۔۔ Alyosha کی سادہ دلی اور دوسروں تک پہونچنے کی پُر خلوص کوشش۔۔۔ نیکی اور صدق دلی۔۔۔۔۔۔ خود غرضی، جھوٹ اور فریب کے بیچ کتنا مشکل تھا ویسا انسان بن کر جینا۔۔۔۔۔ Ivan۔۔۔۔۔۔ تھیوری، فلسفہ اور کتابوں کا مارا۔۔۔۔۔ ایسے تمام مڈل کلاس egoistic نوجوانوں کی طرح جو اپنے اندر کے روایتی و اخلاقیات پسند انسان کو کتابوں میں دفن کر دیتے ہیں اور اپنے آئیڈیلس کی جستجو میں کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں ایک غیر روایتی ہیرو کہے جانے کے قابل Dinictri جو اپنے باپ (Father karamazov) کی ہی طرح عیار اور عیش پسند ہے اور ایک عورت کی خاطر اس کا حریف بھی بن سکتا ہے۔۔۔ (اور شاید انہی منفی خصوصیات کے باعث اس کا کردار اپنے دوسرے بھائیوں سے زیادہ جیتا جاگتا اور حقیقی معلوم ہوتا ہے) اور پھر سوتیلا بھائی اور خاندانی ملازم Smerdykov۔۔۔۔۔۔ بزرگوں کے ناجائز تعلقات کی یادگار۔۔۔۔۔۔ سازش، ناانصافی اور قتل و خون کا محرک۔۔۔۔۔۔ کہانی کے آغاز میں ایک ضمنی کردار۔۔۔۔۔۔ انجام تک پہونچتے پہونچتے سب پر حاوی۔۔۔۔۔۔۔۔ ایک قصباتی کنبے کی داستان The Brothers karamazov لکھنے کے دوران خود دوستوئفسکی کا ذہن ایسے تمام سماجی سیاسی اور ثقافتی مسائل سے برسر پیکار تھا جو اُسے آخر تک پریشان کرتے رہے۔۔۔۔۔۔ اب تک اسے Tolstoy کے ساتھ روس کے سب سے بڑے ناول نگار کا درجہ حاصل ہو چکا تھا اور یہ اس کے آخری ایام تھے۔ ان دنوں وہ "The Diary of a writer" نامی ایک معروف جریدہ بھی شائع کر رہا تھا جس میں سیاست ثقافت اور آرٹ اور ادب پر معیاری مضامین شائع ہوتے تھے۔ مگر پھر حالات تیزی سے بدلے اور زندگی کے ۷۰ ویں سال میں وہ اپنی آخری بڑی تخلیق The Brothers karamazov اور اپنے جریدے کا آخری شمارہ اپنی بیوی کے تعاون سے بمشکل شائع کر سکا جس کے ایک برس کے اندر ہی اُسے جگر کے جان لیوا مرض نے آلیا۔ دوستوئفسکی کے لیے اس کے یہ آخری ایام غیر معمولی طور پر آزمائشی اور صبر آزما تھے۔

گو کہ نوجوانی میں وہ بائیں بازو کی طرف جھکاؤ رکھنے والا مغربی طرز کا لبرل انشور تھا لیکن اپنے آخری دنوں میں Pan- slavinism کی علاقائی تحریک سے وہ اس حد تک وابستہ ہو چکا تھا کہ زارِ روس کی طرفداری میں بھی اسے کوئی قباحت محسوس نہ ہوتی تھی۔ (زار نے 1861 میں صدیوں سے زمینداروں کے آہنی شکنجے میں جکڑے بیگار مزدوروں کی آزادی کا اعلان کیا تھا جس کا دوستوئفسکی برسوں سے خواب دیکھتا آیا تھا جب کہ اس سے قبل 1849 میں اس نے خود دوستوئفسکی کی موت کی سزا کو صرف چند گھنٹوں پہلے منسوخ کر دیا تھا)

دوستوئفسکی کو روس اور عالمی فکشن کا Gaint کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ اس کی نصف سے زیادہ زندگی فکشن

کی تخلیق میں گذری جس کا ثمر تقریباً دس ناول ،بیس ناولٹ کہانیاں ، ڈائریاں اور جرنلس وغیرہ ہیں۔کسی بھی بڑے ادیب کی طرح اس کے بھی دانشورانہ تشخص کو اس کے ادبی تشخص سے الگ کر کے دیکھنا ممکن نہیں کہ یہ ایک دوسرے میں ضم ہو چکے ہیں۔اس کا ادبی کیریر معجزات کی ایک کڑی لگتی ہے جس کا آخری کرشمہ The Brothers Karamazov مانا جانا چاہیے۔۔۔۔۔۔کہ کوئی اور فکشنل بیانیہ شاید ایسا نہ مل سکے جو ایک معتبر قاری کو اس حد تک اپنی گرفت میں لے لینے کی قدرت رکھتا ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اختتاماً اس طنز آمیز حقیقت کا ذکر بھی ناگزیر ہے کہ آرکیسٹرل میوزک کی طرح یورپ اپنی ناول نگاری کی عظیم روایت پر بھی نازاں رہا ہے اور دوستوفسکی زندگی بھر اسی سے استفادہ کرتا رہا مگر پھر بھی وہ یورپ اور مغرب سے اسی قدر متنفر رہا جتنا دورِ جدید کے مغربی علوم سے مستفید ہوئے اسلامی نظریہ ساز۔۔۔۔۔۔۔

■■

مضمون

ارجمند آرا

سامراجی عہد کا اردو ادب میں حاشیے کی عورت

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے پدرشاہی سماج (Patrialchal Society) میں زندگی کے ہر شعبے میں عورتوں نے حاشیے پر ہی زندگی گزاری ہے۔ یہ بات دنیا کے ہر علاقے اور ہر زمانے پر نافذ ہوتی ہے۔ اردو لسانی گروہ، جس کی پیدائش اور نشوونما کا دور شمالی ہندوستان کا بادشاہی اور جاگیرداری دور رہے، اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس دور میں اول تو عورتوں نے اردو میں کم ہی لکھا، لیکن جنھوں نے لکھا انھیں نظرانداز کیا گیا۔ زندگی کے ہر شعبے میں عورتوں کی محرومیاں ادب کے وسیلے سے بھی پہچانی جا سکتی ہے۔ لیکن ان کے حالات میں اصلاح اور تبدیلی کی تحریکیں انیسویں صدی کے اواخر میں کولونیل دور میں شروع ہوئیں۔ اس تحریر میں اسی سامراجی دور میں اردو سماج اور ادب میں عورتوں کی صورتِ حال کا جائزہ لیا گیا ہے۔

☆

1857 کی جدوجہد آزادی کو ہندوستان میں پھیلتے ہوئے برٹش سامراج کے خلاف لڑی گئی پہلی نہیں بلکہ تیسری اور آخری جدوجہد کہہ سکتے ہیں جس میں ہم ناکام ہوئے۔ اس جنگ میں ہماری ناکامی کے ساتھ ہی سامراج کا پھیلاؤ مکمل ہوا اور ملک کا سارا انتظام و انصرام کمپنی کے ہاتھ سے نکل کر تاج برطانیہ کے ہاتھ میں چلا گیا۔ پہلی جنگ اس سے سو سال پہلے 1757 میں بنگال میں سراج الدولہ نے لڑی اور ہار گئے۔ دوسری جنگ میں 4 مئی 1799 کو میسور کے ٹیپو سلطان نے شکست کھائی، اور اس طرح ہندوستان کے ہاتھ سے شمال مشرق اور دکن، دونوں سرے جاتے رہے۔ رہ گئی ہندوستان کی وحدت کی علامت، ملک کا مرکز — دہلی۔ سو وہ

ہم 1857 میں ہار بیٹھے۔

1857 کے حوالے سے میں ایک ضمنی بات اور بھی کہنا چاہتی ہوں۔ وہ یہ کہ شمالی ہندوستان میں، خصوصاً دِلی اور اودھ میں بیٹھے ہوئے لوگ، خود کو مرکز میں رکھ کر دیکھنے کے اس قدر عادی رہے ہیں کہ وسیع و عریض ہندوستان کی تاریخ کو سمیٹ کر شمال سے شروع کر کے شمال ہی پر ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ شاید اسی لیے 1857 سے پہلے کی جنگیں ہمیں آزادی کی جنگیں محسوس نہیں ہوتیں۔ خیر اس ضمنی بات کو یہیں چھوڑتی ہوں۔

دلی کا ہاتھ سے جاتے رہنا صرف علامتی شکست تھا کیونکہ انگریز تو میسور جیتنے کے بعد ہی اپنی فتح کا اعلان کر چکے تھے، اور انھیں اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اب پورا ہندوستان ان کا ہے۔ جب 10 جولائی 1800 کو فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی گئی (جس کا مقصد واضح طور پر انگریز افسران کو مقامی زبانیں سکھانا اور ان میں کتابیں تیار کرانا تھا) تو لارڈ ویلزلی نے خصوصی حکم جاری کر کے اس کی تاسیس کی تاریخ بدل کر 4 مئی کرا دی — وہ دن جب ٹیپو سلطان کی شکست ہوئی[1]۔ گویا میسور پر فتح کی پہلی سال گرہ کلکتہ میں کالج قائم کر کے منائی گئی۔ ایک طرح سے یہ کلکتے سے میسور تک حکمرانی کا بھی اعلان تھا۔ چند ہی برس کے بعد 1805 میں گورنر جنرل لارڈ ویلزلی نے دلی کے بادشاہ، شاہ عالم کو خط لکھ دیا کہ، اے حضورِ والا تبار! خاندانِ تیموریہ کے بزرگ شہنشاہ! آپ کی مفلسی اور شکستہ حالی ہم سے نہیں دیکھی جاتی۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ بقیہ زندگی آرام اور آسائش سے گزاریں۔ اس لیے اے شہنشاہِ فلک پناہ! بارگاہِ شاہ عالم کے آئندہ گزارے کے لیے، ہم ساٹھ ہزار روپے مہینہ اور خاندانِ شاہی کی پرورش کے لیے دس ہزار روپے مہینہ مقرر کرتے ہیں۔[2]

چنانچہ 'از دلی تا پالم' حکمرانی رکھنے والا بوڑھا بادشاہ شاہ عالم ذلت کا ایک اور طوق گلے میں ڈال، انگریزوں کا وظیفہ خوار ہو گیا۔ مالگزاری کے سارے حقوق کمپنی کو ملے ہوئے تھے، اب بادشاہ بھی ان کا نمک خوار ہو گیا لیکن اس علامتی بادشاہ کو بٹھائے رکھنے میں انگریزوں کو سہولت تھی۔ چنانچہ کمپنی ڈھاکہ اور مرشد آباد سمیت سارے ملک کی صنعتیں اور دستکاریاں تباہ کر کے، دولت سمیٹ کر انگلینڈ بھیجتی رہی اور وہاں صنعتی انقلاب کامیابی سے ہم کنار ہوتا رہا۔ اس طرح اگلے پچاس برس بھی کھنچ گئے۔ لیکن برا ہو میرٹھ کے ان مٹھی بھر باغی سپاہیوں کا جنھوں نے دہلی میں داخل ہو، لال قلعے کو اپنا جنگی مورچہ بنایا اور شاعر بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو اپنا سالار بنا کر مہینوں تک انگریزوں کو ناکوں چنے چبوائے۔ انگریزوں کے خلاف اس جدوجہد کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے ملک بھر کی ریاستیں، راجے رجواڑے اور زمیندار بھی متحد ہو کر میدان میں اتر آئے، عوام و خواص سبھی شامل ہوئے، پھر بھی اس قلعے کو نہ بچا سکے۔ لیکن اس جنگ نے حکومتِ برطانیہ کو احساس کرا دیا کہ اسے اس ملک باگ ڈور اب اپنے ہاتھ میں لے لینی چاہیے۔ چنانچہ بوڑھے بادشاہ کو چھکڑے پر بٹھا رنگون روانہ کیا اور اس کے بچے کھچے اہلِ خانہ اور وفاداروں کو ٹھکانے لگا دیا۔ اور یہ لیجیے جناب! کہانی ختم۔ مغل حکومت کا باقاعدہ، رسمی طور پر خاتمہ ہو گیا۔

بادشاہت کے ساتھ ان کا جاگیرداری نظام بھی گیا۔ عام آدمی کی زندگی پر اس سے کیا فرق پڑنے والا تھا— لیکن یہ کیا؟ انگریز بہت سے نئے قانون، نئے انتظامات، نئی اصلاحیں اور نئی تعلیم لانے لگے۔ انھیں اپنے انداز سے ملک چلانا تھا، دیسی کلرک اور تعلیم یافتہ ملازم بھرتی کرنے تھے۔ انھوں نے تعلیم کو عام

کردیا۔ مغربی طور طریقوں اور رہن سہن کے ساتھ عقل پرستی نئی نسلوں کو متاثر کرنے لگی۔ نئی تعلیم اپنے ساتھ جمہوریت، انصاف اور مساوات کے اس تصور کو بھی فروغ دینے لگی جس کے چرچے انقلاب فرانس کے بعد یوروپ میں عام تھے۔ چنانچہ دیکھتے دیکھتے ہزاروں برس پرانے سماجی نظام میں دراریں پڑنے لگیں، گھریلو سنسکار اور روایتیں ٹوٹنے لگیں، اور ذات پات کا نظام بھی زد میں آنے لگا۔ برہمن اور کایستھ کے ساتھ، سید اور قاضی کے ساتھ، کیا اب چھوٹی ذات والے بھی پڑھنے کو آزاد ہوں گے؟ مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھ کر بڑے افسر بنیں گے؟ مغربی تہذیب کے برے اثرات کے ساتھ ساتھ یہ سوال بھی اعلیٰ ذات والے مقتدر طبقے کو پریشان کرنے لگے تھے۔ چنانچہ ہر قوم کے لوگوں میں گرتے ہوئے سماجی ڈھانچے کو بچانے کا نیا جوش پیدا ہوگیا۔ مسلمانوں میں سرسید پہلے بڑے رہنما تھے جنھیں خیال آیا کہ جائیدادوں سے محروم، سہولت پسند، بے روزگار اور بے ہنر شریف زادوں کو اگر نئی تعلیم دلا کر نوکریوں میں بھرتی نہ کرایا گیا تو مسلمانوں کے پورے معاشرتی نظام کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ چنانچہ سرسید نے اشرافیہ طبقے اور اس کی زوال آمادہ تہذیب کو بچالینے کی بھرپور کوشش کی اور علی گڑھ میں 1775 میں وہ مضبوط تعلیمی ادارہ قائم کیا جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنا۔ نئی تعلیم، نئی سوچ، نئے امکانات کھل رہے تھے لیکن اس کا بھی خیال تھا کہ ہمارا طرزِ فکر روایتی اور مشرقی ہی رہے۔ اسی لیے سرسید اور ان کی تحریک کے 'روشن خیال' دانش وروں کے نزدیک سماج کا صرف ایک ہی طبقہ ایسا تھا جس کی اصلاح کو انھوں نے اہم سمجھا، بلکہ اس طبقے کے بھی صرف مردوں کی اصلاح کو۔ عورتوں، غریبوں اور نیچی ذات کے لوگوں، مثلاً کسانوں اور دستکاروں کی تعلیم کا سوال ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ عورتوں اور نیچی ذات والوں کے تعلق سے یا تو وہ خاموش رہے یا پھر ان کی تعلیم کے خلاف دلائل پیش کیے۔ مثلاً جب کانگریس نے یہ مانگ کی کہ متعہد عہدوں (Covenanted Posts) کے مقابلہ جاتی امتحانات جو صرف انگلینڈ میں منعقد ہوتے تھے، ہندستان میں بھی منعقد کرائے جائیں، تو سرسید نے اس کی مخالفت کی۔ وجہ یہ بتائی کہ چونکہ ہندوستان میں امتحان کرانے سے نچلی ذاتوں اور طبقوں کے لوگ بھی ان اعلا عہدوں پر منتخب ہو سکتے ہیں، اس لیے ان کا تقرر "ہندستان کی شریف قوموں" کو ناگوار گزرے گا۔[۳]

سرسید جدید تعلیم کے حامی اور روشن خیال رہنما تھے لیکن عورتوں کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ عورتوں کو جدید تعلیم دینا 'نامبارک' بات ہے۔ وہ یہ مانتے تھے کہ اگر سماج میں مردوں کے حالات درست ہوجائیں تو عورتوں کی حالت ازخود درست ہوجائے گی۔ لیکن سرسید کا یہ رویہ ان کی اپنی تنگ نظری سے زیادہ زمانے کے چلن کو سامنے رکھ کر طے ہوا تھا۔ ان کے ذہن پر مسلمانوں کے ایک مخصوص فرقے کے مفادات حاوی تھے جن کی وجہ سے وہ سماج کے اس طبقے کی مخالفت مول لینا نہیں چاہتے تھے جو جہالت، غربت اور تنگ نظری میں پوری طرح غرق تھا۔ اپنی کتاب 'اسباب بغاوتِ ہند' میں سرسید 1857 کی بغاوت کی بہت سی وجہوں میں ایک وجہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ "سب یقین سے جانتے تھے کہ سرکار کا مطلب یہ ہے کہ لڑکیاں اسکول میں آئیں اور نئی تعلیم پائیں اور بے پردہ ہوجائیں۔ یہ بات حد سے زیادہ ہندوستانیوں کو ناگوار تھی۔"[۴]

دوسری قومیں تہذیبی، مذہبی اور لسانی گروہ —— بھی ایسی ہی تبدیلیوں اور اتھل پتھل سے دوچار

تھیں، بہت سی اصلاحی تحریکیں چل رہی تھیں جو بنگال اور نام نہاد 'ہندی چھیتر' میں نو جاگرن اور پنر جاگرن کا باعث بنیں۔ ان کا تجزیہ بے شک بہت سے مثبت اور منفی پہلوؤں کو اجاگر کرے گا لیکن میں اپنی بات مسلمانوں، ان کی تہذیب اور ان تحریروں اور تحریکوں تک محدود رکھوں گی جنھوں نے ان بدلتے ہوئے حالات کو اردو ادب کا حصہ بنایا۔ خیر، انگریزوں کی پالیسیوں اور نئی تعلیم کا براہِ راست نتیجہ ذات پات کے قدیم نظام کو چیلنج کرتا محسوس ہوا اور ساتھ ہی اُس معاشرے کی بنیاد یعنی گھر خاندان کے روایتی تصور پر ضرب پڑی جو عورت پر ظلم کر کے، اس کو جسمانی طور پر محصور اور ذہنی طور پر معذور کر کے کھڑا کیا گیا تھا، اور یہ ظلم پردے اور عزلت نشینی کی صورت میں خود ایک ادارہ بن چکا تھا۔ عورتوں کی تعلیم کے لیے کھلنے والے کالج ان کو صرف تعلیم یافتہ نہیں بنا رہے تھے بلکہ ان کی طرزِ زندگی کو متاثر کر رہے تھے۔ چنانچہ اس کی پہلی براہِ راست چوٹ پردے کے نظام پر پڑی تھی۔ بھلا وہ سماج جس کی ساری عزت وغیرت عورت کو چہار دیواری کے اندر، زنان خانے کے سات پردوں میں چھپائے رکھنے پر منحصر تھی، یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ شریف گھرانوں کی بیبیاں کالج جائیں، اور وہ بھی ایسے کالج جہاں چھوٹی ذاتوں کی عورتیں بھی داخلہ لے سکتی ہیں۔ جبکہ ہندو مسلمان سبھی شرفا کے ہاں پردے کا یہ حال تھا کہ یہ شریف زادیاں بے پردہ رہنے والی چھوٹی ذات کی عورتوں اور طوائفوں سے بھی پردہ کیا کرتی تھیں۔ ایک زمیندار گھرانے کی خاتون رشیندری دیوی اپنی بانگلہ خود نوشت 'امار جیون' (جو انھوں نے بیوہ ہونے کے بعد ساٹھ برس کی عمر میں 1868 لکھی تھی، بعد میں ان کے بیٹے نے 1886 میں چھپوائی) میں لکھتی ہیں کہ وہ رسوئی میں بھی لمبا گھونگھٹ کاڑھ کر رہتی، دھیمی آواز میں باتیں کرتیں کیونکہ آواز کا بھی پردہ ہوتا تھا، یہاں تک کہ وہ اپنے سوامی کے گھوڑے تک سے پردہ کرتی تھیں۔[5] مسلم عورتوں میں بھی پردے کا اتنا ہی سخت رواج تھا۔ اگر یہ پردہ نشین خواتین کالج جاتیں تو گھر خاندان کا کیا ہوتا جس کی حفاظت کے لیے سیکڑوں سال سے عورت پر یہ پہرے بٹھائے گئے تھے؟ چنانچہ سرسید اور دوسرے مسلم رہنماؤں نے عورتوں کی انگریزی تعلیم کی سخت مخالفت کی۔ سرسید کے رفیق نواب وقار الملک نے زنانہ اسکولوں کے بارے میں کہا، "میری رائے ان مدارس کی نسبت یہ ہے کہ اشراف خاندانوں کی لڑکیوں کا اپنی موجودہ حالت میں رہنا، ان مدارس کے ذریعے تعلیم وتربیت پانے سے لاکھوں درجہ بہتر ہے۔"[6]

لیکن نئی تعلیم سے مفر بھی نہیں تھا۔ اگر نئے قانون اور نئی پالیسیوں نے عورتوں کے ذہنوں کو متاثر کر لیا، روشنی کی کرن ان تک پہنچ گئی اور وہ بغاوت پر آمادہ ہو گئیں تو کیا ہوگا؟ اس سے پہلے کہ مغربی تہذیب اور قدریں ہمارے روایتی مشرقی سماج اور اس کے اقداری نظام کو کھا جائیں، اس سے پہلے کہ سارا سماجی اور اخلاقی نظام چرمرا کر ڈھے جائے، ضروری ہے کہ خاندان کے اس ڈھانچے کو برقرار رکھنے والے سب سے اہم رکن یعنی عورت کے حالات میں اصلاح کی جائے اور اسے اس درگت اور زبوں حالی سے نکالا جائے جس میں وہ اب تک بسر کر رہی تھی۔ جب ہم خود ہی نئے تقاضوں کو ایک حد تک قبول کر لیں گے تو تبدیلی بھی آجائے گی اور مشرقی تہذیب بھی بچی رہ جائے گی۔ چنانچہ ایک طرف تو سرسید تھے جو نئی تعلیم، سائنسی طرزِ فکر، آسان اردو میں سائنسی کتابوں کے ترجموں اور تالیفات کی تحریک چلا رہے تھے لیکن عورتوں کی تعلیم کے خلاف تھے، اور دوسری

طرف مولانا الطاف حسین حالی مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر شاعروں اور ادیبوں کو سماج کے تئیں ان کی ذمہ داری یاد دلا رہے تھے، 'مجالس النسائ' اور 'مناجات بیوہ' 'یا 'چپ کی داد' لکھ کر عورتوں کی زبوں حالی کی طرف توجہ دے رہے تھے اور اکبر الہ آبادی (1921-1846) مغربی اثرات کی خرابیوں کو اپنی شاعری کے ذریعے طنز و تضحیک کا نشانہ بناتے ہوئے کہہ رہے تھے:

ہمارے ملک میں ہوتا ہے کیا تعلیمِ نسواں سے   بجز اس کے کہ بادا اور بھی گھبرائیں اماں سے

اور واضح طور پر عورتوں کی نئی تعلیم کے خلاف تھے اور یہ ہدایت بھی دے رہے تھے:

دو اسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم   قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

اس کے مقابلے میں حالیؔ کی نظم 'چپ کی داد' کی یہ لائنیں ملاحظہ ہوں:

تم نے تو چین اپنے خریداروں سے بھی پایا نہ کچھ / شوہر ہو اس میں یا پدر، یا برادر، یا پسر
گو نیک مرد اکثر تمہارے نام کے عاشق رہے / پر نیک ہوں یا بد، رہے سب متفق اس رائے پر
جب تک جیو تم، علم و دانش سے رہو محروم یاں / آئی ہو جیسی بے خبر، ویسی ہی جاؤ بے خبر
تم اس طرح مجہول اور گمنام دنیا میں رہو / ہو تم کو دنیا کی، نہ دنیا کو تمہاری ہو خبر
جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آبِ حیات / ٹھہرا تمہارے حق میں وہ زہرِ ہلاہل سربسر

ان سطور میں حالی عورت کی بے بسی پر اور اس کے ساتھ روا ناانصافیوں پر غم و غصہ کا اظہار تو کرتے ہیں لیکن اپنی تمام روشن خیالی کے باوجود وہ اس کا کوئی حل، کوئی متبادل طرزِ فکر نہیں دے پاتے، بلکہ مردوں کو دوسری دنیا میں سزا سے ڈرا کر اور عورتوں کو یہ تسلی دے کر رہ جاتے ہیں:

آتا ہے وقت انصاف کا، نزدیک ہے یوم الحساب   دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا واں جواب

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب عورت کا مسئلہ ایک بار توجہ کا مرکز بن گیا تو ان کے حالات کا درست تجزیہ کرنے والے، ان سے ہمدردی رکھنے والے اور سچے دل سے ان کی بہتری چاہنے والے ادیبوں کی بھی کمی نہ رہی۔ مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شبلی، علامہ راشد الخیری، مولوی ممتاز علی جیسے درجنوں نام ہیں جو اس مسئلے پر سوچ رہے اور لکھ رہے تھے۔ مولانا حالی کی طرح راشد الخیری نے بھی اپنی کہانیوں اور ناولوں میں عورتوں کی بے کسی اور بے بسی کے اتنے موثر نقشے کھینچے ہیں کہ ان کو 'مصورِ غم' کہا جانے لگا۔ لیکن ان میں سے بیشتر کے نزدیک عورت کی تعلیم کا تصور بچ مچ صرف گھر کو سلیقے سے سنبھالنے تک محدود تھا۔ عورتوں کی تعلیم کی حمایت میں اردو کا پہلا ناول 'مراۃ العروس' 1869 میں ڈپٹی نذیر احمد نے لکھا۔ مراۃ العروس یعنی دلہن کا آئینہ —— یہ ناول ایک آئینہ تھا جس نے دو بہنوں اکبری اور اصغری کی تعلیم و تربیت کے فرق کو سامنے رکھ کر تعلیم یافتہ اصغری اور اس کی جاہل اور پھوہڑ بہن اکبری کے کرداروں کے ذریعے تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ پڑھی لکھی اصغری سسرال جا کر اپنی محنت، لگن، سمجھ داری اور حسنِ اخلاق سے سب کا من موہ لیتی ہے، مشکل وقت میں بھی ثابت قدمی اور ہنر مندی سے مشکلوں کا حل نکال لیتی ہے اور اپنی سسرال اور محلے بھر کی آنکھوں کا تارا بن جاتی ہے۔ یہ ناول چھپا تو اس وقت اس کی ایک لاکھ سے زیادہ کاپیاں فروخت ہوئیں (جبکہ اس وقت آج

کی طرح تعلیم عوامی دائرے میں داخل نہ ہوئی تھی اور آج کسی اچھی سے اچھی کتاب کی ہزار کاپیاں نکلنے میں برسوں لگ جاتے ہیں)۔ اسی کہانی کے اگلے حصے کے طور پر ڈپٹی نذیر احمد نے دوسرا ناول 'بنات النعش' لکھا — اور پھر ایک کے بعد ایک پورے سات ناول 1892 تک چھپ گئے جن میں ابن الوقت اور توبۃ النصوح جیسے شاہکار بھی شامل ہیں۔ ان سب کا مرکزی خیال نئی نسل، اور خصوصاً لڑکیوں کی تربیت کرنا اور انھیں مشرقی تہذیب سے وابستہ رکھنا تھا۔

حالی، نذیر احمد، مولوی ممتاز علی، بدرالدین طیب جی، مولوی سید کرامت علی اور جسٹس امیر علی وہ اہم نام ہیں جنھوں نے عورتوں کی تعلیم میں ہی ان کی نجات دیکھی۔ جسٹس امیر علی نے 1899 میں کلکتے میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا تھا، "جب تک ہم تعلیم نسواں جاری نہیں کریں گے، صرف لڑکوں کو تعلیم دینے سے ہم کو ایک زندہ قوم بننے میں بالکل مدد نہیں مل سکتی۔"[4] لیکن ظاہر ہے کہ ان کے خیالات کا خیر مقدم مسلمانوں کے انھی طبقوں میں ہوا جو پہلے سے تعلیم یافتہ اور روشن خیال تھے۔

نذیر احمد نے ناول لکھنے کا ایک سبب یہ بتایا کہ جب انھوں نے اپنی بیٹیوں کی تعلیم کے لیے کتابیں تلاش کرنا چاہیں تو اندازہ ہوا کہ اردو کا ادبی سرمایہ خواتین کی تعلیم لے لیے نامناسب اور ضرر رساں ہے، چنانچہ اپنی بیٹیوں کے لیے انھوں نے خود کتابیں لکھنے کا فیصلہ کیا۔ مولانا اشرف علی تھانوی ((1943-1863 بھی اسی لیے عورتوں کو صرف مذہبی تعلیم دینے کے حامی تھے۔ انھوں نے 'بہشتی زیور' میں، جو 1905ء میں شائع ہوئی، بتایا ہے کہ شاعری اور ناول تو دور کی بات، بعض مذہبی کتابیں بھی ان کے لیے ضرر رساں ہیں۔ ان کے خیال میں عورتوں کو مدرسے بھیجنے کے بجائے گھروں میں ہی پڑھانا چاہیے، کسی عالم کی دیکھ ریکھ میں اس کے لیے کتابوں کا سلیکشن ہونا چاہیے۔ اگر وہ کالج گئیں تو وہاں دوسرے مذہب اور قوم کی عورتوں کی صحبت میں وہ بے دین ہو جائیں گی، ان کے طور طریقے بگڑ جائیں گے۔ وہ ان کے لکھنا سیکھنے کے بھی سخت مخالف تھے کیونکہ وہ یہ مانتے تھے کہ عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں، ان میں اچھا برا پہچاننے کی تمیز نہیں ہوتی اور وہ جلدی بہک جاتی ہیں۔ مسلم عورتوں کی تعلیم کی مخالفت کرنے والے اس قسم کے دقیانوسی لوگوں کی تعداد حالانکہ کم تھی لیکن سماج پر ان کا اثر بہت گہرا تھا جو دیر تک رہا۔ سرسید اور تھانوی صاحب، دونوں کو آج بھی مسلم معاشرے میں بے پناہ اعتبار حاصل ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اصلاحِ نسواں کے ان مبلغین نے آخر اردو کے ادبی سرمائے کو عورتوں کے لیے کیوں ممنوع قرار دیا؟ وہ اسے مخرب اخلاق کیوں سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ جاننے کے لیے اردو ادب کی بعض عمومی باتوں کی طرف دھیان دینا ہوگا اور ان کا تقابل اس دور کے رہن سہن سے کرنا ہوگا۔ اردو غزل، مثنوی اور داستان میں، جو غیر معمولی طور پر مقبول اصنافِ ادب تھیں، عورت کا تصور اور کردار اس عورت سے یکسر مختلف ہے جو معاشرے کی تہذیبی زندگی سے غائب اور زنان خانے میں قید تھی۔ غزل میں عورت یا محبوبہ ایک بے درد اور ظالم، ہرجائی اور بے وفا، اپنے ناز و ادا سے قتل کرنے والی ایسی عورت ہے جس کی ایک نظر پر عاشق سو جان سے نثار ہوتا ہے۔ مثنوی اور داستان میں یہی عورت ایسا متحرک کردار ہے جو حکومت کی باگ ڈور بھی

سنبھالتی ہے، اپنی عقل مندی سے سازشوں کو بے نقاب کرتی اور حریفوں کو شکست دیتی ہے، بھیس بدل کر میدانِ جنگ میں بھی جاتی ہے، مافوق فطری قوتوں سے لڑتی جنگلوں اور صحراؤں میں گھومتی ہے، اپنے عاشق کو مصیبتوں سے نجات دلاتی ہے اور زندگی کی جدوجہد میں اپنے اور اہلِ خاندان کو کامیابی و کامرانی سے ہم کنار کرتی ہے۔ غزل کا عاشق، نیز مثنوی اور داستان کا ہیرو بنیادی طور پر مجہول، بے حرکت و عمل کردار ہے۔ وہ سرد آہیں بھرنے کے سوا کچھ نہیں کرتا۔ یعنی ادب میں عاشق اور معشوق کے جو روایتی کردار ہیں، حقیقی زندگی میں وہ اس کے الٹ ہیں۔ حقیقی زندگی میں عورت بے زبان اور بے عمل ہے اور مرد ہر سرگرمی کا مرکز۔ لیکن ادب میں مرد بے عمل ہے اور عورت سرگرم و فعال۔ کون سی نفسیاتی گتھی نے ایسے ادب کو جنم دیا، اس کا تجزیہ الگ سے کیا جانا چاہیے۔ شاید گھر سے باہر کی زندگی میں عورت کے نہ ہونے کی کمی کو مرد کے تخیل نے ادب میں گڑھ لیا۔ اپنی بنائی ہوئی اس مصنوعی دنیا کو وہ عورت سے چھپانا بھی چاہتا ہے، اور یہ بھی سوچتا ہے کہ اگر عورت نے اس خفیہ دنیا کی سیر کر لی تو شاید وہ اس کا حصہ بننے کی تمنا بھی کرے گی۔ شاید اسی لیے انھوں نے اس ادب کو عورتوں کے لیے مخربِ اخلاق سمجھا ہو۔

سرسید اور تھانوی کے مقابلے میں رشیدۃ النسا کی روشن خیالی دیکھیے جنھوں نے 1881 میں ناول 'اصلاح النساء' لکھا اور اردو کی پہلی خاتون ناول نگار بنیں۔ ان کی بیٹی نثار کبریٰ نے لکھا ہے کہ "اماں کا یہ کہنا تھا کہ لڑکیوں کو اچھی اور بری سب طرح کی کتابیں دیکھنا چاہئیں تاکہ وہ اپنی عقل سے اچھے کو اچھا اور برے کو برا سمجھیں۔"[5] ناول کی مرکزی کردار اشرف النساء کی زبانی یہ باتیں سنیے اور ان کو سرسید کے خیالات کے مقابل رکھیے:

> "جب لڑکیاں شائستہ اور تعلیم یافتہ ہوجائیں گی تو لڑکوں کا تعلیم پانا کچھ مشکل نہ ہوگا۔۔۔ مرد کی تعلیم تو عورتوں کے اختیار میں ہے۔ جب لڑکے پیدا ہوتے ہیں تو پہلے ماں سے ہی تعلیم پاتے ہیں اور بعد اس کے مولوی ماسٹر کے سپرد ہوتے ہیں۔ اس لیے مادری تعلیم کا اثر دل سے نہیں جاتا۔"

تھانوی عورتوں کو لکھنا سکھانے کے سخت مخالف تھے، رشیدۃ النساء، جنھوں نے گھر ہی میں لکھنا پڑھنا سیکھا تھا، لکھتی ہیں:

> "اگر کوئی شخص چار سطر نقل کیا کرے اور اسی قدر اپنے دل سے بنا کر لکھے تو چند مہینوں میں لکھنا سیکھ جائے گا۔ خوش خطی سے مطلب نہیں، لکھنا ایک ہنر ہے۔ جو ضرورت کے وقت کام آتا ہے۔"

وہ اپنے دور کے حالات سے بے خبر نہیں تھیں اسی لیے دلاسا دیتے ہوئے عورتوں سے کہتی ہیں: "ابھی زمانہ ایسا نہیں آیا ہے کہ سب عورتیں تعلیم یافتہ ہوں اور رسم و رسومات کو برا سمجھیں۔ ایسا ہونے میں ابھی تیس چالیس برس کا زمانہ باقی ہے۔" ایک پردہ نشین گھریلو عورت اپنی دانش اور بصیرت سے یہ سمجھتی ہے کہ تیس چالیس برس بعد عورتوں کی تعلیم عام ہو جائے گی۔ ان کے مقابلے میں سرسید جیسے جہاندیدہ سماجی کارکن اور

معروف دانشور یہ ناول لکھے جانے کے کئی سال بعد زنانہ مدرسوں کی سخت مخالفت کرتے ہیں اور 1884 میں کہتے ہیں: ''عورتوں کو جس قسم کے علوم پڑھائے جانے کا خیال پیدا ہوا ہے اس کو بھی میں پسند نہیں کرتا کیونکہ وہ نہ ہماری حالت کے مناسب ہیں اور نہ سیکڑوں برس تک ہماری عورتوں کو ان کی ضرورت ہے۔''[9]

اس ناول میں رشیدۃ النساء نے تعلیم کو زندگی کے ہر شعبے سے جوڑ کر دکھایا ہے۔ جاہل ماں بیٹیاں قانونی امور نہ جاننے کے سبب اپنی ساری جائداد گنوا بیٹھتی ہیں، تو پڑھنے کی شوقین ایک لڑکی اپنے شوہر کو بھی تعلیم کی طرف راغب کرتی ہے اور بیوی کے شوق کو دیکھ کر شوہر کو بھی دل چسپی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ دونوں طب پڑھ کر ڈاکٹر بنتے ہیں۔ ایک جگہ محمدی بیگم نام کی کردار سے کہلواتی ہیں: علم بڑی دولت ہے۔ روپیا پیسا اس کے سامنے کچھ نہیں ہے۔۔۔۔۔ پڑھنے لکھنے میں محنت کرو گے تو حاکم بن جاؤ گے۔'' غرض یہ کہ وہ تعلیم کو سماج کے ہر معاملے سے وابستہ کرکے دیکھتی ہیں اور اس کو ترقی کی سیڑھی سمجھتی ہیں۔

ایک اور قابل توجہ لکھنے والی رقیہ سخاوت حسین ہیں جنھوں نے انگریزی اور بنگلہ میں لکھا۔ رقیہ 1880 میں بنگال کے رنگ پور (موجودہ بنگلہ دیش) میں ایک زمیندار خاندان میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے اپنے بچپن میں دیکھا کہ ان کی بڑی بہن کریم النساء ایک بنگلہ نظم پڑھتے ہوئے پکڑی گئی تھیں اور انھیں سزا کے طور پر ایک بوڑھی رشتہ دار کے یہاں تنہائی کی زندگی بسر کرنے بھیج دیا گیا تھا۔ اس طرح کی ناانصافیوں نے رقیہ کو بہت حساس بنا دیا۔ لیکن ان کے بھائی نے انھیں انگریزی اور بنگلہ زبانیں پڑھائیں۔ ان کی شادی بھاگلپور کے بیرسٹر سخاوت حسین سے ہوئی جو بہت روشن خیال تھے۔ انھوں نے رقیہ کو پڑھنے کی لکھنے کی آزادی دی۔ شادی کے تین سال بعد ہی 1905 میں انگریزی میں ان کی کہانی Sulatana's Dream چھپی جس میں سلطانہ کی خواب نگریا میں سب مرد گھروں میں بند رہتے ہیں جیسے اس دور کے سماج میں عورتیں رہا کرتی تھیں۔ گھروں میں عورتیں اس لیے بند رکھی جاتی ہیں کہ وہ محفوظ رہیں۔ اس دلیل کا جواب سلطانہ یہ دیتی ہے کہ عورتیں صرف تبھی تک غیر محفوظ ہیں جب تک مرد سڑکوں پر کھلے گھومیں۔ اگر مرد سڑکوں پر نہیں ہوں گے تو عورتوں کو کوئی خطرہ نہیں، اس لیے ہم نے انھیں گھروں میں بند کر دیا ہے۔ کسی پاگل کو، جو اچھے بھلے انسانوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے، کھلی سڑکوں پر نہیں چھوڑا جاتا۔ جب کہ ہمارے ملک کا یہ دستور بن گیا ہے کہ مرد جو غلط حرکتیں کرتے یا کر سکتے ہیں، کھلے چھوڑ دیے جاتے ہیں اور بے گناہ عورتوں کو زنانے میں بند کیا جاتا ہے۔ اس طرح دلیل پر دلیل دیتے ہوئے رقیہ سخاوت حسین عورتوں کی آزادی اور تعلیم کا کیس مضبوطی کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ ان کے تمام دلایل میں ایک منطقی ربط ہے۔ کہانی میں وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے بہت سے مسائل کے حل ڈھونڈتی ہیں۔

سلطانہ کے خواب کی ایک خوبی اس کا دوہری معنویت کا حامل ہونا ہے۔ زاہدہ حنا لکھتی ہیں کہ اس میں دوہری نوآبادیت کا عکس ہے۔ جس زمانے میں یہ کہانی لکھی گئی اس وقت ہندوستان کے مرد اگر ہندوستانی جغرافیے کے اندر سیاسی محکومیت کا شکار تھے تو عورت گھر کی چار دیواری کے اندر محصور اور مقید تھی۔ یہ چار دیواری عورت کو دوہری محکومیت میں مبتلا کرتی تھی۔ سلطانہ کے خواب میں عورتوں نے اپنی ذہانت سے جن مردوں کی

محکومیت سے نجات پائی وہ پیشے کے اعتبار سے فوجی تھے۔ رقیہ لکھتی ہیں: 'جب اس ملک کے مرد اپنی فوجی طاقت بڑھانے میں مصروف تھے، اس وقت عورتیں سائنسی تحقیق میں جٹی ہوئی تھیں۔ اس دور میں انگریز بھی جدوجہدِ آزادی کو کچلنے کے لیے فوجی طاقت بڑھانے کی بات کر رہے تھے۔ ایسے میں عورتوں کا سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے اپنی نجات کا راستہ ڈھونڈ لینا دراصل اشارہ ہے کہ بہ حیثیت قوم ہم ہندوستانیوں کو بھی نوآبادیات اور فوجی قوت سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرنی چاہیے۔[1]

رقیہ نے 1908 میں بنگلہ زبان میں ناول 'پدم راگ' لکھا تھا جس میں ناول کی ہیروئن کا بھٹکا ہوا شوہر اپنی غلطی کا احساس کر کے برسوں بعد جب اسے لینے آتا ہے تو اپنے شوہر سے گہری محبت کے باوجود وہ یہ کہہ کر ساتھ جانے سے انکار کر دیتی ہے: 'میں اپنی زندگی کا ہدف بہت پہلے طے کر چکی ہوں۔ گرہستی کی زندگی گزارنا خدا نے میرے نصیب میں نہیں لکھا۔۔۔۔ تم اپنے راستے جاؤ میں اپنی راہ جاؤں گی۔' یہ راہ کون سی تھی، کہانی میں جا بجا عیاں ہے۔ ٹھکرائی ہوئی اس عورت نے زندگی بھر قسمت کا رونا رونے کے بجائے جینا سیکھ لیا تھا۔ وہ انگریزی میں شاعری کرتی تھی، اس نے شہرت اور انعامات حاصل کیے، وہ اپنے بھائی کی وسیع و عریض جائداد کا انتظام سنبھالتی تھی۔ یہ وہ زندگی تھی جو اس نے ایک بے وفا شوہر کے متبادل کی صورت میں اختیار کی، اور وہ خوش تھی۔ اب سے سو سال پہلے اتنے ریڈکل ناول کا لکھا جانا حیرت کی بات ہے کیونکہ مسلم معاشرے میں شاید آج کے دور میں بھی ایسی فکر عام نہیں۔

یہ وہ دور تھا جب کشادہ ذہن اور روشن خیالات رکھنے والی رشیدۃ النساء جو پٹنہ میں 1853 میں پیدا ہوئیں اور بہار کے ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں (ان کے بھائی امداد امام اثر مصنف 'کاشف الحقائق' اردو کے ایک نامور ادیب ہیں)، خود بھی طرح طرح کے سماجی دباؤ کا شکار ہوئیں۔ جب انھوں نے ڈپٹی نذیر احمد کے ناول مراۃ العروس سے متاثر ہو کر 1881 میں 'اصلاح النساء' لکھا تو چھپوانے کی ہمت نہ کر سکیں۔ یہ ناول ان کے بیٹے نے بڑے ہو کر 1894 میں چھپوایا لیکن اس پر مصنف کے نام کی جگہ 'والدہ بیرسٹر سلیمان بار ایٹ لا' شائع کیا گیا۔ اس زمانے میں عورتوں کا نام گھر سے باہر آنا بھی بے پردگی کی بات تھی اسی لیے بہت سی ایسی لکھنے والیاں تھیں جو اپنے نام کی جگہ اپنے والد، شوہر یا بیٹے کا نام لکھتی تھیں۔ مثلاً مس نذر الباقر، مسز عبدالقادر اور والدہ افضل علی وغیرہ جو اردو کی ابتدائی ناول نویس اور افسانہ نگار ہیں۔

پردے کے اس سخت تصور اور نظام کے خلاف رقیہ سخاوت حسین نے بنگال اور بہار میں مسلسل کام کیا کیونکہ تعلیم کی راہ میں پردہ ہی سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ عورتوں کی تعلیم، ان کی حالتِ زار اور پردے کے بارے میں انھوں نے 1903 سے 1904 کے درمیان بہت سے مضامین لکھے جو 'موتی چور' کے عنوان سے 1908 میں چھپے۔ ان کا ایک مجموعہ 'اوبورُدھ باشنی' (Oborodhbashini) کے عنوان سے چھپا جس کا اردو ترجمہ 'عزلت نشین' کے نام سے ہوا ہے۔ اس میں ہندو اور مسلمان عورتوں پر ہونے والے سماجی اور روایتی مذہبی جبر کے بارے میں رپورٹیں جمع کی گئی ہیں۔ عورتوں کی خود مختاری اور آزادی کے بارے میں ان کے خیالات بے حد واضح تھے۔ ایک مضمون میں لکھتی ہیں: 'کچھ لوگ یہ کہتے ہیں اور درست کہتے ہیں کہ عورتیں

مردوں کے ہاتھوں ظلم اور زیادتی اس لیے برداشت کرتی ہیں کہ وہ معاشی لحاظ سے ان کی محتاج ہوتی ہیں۔۔۔ چنانچہ اگر مردوں کے جبر سے آزادی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ہم خود روزگار پیدا کرسکیں تو پھر ہمیں کام شروع کردینا چاہیے۔ ہمیں وکیل، مجسٹریٹ، جج اور کلرک بننا چاہیے۔ جس طرح کا کام ہم اپنے گھروں میں کرتے ہیں اگر یہی کام ہم باہر کرنے لگیں تو اس سے بھی اجرت مل سکتی ہے۔ ان ملازمتوں کے ساتھ ساتھ ہمیں ان مواقع کے لیے بھی سوچنا چاہیے جن کا تعلق زراعت سے ہے۔" یہ بات حیران کن ہے کہ وہ عورتوں کے روزگار کے مواقع سفید کالر ملازمت سے لے کر کھیتی باڑی تک زندگی کے ہر شعبے میں ڈھونڈتی ہیں۔ فیشن میں یا میاں کے کہنے سے بے پردہ ہوجانے کو وہ عورتوں کی آزادی نہیں مانتیں۔ ایک مضمون میں لکھتی ہیں:

"حال ہی میں پارسی عورتوں نے بغیر پردے کے باہر نکلنا شروع کیا ہے مگر کیا وہ واقعی ذہنی غلامی سے آزاد ہیں۔۔۔ پارسی مرد مغرب کی اندھی تقلید میں اپنی عورتوں کو پردے سے گھسیٹ لائے ہیں۔ اس سے ان عورتوں کی رضا اور منشا ظاہر نہیں ہوتی۔ وہ اسی طرح بے اختیار ہیں جیسے پہلے تھیں۔"[11]

یہ بات ذہن نشین رہے کہ عورتوں کی تعلیم کی حمایت اور پردے کی مخالفت عموماً اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ طبقے کے لوگ کر رہے تھے لیکن متوسط طبقے کے روایت پسند لوگوں کا رویہ دقیانوسی تھا۔ روشن خیال مردوں کے علاوہ خاصی تعداد میں عورتیں تھیں جو ناول، افسانے اور مضامین لکھ رہی تھیں، اخبارات شائع کر رہی تھیں، اسکول کھول رہی تھیں اور سماجی کاموں اور عورتوں کی تنظیمیں چلانے میں دلچسپی رکھتی تھیں۔ محمدی بیگم نے (جو ڈراما انارکلی کے مصنف امتیاز علی تاج کی والدہ تھیں) لاہور سے اردو کا پہلا ہفت روزہ زنانہ اخبار 'تہذیبِ نسواں' 1898 میں جاری کیا۔ اس کے بعد تو اخبار و رسائل کی گویا باڑھ سی آگئی۔ دہلی، علی گڑھ، آگرہ، لاہور اور بھوپال سے 1906 سے لے کر 1920 تک درجنوں اخبار عورتوں نے شائع کیے۔ مدرسۃ النسواں علی گڑھ کا مجلہ 'خاتون' 1906 میں، لاہور سے منشی محبوب عالم کا مجلہ 'شریف بی بی' 1906 میں، دہلی سے بیگم شیخ محمد اکرام کا مجلہ 'عصمت' 1908 میں، آگرہ سے بیگم احتشام (بیگم خاموش) کا رسالہ 'پردہ نشین' 1912 میں، دہلی سے راشد الخیری کا ہفتہ وار رسالے 'سہیلی' اور 'بنات' 1915 میں، بھوپال سے قمر النساء بیگم کا مجلہ 'امہات' 1920 میں جاری ہوئے۔[12] ان رسالوں نے بے شمار لکھنے والیاں پیدا کردیں اور افسانے لکھنے والیوں کی پہلی کھیپ 1915 میں سامنے آگئی — یعنی اس دور میں جب اردو افسانے کی عمر بمشکل دس بارہ سال تھی۔ اردو کا پہلا افسانہ 'نصیر اور خدیجہ' دسمبر 1903 میں رسالہ 'مخزن' لاہور میں چھپا۔ اس کے مصنف راشد الخیری نے اپنے پہلے ہی افسانے میں بکھرتے ہوئے خاندان، مغربی اقدار سے متاثر ہو خاندان سے الگ ہو کر جینے والے ایک شخص کی خود غرضی، اپنے غریب رشتہ داروں کے تئیں بے حسی، بیوہ عورتوں اور ان کے بچوں کی بقا جیسے مسائل کو ایک غریب بہن کے اپنے امیر بھائی کو لکھے خط کی صورت میں نہایت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس دور کے دوسرے اہم افسانہ نگار علی محمود، وزارت علی اورینی، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، پریم چند، محمد علی ردولوی، خواجہ حسن نظامی، نیاز فتح پوری اور سدرشن تھے۔ ان سب نے یوں تو عورتوں کے مصائب کو موضوع بنایا لیکن راشد الخیری، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری نے خصوصی طور پر عورتوں کے مسائل کو اپنے افسانوں کا مرکز

محور بنایا۔ اس کے بارہ سال بعد 1915 میں، عباسی بیگم (حجاب امتیاز علی کی والدہ) کا افسانہ 'گرفتار قفس'، نذر سجاد حیدر (قرۃ العین حیدر کی والدہ) کا افسانہ 'خونِ ارماں'، آصف جہاں کا افسانہ 'کشش و پیچ' اور انجمن آرا کا افسانہ 'ریل کا سفر' مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔

ان ابتدائی افسانوں سے کافی پہلے عورتوں پر لکھے یا عورتوں کے لکھے ناول وجود میں آگئے تھے جن میں عورتیں نذیر احمد کے ماڈل سے مختلف نظر آتی ہیں۔ مرزا ہادی رسوا کا ناول 'امراؤ جان ادا' میں ایک طوائف کا کردار پوری دردمندی اور حقیقت پسندی کے ساتھ مصور کیا گیا۔ ننھی امیرن اغوا کے دوران جس بے بسی اور وحشت کا شکار ہوتی ہے، اس کے بعد طوائف کے بالاخانے کی نئی زندگی اس کے معصوم ذہن کے لیے جنت سے کم نہیں، اور وہ بڑے فطری انداز میں اسے قبول بھی کر لیتی ہے۔ مرزا رسوا امراؤ جان کو اپنے یا سماج کے اخلاقی نظام کی میزان پر نہیں تولتے بلکہ اس کے کردار کے حوالے سے حالات کے جبر کا ایسا جواز فراہم کرتے ہیں کہ قاری کو اس سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اس کو کہیں بھی قابل نفرت نہیں سمجھتا، بلکہ امراؤ کا علم، شعری ذوق، فن موسیقی میں اس کا درک، اس کی دوراندیشی اور تجزیاتی ذہن ایسی خوبیاں ہیں جو اسے ممتاز شخصیت کی حامل بناتی ہیں۔ طوائف کا اتنا جاندار کردار پہلی بار تخلیق کرنے والے رسوا ہی ہیں، اور ان کے بعد بھی کوئی ادیب ایسا مکمل کردار خلق نہ کر سکا — طوائف کی زندگی کے متعدد پہلوؤں پر بے تکان افسانے لکھنے والا منٹو بھی نہیں۔

والدہ افضل علی کا ناول 'گودڑ کا لال' 1905 میں چھپا۔ اس کے بعد ان کے دوسرے ناول 'شعلۂ پنہاں' اور 'گلدستۂ محبت' سامنے آئے۔ نذر سجاد حیدر نے سودیشی تحریک کے زمانے میں ایک ناول 'مذہب اور عشق' لکھا جس میں ایک با اثر سیاسی خاندان کی بیٹی (وجے لکشمی) کے ایک مسلم نوجوان کے ساتھ عشق کی داستان کو موضوع بنایا گیا تھا۔ اس خاندان سے مراسم ہونے کی وجہ سے انھوں نے یہ ناول اپنی پھوپھی والدہ افضل علی (اکبری بیگم) کے نام سے 1935 میں شائع کرایا تھا لیکن بعد میں قرۃ العین حیدر نے اسے ایڈٹ کر کے پھر سے اپنی ماں یعنی نذر سجاد حیدر کے نام سے چھپوایا۔[۱۳]

درجنوں خواتین افسانہ نگاروں کے نام 1920 تک سامنے آ چکے تھے۔ ان افسانہ نگاروں نے عورتوں کے مسائل، آزادیٔ نسواں، ان کی تعلیم پر حقیقت پسندی کے ساتھ بھی لکھا اور رومانی کہانیاں بھی۔ مسز عبدالقادر نے پراسرار جادوئی کہانیاں لکھیں۔ ان سے تحریک پا کر رومانی افسانہ لکھنے والیوں کی ایک پوری نسل تیار ہو گئی جس میں سب سے توانا آواز حجاب اسمٰعیل (بعد میں حجاب امتیاز علی) کی ہے جنھوں نے 1932 میں لکھنا شروع کیا۔ لیکن مذہبی اور معاشرتی جکڑبندیوں کے خلاف بے باکی اور بغاوت کے ساتھ قلم اٹھانے والی پہلی افسانہ نگار رشید جہاں ہیں جن کی تحریروں سے ان کے بعد زیادہ تر لکھنے والیوں نے تحریک پائی۔

رشید جہاں نے تھوڑے ہی افسانے لکھے لیکن مجموعی طور پر ان کے افسانوں کی عورت ایسی ہی باشعور اور سائنسی طرز فکر رکھنے والی عورت نظر آتی ہے جو اپنی منفرد شناخت رکھتی ہے۔ عورتوں کے علاوہ رشید جہاں نے توہم پرستی، مذہبی تنگ نظری، مذہب کی غلط تعبیر اور فرسودہ اخلاقی نظام وغیرہ کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنا کر

سماج کی حقیقت دکھائی۔ سچائی تو یہ ہے کہ رشید جہاں کے نزدیک قلم تو سماجی تبدیلی کی جانب متوجہ کرنے کا محض ایک ذریعہ تھا۔ وہ خود عملی زندگی میں کمیونسٹ تحریک سے وابستہ رہیں اور انھوں نے زندگی بھر ان مسائل کے حل کی جدو جہد کی۔ نظریاتی طور پر واضح فکر کی حامل رشید جہاں نے دوٹوک اور طنزیہ زبان میں سماجی زندگی کی مختلف خرابیوں، منافقتوں اور طور طریقوں کو بڑی بے باکی سے ہدف تنقید بنایا اور اردو کو ایسی کہانیاں دیں جن کی پیروی کر کے عصمت چغتائی، مسرور جہاں، صدیقہ بیگم سیوہاروی، رضیہ سجاد ظہیر، واجدہ تبسم اور کئی دوسری افسانہ نگار خواتین نے عورت، خصوصاً طوائفوں کی زندگی پر کامیاب افسانے اور ناول لکھے۔ ان کے علاوہ شکیلہ اختر اور رینوی، عصمت چغتائی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور اختر جمال وہ لکھنے والیاں ہیں جنھوں نے ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر نئی حسیت کے ساتھ لکھا۔ یہ سب اس نسل سے تعلق رکھتی ہیں جو آزادی سے پہلے لکھ رہی تھیں، ان میں سے بعض آزادی کے بعد کی افسانہ نگاروں میں بھی شامل ہیں۔

اس عہد میں ہمیں شاعری کے میدان میں اتنی بڑی تعداد میں یا اتنی مشہور شاعرات نظر نہیں آتیں جتنی فکشن کے میدان میں۔ شاید سبب یہ ہو کہ یہ سب لکھنے والیاں سماجی تبدیلی کی مہم میں شامل تھیں۔ اپنے قلم کا استعمال وہ مجموعی طور پر عورتوں کی بیداری اور ان کی قسمت بدلنے کے لیے کر رہی تھیں۔ لیکن شاعری سے یہ کام نہیں لیا جاسکتا تھا کیونکہ شاعری ابھی تک غزل اور نظم میں روایتی اظہارات تک محدود تھی۔ پھر یہ بھی ہے کہ جو شاعرات نو آبادیاتی دور میں شعر گوئی کر رہی تھیں ان میں زیادہ تر یا تو اعلیٰ طبقے کی شہزادیاں اور نواب زادیاں تھیں یا پھر اس دور کی تہذیب میں اہم مقام رکھنے والی طوائفیں جن کے بالاخانے ادب وثقافت کا مرکز تھے۔ کچھ نام قمر جان مشتریؔ، زینت جان نازکؔ، نصیبن زہرہؔ، مہ لقا بائی چندا وغیرہ کے ہیں۔ بیگمات میں فرخ آباد کے نواب امداد الملک گنا بیگم، اودھ کے نواب آصف الدولہ بہو بیگم اور ایک امیر مرزا علی خاں کی ثریا بیگم کی شاعری کا ذکر گارسی دتاسی نے کیا ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ بیشتر شاعرات کا کلام ضائع ہوگیا کیونکہ اس دور میں عورتوں کی شعر گوئی کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء مخفی کا عرصے تک کوئی ذکر نہیں ہوا۔ اردو کے اہم ترین شاعر میر تقی میرؔ نے شاعروں کا تذکرہ لکھا لیکن اپنی شاعرہ بیٹی بیگم کا نام بھولے سے بھی نہیں لکھا۔ اردو شاعرات کا پہلا تذکرہ بہارستان ناز 1868 میں حکیم فصیح الدین رنج نے ترتیب دیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد میں شاعرات کا ذکر کرنے کی ہمت بے شک پیدا ہوگئی ہو لیکن جاگیر داری طرز فکر اور عورت کے تئیں مکروہ رویے اس تذکرے میں جا بجا دیکھے جاسکتے ہیں۔ مثلاً منی حجابؔ کے تذکرے میں رنج لکھتے ہیں:

> ''عمر میں ابھی انیسویں سال کی گرہ پڑی ہے۔ شاعری کے راستے میں قدم تو رکھا ہے مگر سنبھل کر چلیں، یہ منزل کڑی ہے۔ پہلے ہم گداختہ دلوں سے اپنا دل لگائیں، معشوق کو بالائے طاق رکھیں، عاشق بن جائیں۔ آج کل کی شاعرات سے اب بھی بہتر ہیں، مشتری اور زہرہ کی ہم سر ہیں۔ دور دور کی سیر بھی کر چکی ہیں، پیمانہ زندگی خوب بھر چکی ہیں۔ بس ایک ہم سے ہی ملاقات ہونا باقی ہے۔ یقین ہے کہ یہ آرزو بر آئے گی، اگر سچی مشتاق ہے۔''[12]

شاعرات کے تئیں مردوں کا یہ غیر سنجیدہ رویہ اپنی جگہ، لیکن یہ بھی درست ہے کہ ان کی شاعری بھی مردوں کی عمومی شاعری سے کچھ خاص مختلف نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ شاعری کے موضوعات متعین تھے، غزل روایت کے تتبع میں کہی جاتی تھی اور پرانے موضوع کو ہی نئے انداز سے پیش کر دیا جاتا تھا۔ اسی لیے یہ شاعری عورتوں کی ہوتے ہوئے بھی ان کی نسائی حسیت کی نمائندگی نہیں کرتی۔ نئی شعری حسیت کے ساتھ لکھنے والیوں کا زمانہ ستر کے بعد شروع ہوتا ہے۔

حواشی:

1. The Encyclopaedia Of Indian Literature, Volume 1, Sahitya Academy, by Amaresh Datta, p 758

۲۔ بہ حوالہ زاہدہ حنا، عورت زندگی کا زنداں، تخلیق کار پبلشرز، دہلی، 2006ص 231

۳۔ مکمل مجموعہ لیکچرز واسپیچز، لاہور، 1900ص ص 52-350۔

۴۔ بحوالہ زاہدہ حنا، عورت زندگی کا زنداں ص 206۔ ۵۔ ایضاً ص 222۔ ۶۔ ایضاً ص 210۔

۷۔ ایضاً ص 203۔ ۸۔ ایضاً ص 198 ۹۔ ایضاً ص 210۔ ۱۰۔ ایضاً ص 18-217

۱۱۔ ایضاً ص 225۔ ۱۲۔ ششماہی 'تنقید'، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، جون 2005ص 192۔

۱۳۔ نذر سجاد حیدر، گزشتہ برسوں کی برف، مرتبہ قرۃ العین حیدر، دہلی، 2007ص 14۔

۱۴۔ مرزا حامد بیگ، اردو افسانے کا نسوانی لحن، مشمولہ ششماہی 'تنقید'، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، جون 2005ص 110۔

■■

خالد اشرف

یاد آتے ہیں رفتگاں اکثر

پچھلے دنوں خالد جاوید کا ناول 'نعمت خانہ' پڑھا۔ اس ناول نے میرے ذہن و دل کو نہ صرف یہ کہ زیادہ متاثر کیا، بلکہ موت Death کے مسئلے پر لگاتار سوچنے پر مجبور کیا۔ ویسے بھی خالد جاوید کی 'موت کی کتاب' اور ان کے افسانے موت کے سوال کو بار بار سامنے لاتے ہی رہتے ہیں اور ان کی تحریروں میں موت گویا آپ کی گردن پر سانسیں لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ایک اذیت ناک منفیت ہے، جس میں خالد جاوید خود بھی مبتلا رہتے ہیں اور اپنے قاری کو بھی اضمحلال و مایوسی میں مبتلا رکھتے ہیں۔

موت کب آتی ہے؟ ڈاکٹروں اور فلسفیوں کے مطابق جسم کے مختلف نظام یکے بعد دیگر تھک ہار کر ڈھنے لگتے ہیں تو ایک دن اشرف المخلوقات چلتے چلتے بستر پر لگ جاتا ہے اور پھر عالم نزع، یہ سبھی انسانوں کا مقدر ہے۔ یہی قرۃ العین حیدر کے فکشن کا بنیادی تھیم بھی ہے کہ دانشور ہو یا عامی، متقی پرہیزگار ہو یا فاسق و فاجر، عاشق ہو یا صوفی۔ موت سب کو یکساں کر دیتی ہے اور صرف ایک حوالہ رہ جاتا ہے۔ 'تھے' یا 'تھیں'۔

آپ اسے میری خرن پسندی یا قنوطیت یا حقیقت پسندی کہہ سکتے ہیں کہ اب جب کہ عمر کی چھٹی دہائی خاتمے پر ہے، موت اور موت سے قبل کی اذیت و ذلت کے بارے میں سوچنے لگا ہوں۔ میرے لیے موت ایک طرح کے سکون اور تکمیل کا لمحہ ہے اور اس کے آگے ایک اتھاہ سناٹا اور گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ یوں تو اموات نزدیک و دور ہوتی ہی رہتی ہیں، جس طرح پیدائش اور شادیاں ہوتی ہیں، لیکن جن سے ہماری جذباتی اور معاشی وابستگی زیادہ ہوتی ہے، شاید اُن کی موت ہم کو زیادہ قنوطی اور کمزور بناتی ہے اور وہ ہمیں رہ رہ کر یاد آتے ہیں۔

میری زندگی میں پہلی موت، جسکا احساس اب زیادہ ہوتا ہے، میری دادا شیخ محمد حقیقت کی تھی۔ قصبہ بچھرایوں، ضلع مراد آباد کے شیخ زادوں کا پاکستان کی زد سے بچا کھچا زمین والوں کا کنبہ تھا، میرے باپ مشاعروں اور بیتوں میں گھومتے پھرے تھے، کہ بچھرایوں، روہیل کھنڈ میں آج بھی اردو کلچر کی آماجگاہ ہے، جہاں کے دوکاندار دہلی کے بہت سے اساتذہ سے بہتر اردو بولتے ہیں۔ تایا کو پہلوان مزاجی کی بنا پر ہاکی اور

والی بال کا جنون تھا، ٹورنامنٹوں میں زیادہ دیکھے جاتے تھے، گھر پر کم۔ دو چچا اسکول ماسٹر تھے اور ابن صفی کے دیوانے، ایک چچا کیرم بورڈ میں ڈوبے رہتے، کام کاج سے لاتعلق۔ کھیت باغ کی طرف اس لیے جانا پسند نہیں کرتے تھے کہ کپڑے میلے نہ ہو جائیں! نتیجہ یہ نکلا کہ دادا صاحب زمینیں بیچ بیچ کر سفید پوشی کا بھرم رکھے رہے، لیکن جب زمینیں نکل گئیں تو تانبے کے برتن بنیے کی دوکان پر چپکے چپکے منتقل ہونے لگے۔

لیکن برتنوں کے بعد؟

جب صرف خالی مکان باقی رہ گیا اور قرض خواہی کی نوبت آگئی تو والد صاحب کو دلّی آنا پڑا، جہاں نوکریاں اور روزگار ملتے تھے۔ اور یہاں آ کر ہم بھی روٹی کی جدوجہد میں شریک ہو گئے۔ دادا صاحب، جنھوں نے مجھے تختی لکھوا کر درجہ چہارم میں داخل کرایا تھا۔ ڈھنڈار مکان میں یکہ و تنہا رہ گئے۔ وہ بھرے پُرے گھر کی رونقوں کا ماتم کرتے اور بیٹے (میرے والد) کو درد بھرے خط لکھتے رہتے۔ اسی عالم یاس میں ایک برس ہی کی مدت میں ختم ہو گئے۔ ہم تو دلّی میں تھے اور اپنی روزی روٹی کی لڑائی لڑ رہے تھے، اُن کے شایانِ شان سوگ بھی نہ منا سکے۔ ہاں لیکن انکی موت کے تقریباً پینتالیس اور صرف اتنا کر سکا کہ چچا اسے جواب خود کافی بوڑھے ہو گئے ہیں، پانچ بزرگوں کی قبروں کے کتبے لال کنواں (دلّی) سے کندہ کرا کر پچھرایوں بھجوا دیے ہیں، جو ابھی نصب ہونے باقی ہیں۔

دادے میاں کانگریسی تھے اور سفید پوش، تایا مسلم لیگی تھے، دونوں کے درمیان سرد مہری جگ ظاہر تھی۔ چنانچہ وہ باپ کی تدفین میں بھی شریک نہیں ہوتے۔ ملک تو تقسیم ہوا، گھر بھی دو نیم ہو گیا۔ کچھ خدیجہ مستور کے ناول 'آنگن' کی سی فضا تھی۔

موت سے نزدیک ترین مجادلہ اپنی بیٹی کی وفات پر ہوا۔ پانچ برس کی کمزور سی سر وقد۔۔۔ سی تابندہ، نرسری پاس کر کے فرسٹ میں آئی تھی، ۱۹۹۴ء کی گرمیوں میں ہم نے اس کا نیا بستہ تیار کیا تھا، لیکن اسے پھر اسکول جانا نصیب نہ ہو سکا۔ تیرہ جنوری ۱۹۹۵ء کو خون کے کینسر میں آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں ختم ہوئی، ویسے بھی سوکھ کر ڈھانچہ سی رہ گئی تھی۔ نہ معلوم اُس معصوم کو کون سے گناہ کی سزا ملی تھی؟

پھر ستمبر ۲۰۰۲ء میں والد کا خاتمہ، یہ بھی کینسر سے ہوا۔ اب ہم نسبتاً خوشحال ہو چکے تھے اور وہ، ہم کو دیکھ کر آسودہ ہوتے تھے۔ شکار کے شوقین تھے، دونالی صاف کرتے رہتے اور پچھرایوں، اپنے وطن میں واپس بسنے کے لیے پر تول رہے تھے کہ وہاں اپنے پشتینی مکان میں بڑے بیٹے کے ساتھ رہیں گے اور چالیس سال پہلے کے ٹوٹے ہوئے محلے اور بستی کے رشتوں کی تجدید کریں گے۔ لیکن دس پندرہ دن ہی میں چٹ پٹ ہو گئے۔ جوانی میں تفریح کی آخری برسوں میں بڑی مشقت کی۔ کاش اور زندہ ہوتے تو عیش و آرام اُٹھاتے۔

والد کے دو ماہ بعد ہی تایا زاد بہن کا انتقال لاہور میں ہوا۔ عاضرہ وہی کینسر۔ نشاط باجی ہمارے مشترکہ کنبے کے سات بچوں کی رہنما، بلکہ ڈکٹیٹر تھیں۔ علی گڑھ گرلس کالج سے گریجویٹ اور پھر B.Lib.Sc. کیا تھا کہ ۱۹۷۱ء میں تقریباً زبردستی پاکستان بیاہ دی گئیں۔ انتہائی بولڈ، سلیقہ شعار اور ذہین بہن۔ ہم بچوں کو بات بے بات تھپڑ مارنا ان کا شغل تھا یا عورتوں، اے۔ آر۔ خاتون، ہاجرہ نازلی وغیرہ کے ناول پڑھنا، جو میں کرائے پر

لاتا تھا، کیوں کہ میں خود ابن صفی پڑھتا۔ بڑے ہو کر جب بھی لاہور گیا، ماں کی طرح شفقت کرتیں، دلّی تک کا کھانا باندھ کر دیتیں اور میری بگڑی ہوئی گرہستی پر رنجیدہ رہتیں۔ خود ان کے داماد کو کینسر میں مرے۔ میں ابھی بڑا عرصہ باقی تھا۔ قبرستان میانی صاحب میں دفن ہوئیں، جہاں سعادت حسن منٹو بھی آرام دہ ہے۔ اور پھر ذاتی تعلق والی آخری اور دہلا دینے والی موت میرے استاد، محسن، رہنما اور نظریہ ساز دانش ور ڈاکٹر قمر رئیس کی، اپریل ۲۰۰۹ء میں، بڑے پُر اسرار حالات میں ہوئی۔ قمر صاحب سے تعارف ۱۹۸۰ء میں ایم۔اے۔ کی کلاس میں ہوا تھا۔ وہ روشن خیال تھے، نرم دل گفتگو، اردو تہذیب کے نمائندہ۔ لیکن مذہبی ریاکاروں سے بھی چند کے نباہ کر لیتے تھے۔ تعلق خاطر کی ابتدا کتابوں کے لین دین سے ہوئی اور انتہا بے حد ذاتی تعلق پر ہوتی۔ حدے کہ راقم نے ہی ان کی وصیت کمال رازداری میں بدستِ خود تیار کی تھی، لیکن نہ معلوم وہ کاغذ کس شاطر کے ہاتھ لگا! ہم جیسے شاگردوں کی کم نصیبی یہ رہی کہ قمر صاحب کی تدفین میں بھی شریک نہ ہو سکے۔

پھر اگلے برس ڈاکٹر محمد حسن جیسے عبقری کا خاتمہ۔ میرے استاد وہ کبھی نہیں رہے، کسی قدر کڑوے اور No-Nonsence قسم کے پروفیسر ہونے کی بنا پرے بھی ان کے نزدیک نہ جا سکا۔ لیکن آخری زمانے میں مجھے اپنے گھر ماڈل ٹاؤن بلانے گئے تھے، جہاں جیل خانے جیسی تہذیب میں ہم دونوں گپ شپ کرتے۔ اس دور میں حسن صاحب لکھنؤ، کراچی اور علی گڑھ کے پرانے رفیقوں کو درد بھرے خطوط لکھ کر یا فون کر کر کے دل کا بوجھ ہلکا کرتے اور اکثر جوش کا شعر پڑھتے ۔

رفیق جام اٹھا ذکرِ مدّعی موقوف   کسے ہے فرصتِ بغض و دماغِ کینہ گری

بے لوث شخص تھے اور ہمیشہ اردو کے فروغ کی ایک دو تجویزیں ان کے پاس ہوتیں۔ زندگی بھر کرائے کے مکان میں رہے اور تنخواہ پر اپنوں کا غاصبانہ قبضہ جھیلتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد ٹریجڈی یہ ہوئی کہ ۲۰۱۰ء میں بارشیں اس قدر ہوئیں کہ آئی ٹی او قبرستان میں ان کی کچی قبر جس کو برسات بعد پختہ کرانے کی ذمہ داری میں نے اپنے سر لی تھی، نشیب میں ہونے کی بنا پر عنتر بود ہو گئی۔ ڈاکٹر انتظار مرزا (دیال سنگھ کالج) نے بھی قبر کی نگہداشت کا وعدہ کیا تھا کہ حسن صاحب کے عقیدت مندوں میں تھے، دو چار مہینے ہی ہارٹ اٹیک کا شکار ہو گئے۔ ایک بار ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی، جنھوں نے حسن صاحب کے انڈر پی ایچ ڈی کیا تھا، میرے ساتھ قبر ڈھونڈنے گئے لیکن وہاں تو دلدل بن چکی تھی۔

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر شریف احمد اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی بھی میرے اساتذہ تھے، نستعلیق، فرض شناس اور عالم لوگ تھے۔ لیکن ان کی ذاتوں میں قمر صاحب والی بین الاقوامیت نہیں تھی، پھر علوی صاحب تو بڑے درویش مگر انتہائی بے ترتیب قسم کے انسان تھے۔ استاد تو خواجہ احمد فاروقی بھی تھے لیکن نہایت انگریز نما اور بیوروکریٹ ٹائپ فارمل مزاج والے، بچھرایوں ہی کے ایک زمیندار خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی کے بانی اور معمار تھے لیکن ہم جیسے بے بضاعتوں کو اپنے اطراف میں پھٹکنے نہیں دیتے تھے۔ یونی ورسٹی کے نہایت بارسوخ پروفیسر تھے۔ مگر ان کا زوال بھی اسی قدر شدید ہوا۔ آخری برسوں میں یکہ و تنہا رہ گئے تھے۔

آج بھی میرے موبائل میں کچھ ایسے نمبر محفوظ ہیں جن کو حذف کرنے کا حوصلہ اپنے اندر نہیں پاتا۔ یہ وہ لوگ تھے، جو قمر رئیس صاحب جیسے نزدیکی تو نہیں تھے، لیکن ان سے ایک بڑا ذاتی نوعیت کا تعلق خاطر قائم ہو گیا تھا۔ دوری کا ہی۔

فون کی اس فہرست میں پہلا اسم ڈاکٹر نارائن سنگھ غافل دہلوی کا ہے۔ میرے کالج میں فلسفے کے استاد تھے اور اردو کے شیدائی۔ نجف گڑھ کے جاٹ تھے۔ بچپن جرائم پیشوں کے درمیان گزارا، ایک زمانے میں کالج میں ریوالور لے کر آتے تھے لیکن اندر سے موم کی طرح ملائم اور شفقت کے پیکر۔ ۱۹۹۳ء میں عارضی لیکچرر لگا تو سینئر ہونے کے باوجود سب سے زیادہ حوصلہ افزائی کرتے، اپنا کلام سناتے اور گھر کی نشستوں میں بھی مدعو کرتے۔ درویش مزاج انسان تھے، ہمیشہ دو چار شاگروں کی غزلوں پر اصلاح دیتے نظر آتے کہ پلندہ ساتھ رکھتے تھے، علم عروض پر ایک کتاب کا ڈول ڈال رہے تھے کہ ۱۹۹۷ء میں ریٹائر ہو گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی فون کرتے رہتے اور کئی برس آنا جانا لگا رہا۔ ایک دن یونی ورسٹی ہاسپٹل کے ڈاکٹر دوست شام کو فارغ ہو کر سنٹرل لائبریری میں ملے تو بتایا کہ بسلسلۂ علاج ایک مریض غافل دہلوی آئے تھے، نام سے مسلمان اور بیوی ہندو لگتی تھیں! میں نے اصلیت بتائی تو خوش ہوئے، کیونکہ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اور شاعری کے دلدادہ ہیں۔ بات رفت گذشت ہو گئی، دیکھنے نہ جا سکا۔ اگلے ہفتے اسٹاف روم میں خبر آئی کہ غافل صاحب کا انتقال ہو گیا۔ آج بھی غافل صاحب سے شرمندہ ہوں کہ ان کی آخری رسوم میں شریک نہ ہو سکا اور وہ گزر بھی گئے۔ ان کی کتاب اور غیر مطبوعہ کا بھی نہ معلوم کیا حشر ہوا؟

اسی قبیل کا ایک فون نمبر افسانہ نگار علی امام نقوی کا ہے۔ میں ۱۰-۲۰۰۸ء میں افسانے کا انتخاب مرتب کر رہا تھا کہ انیس امروہوی سے نمبر لے کر نقوی صاحب سے بمبئی رابطہ کیا، دعا سلام ہوئی، ان کے شاہکار، ڈونگر واڑی کے گدھ، کی اشاعت کی اجازت مانگی تو بخوشی اجازت بھی دی اور اپنی کتابیں بھی بھیجیں۔ اصلاً عبداللہ پور ز د میرٹھ کے رہنے والے تھے اور وطن مالوف کا ذکر بڑی حسرت سے کرتے تھے۔ تکلیف دہ واقعہ یہ ہوا کہ جب اپریل ۲۰۰۹ء میں استادِ محترم قمر رئیس صاحب کی وفات ہوئی تو بمبئی سے علی امام صاف کا فون آیا کہ ان کی موت کی خبر پڑھ کر سوچتا رہا کہ اتنی پرانی ملاقاتیں تھیں، اب نہ ان کے گھر کا فون نمبر میرے پاس ہے اور نہ ہی میں بیگم صاحبہ سے تعارف رہا، چنانچہ انھوں نے مجھے ہی بطور نزدیکی، قمر صاحب کا پرسہ دیا، مایوسی و اداسی بھرے قصے سناتے رہے۔ کسے پتہ تھا کہ پانچ سال بعد وہ خود ملکِ عدم کو روانہ ہو جائیں گے؟ انھوں نے تو قمر صاحب کا پرسہ مجھے دیا تھا، اب ان کا پرسہ میں کسے دوں! دسمبر ۲۰۱۵ء میں بمبئی گیا تو الیاس شوقی، سلام بن رزاق اور محمد اسلم پرویز سے علی امام نقوی کا ذکر کرتا رہا۔ ذکر تو سریندر پرکاش کا بھی رہا کہ وہ بھی بڑا بے لوث اور انا پرست ادیب تھا، لیکن کبھی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ ادھر ہماری زبان، میں سلام بن رزاق نے سریندر پر ایک جذباتی سا مضمون لکھا تو میں فون پر سلام بن رزاق سے باتیں کرتا رہا کہ ان کو سریندر پرکاش جیسے سرکردہ افسانہ نگار پر مونوگراف لکھنا چاہیے۔

رفتگاں کی اس فہرست میں کشمیر یونی ورسٹی کے جوانا مرگ پروفیسر مجید مضمر کا اسم بھی ہے۔ کیا پیارا اور

منکسر المزاج انسان تھا کہ جب بھی سری نگر اُس کے شعبے جاتا، باہر سڑک تک ساتھ آتا اور میری حیثیت سے بڑھ کر توصیف کرتا۔ آخری ملاقات جموں یونی ورسٹی میں شہاب عنایت ملک کے منٹو سیمی نار میں، شاید ۲۰۱۳ء میں ہوئی تھی۔ کیا خوب پرچہ پڑھا اور داد لوٹی تھی ظالم نے۔ آج نہ کوئی مجید مضمر کو داد دینے والا ہے اور نہ ہی اُس کا یہاں دلّی میں کوئی نام لیوا، کیونکہ گوشہ نشین انسان تھا۔ اسی شعبے میں ایک اور خوش مزاج فرید پربتی بھی تھا، ملنسار اور ہنس مکھ، کتابوں پر کتابیں لکھتا رہتا تھا۔ نئی کار خریدی تو ہم کو سری نگر کی سیر کرائی۔ ڈل جھیل پر گوشتابہ کھلایا۔ دلّی آتا تو فون ضرور کرتا، وہ بھی اچانک عارضۂ قلب کا شکار ہو گیا، اب میں کس کو فون کروں اور فرید پربتی کا پُرسہ کس کو دوں۔ کیسی پہاڑ سی ذات خاک میں مل گئی!

یہ وفاتیہ تحریر منشا یاد کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ ۲۰۱۰ء میں اکادمی ادبیات سیمی نار میں اسلام آباد گیا تھا، مراسلت اُن کے افسانوں کے حوالے سے قائم ہو چکی تھی۔ وہاں منشا نے مجھے اس شفقت سے اپنایا جیسے کوئی گم شدہ عزیز سالوں بعد ملا ہو۔ منشا بڑا ضابطہ بند اور منظم انسان تھا، سارے اسلام آباد کی ذمہ داری اپنے سر لے رکھی تھی اور جب اُس کا شاہکار افسانہ ایک سائیکلو اسٹائل وصیت نامہ، پڑھا تو پتہ چلا کہ یہ بابو گوپی ناتھ نما ہلکا پھلکا انجینئر کس بری طرح قوم کے درد میں گرفتار ہے۔ جس سرزمین پر صرف پاک انسانوں کی شہریت طے کی گئی تھی، آج وہاں انسانی لہو کے پیاسے درندے بڑی تعداد میں گھس آئے ہیں۔ جب میں افسانوں کا انتخاب 'برصغیر میں اردو افسانہ' مرتب کر رہا تھا تو مرزا حامد بیگ اور ڈاکٹر رشید امجد سے تعارف کا فریضہ منشا یاد ہی نے انجام دیا تھا۔ ویسے تو تینوں کی مثلث سے غائبانہ مراسلت گوگل کا فرشتہ پیغام رسانی، قبل ہی سے انجام دے رہا تھا۔ اسلام آباد میں جتنے دن رہا یا تو عاصم بٹ کے ساتھ رہا یا منشا یاد کے گھر 'افسانہ منزل' میں۔ اتنا کم سخن اور نرم دل گفتگو پنجابی آج تک نظر سے نہیں گزرا۔ یوسف چودھری کا افسانہ شامل انتخاب کیا تو اُس مرحوم کے کوائف کی ضرورت پڑی، یہ ضرورت منشا یاد نے ایک نوجوان ادیب کو یوسف چودھری کے گھر راولپنڈی بھیج کر پوری کرائی۔ جب اکتوبر ۲۰۱۱ء میں اچانک منشا یاد کا انتقال ہوا، اُس دن میں خود افسانہ نگار خاتون نگار عظیم کے آرٹسٹ شوہر عظیم صدیقی کی تدفین میں شریک تھا کہ جامعہ اسلامیہ کے قبرستان میں مرزا حامد بیگ کا فون آیا کہ 'یار، منشا گزر گیا' میں سناٹے میں آ گیا۔ مرزا حامد بیگ کی آواز لڑکھڑا رہی تھی، اُدھر میں عظیم صاحب کی قبر کو مٹی دے رہا تھا اور منشا یاد کا ماتم کر رہا تھا۔ ملک الموت کو دونوں کو ایک ہی دن اٹھانا تھا۔ کیا ستم ہے!

میرا تعلق تو عظیم صاحب کے والد حافظ عبدالحفیظ صاحب سے بھی تھا، جو خطاط تھے اور ۱۹۸۷ء میں میری کتاب 'عرفی دہلوی' انھوں نے ہی لکھی تھی۔ پابند صوم وصلوٰۃ اور شاعرانہ مزاج رکھتے تھے، کبھی کبھی لال پری سے بھی شغل کر لیا کرتے تھے، وہ بھی اب منوں مٹی کے نیچے آسودہ ہیں۔

پاکستان کے تعلق سے متوفین کی ایک پوری فہرست یاد آتی ہے۔ ۱۹۸۷ء میں بسلسلۂ ریسرچ لاہور گیا تھا، جہاں منشا یاد ہی جیسی ایک شفیق شخصیت، ڈاکٹر آغا سہیل نے مجھے اپنی ذمہ داریوں میں شامل کر لیا تھا۔ وہ ایف سی کالج میں صدرِ شعبہ تھے، جہاں کرشن چندر نے ۱۹۴۷ء سے قبل انگریزی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ مرحوم لکھنو کے پرانے ترقی پسند تھے، مجاز، محمد حسن، اقبال مجید، عابد سہیل، قمر رئیس، یوسف ناظم اور شارب ردولوی کے گروپ

سے وابستہ تھے۔ وہ مجھے بیکس کو گھر کھانا کھلاتے، شہر کے ادیبوں کو فون کر کر کے مجھے اُن کے پاس روانہ کرتے۔ انہی ادیبوں میں برکالونی کی بہنوں، جمیلہ ہاشمی اور سائرہ ہاشمی کے بنگلوں کی دیوار مشترک تھی، لیکن دلوں میں سنگین فاصلے حائل... لاچار دونوں سے چھپ کر ملا اور دونوں سے ناولوں کے تحفے وصول کیے۔ جمیلہ ہاشمی بھاری بھرکم خاتون تھیں، جن کی شادی علاقہ ملتان کے کسی گدی نشین پیر سے ہوئی تھی۔ بیٹی عائشہ صدیقہ اُن دنوں سول سروس C.S.P کی تیاری کر رہی تھی۔ ماں نے بیٹی کو بلایا اور میرے بٹھا کر کہا کہ "یہ انڈیا سے آئے ہیں، ان سے بات کرو تاکہ معلومات حاصل ہو۔" عائشہ سے کیا بات چیت ہوئی، اب یاد نہیں، لیکن بعد میں پتہ چلا کہ یہ لڑکی تو باپ کے مرنے کے بعد ان کی گدی پر باقاعدہ پگڑی بندھ کر بیٹھتی ہے، کمال یہ ہے کہ C.S.P پاس کر کے کسی بڑے عہدے پہنچی اور پھر ایک دن بیوروکریسی کو ٹھکرا کر جرنلسٹ بن گئی اور فوج کے کاروباری معاملات پر Military Incorporated جیسی دھماکہ خیز کتاب لکھی۔

۱۹۸۷ء ہی کی گرمی میں ڈاکٹر وزیر آغا کی کوٹھی پر دعوتِ آم میں شریک ہوا، جہاں مستنصر حسین تارڑ، انور سجاد، ڈاکٹر انور سدید، پروفیسر صابر لودھی، فرخندہ لودھی اور الطاف فاطمہ وغیرہ سے نشست رہی۔ صابر لودھی، فرخندہ لودھی ۱۹۴۷ء کے گرداس پور فسادات میں نیم زندہ بچے تھے اور زن و شوہر گورنمنٹ کالج میں پروفیسر اور لائبریرین تھے۔ یہی گورنمنٹ کالج، جہاں علامہ اقبال، پطرس بخاری اور فیض احمد فیض استاد رہ چکے تھے، اب گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی بن گیا ہے۔ بحکم فوجی حاکم جنرل مشرف! الطاف فاطمہ، نشاط فاطمہ دونوں بہنیں، فکشن نگار اور جانوروں کی نفسیات پر افسانے (شیر کیا سوچتا ہوگا وغیرہ) لکھنے والے سید رفیق حسین کی بھانجیاں تھیں۔ انور سدید پیشے سے انجینئر'اوراق' کے معاون مدیر حاسدین اُن کو'وزیر آغا کا ادبی مزارعہ' کہتے تھے۔ بڑے ریحان رنج قسم کے آدمی ہیں اور نکھاڑ۔ آج صابر لودھی، فرخندہ لودھی، الطاف فاطمہ، نشاط فاطمہ اور جمیلہ ہاشمی زیر زمین جاچکے ہیں۔ موت سے کس کو رستگاری ہے۔

بے ادبی ہوگی اگر ڈاکٹر وزیر آغا کی علمیت اور فرشہ مزاجی کا ذکر ذرا تفصیل سے نہ کیا جائے۔ تنقید میں دھرتی پوجا اسکول کے بانی اور خاتم تھے اور'شب خون' کے پہلو بہ پہلو جدیدیت کا مبلغ جریدہ'اوراق' بھی جاری کیا۔ دلی میں شہرت تھی کہ اتنے بڑے زمیندار ہیں کہ اُن کے کھیتوں سے ٹرین بڑی دیر تک گزرتی ہے۔ میں نے یہ لطیفہ سنایا تو تبسم کیا اور بولے "پرسوں میرے پنڈ وزیر کوٹ آؤ اور خود دیکھو میری جاگیر۔" میں ہوں مصیبتیں کھینچنے کا بچپن سے عادی۔ ریٹائرڈ خورشید چچا کو ساتھ لیا اور گرتا پڑتا پہنچ گیا وزیر کوٹ، سراستہ سرگودھا۔ گاؤں وزیر کوٹ اُن کے اجداد نے انگریزوں کی'گھوڑی پال اسکیم' کے تحت آباد کیا تھا۔ یعنی انگریز حکومت پنجاب کو مقامی اشرافیہ کو مشرقی خطے میں مربع الاٹ کرتی تھی، جس کے بدلے انگریزی فوج کے لیے گھوڑے اور جنگ کی صورت میں جبری بھرتی کر کے جوان بھیجنے ہوتے تھے۔ انھوں نے بایوگرافی'شام کی منڈیر سے' مجھے دی، جس میں یہ تفصیل بھی درج ہے۔ تین دن اُن کا مہمان رہا، مرغے اور کنو کھاتا رہا، لیکن ریل کی پٹری تو کہیں نہیں تھی۔ وڈیرے تو وہ نہیں تھے، لیکن اتنا پڑھا لکھا اور نیک زمیندار پاکستان میں کوئی دوسرا نہ ہوگا۔ وزیر آغا کی موت ایک تحریک، ایک نظریہ فکر اور اردو کلچر کی اہم علامت کی موت تھی۔

کراچی والوں کے بغیر پاکستان کی بات کہاں مکمل ہو سکتی ہے؟ کراچی کے ترقی پسندوں میں شوکت صدیقی، محمد علی صدیقی، پروفیسر عتیق احمد، رفیق چودھری، راحت سعید، مسلم شمیم اور مظہر جمیل وغیرہ سے دہلی، کراچی اور اسلام آباد کے بھی ناروں میں ہوئیں۔ شوکت صدیقی ۱۹۸۶ء میں تحریک کی گولڈن جوبلی کی تقریب میں آئے تھے، ہم والنٹیروں میں تھے اور ان کا بے داغ سفید سوٹ آج تک نقش ہے۔ عتیق احمد اور بیگم فہمیدہ عتیق دلی والے تھے اور شفیق و منکسر المزاج، گو کہ انگریزی کے پروفیسر تھے۔ رفیق چودھری اصلاً پنجاب کے جاٹ تھے اور تحریک کے لیے حبیب جالب کی طرح لاٹھی گولی کھانے والا مزاج رکھتے۔ کراچی میں ان کی پھول پودھوں کی نرسری روزگار بھی تھی اور کامریڈوں کے لیے پولیس سے چھپنے کا ٹھکانہ بھی۔ محمد علی صدیقی اور اشفاق احمد سے ۲۰۱۰ء کی اسلام آباد کانفرنس میں ساری رات باتیں کرتا رہا، ان کا عالمی سیاست کا مطالعہ گہرا تھا اور نظر دُور رس۔ اقبال اور غالبؔ پر ان کے مونوگراف بڑی دیدہ ریزی سے لکھے گئے ہیں۔ جنوری ۲۰۱۳ء کی اسلام آباد اکادمی ادبیات کی کانفرنس میں شرکت کے لیے کراچی ایئرپورٹ کے لیے نکل رہے تھے کہ عارضہ قلب سے چٹ پٹ ہو گئے۔ یہ وہی محمد علی صدیقی تھے جن کو مرحومہ قرۃ العین حیدر نے "امروہے والے محمد علی صدیقی" کے تحقیر آمیز لقب سے ایک مضمون میں مخاطب کیا تھا، لیکن دونوں ہی قبر کی خاک بن کر برابر ہو گئے۔

حمید اختر، ساحر لدھیانوی کے جگری دوست اور سجاد ظہیر کے سائے کی طرح ساتھ رہنے والے کامریڈ تھے۔ ساڑھے چھ فٹ کا قد مگر ضعفِ بصارت، وہ بھی ستمبر ۲۰۱۱ء میں راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ راحت سعید، مظہر جمیل اور مسلم شمیم آج بھی کراچی میں ترقی پسندی کا چراغ جلائے بیٹھے ہیں، لیکن 'ارتقا' تو خاک میں مل چکا ہے، جو معاشرے میں تعقل پسندی کی قندیل کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔

میرے موبائل میں ایک نام شرون کمار ورما کا بھی ہے، جو لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ نہ معلوم کیسے پنجاب سے وہاں پہنچے۔ وکالت امرتسر میں کی، آخری عمر میں سماعت کمزور ہو گئی تھی۔ میں نے انتخاب میں ان کا شاہکار، 'ایک تھا تارا چند' شامل کیا تو فون پر دعائیں دینے لگے۔ نومبر ۲۰۱۲ء میں انتقال ہوا تو زیادہ تر لوگوں کو پتہ ہی نہ چلا۔ کیونکہ آج کا امرتسر امریک سنگھ 'پگڈنڈی' والے کا امرتسر نہیں ہے، جہاں کبھی سعادت حسن منٹو آباد تھا۔

چلیے یہ تو بزرگ ہو چکے تھے، لیکن ساجد رشید کیوں یکا یک جولائی ۲۰۱۱ء میں شعلے کی طرح بھڑکا اور دور کہیں روپوش ہو گیا۔ ساجد رشید نہ صرف 'ایک مردہ سر کی حکایت' اور 'چادر والا آدمی اور میں' جیسے نایاب افسانوں کا خالق تھا، بلکہ وہ اور اس کا رسالہ 'نیا ورق' ایک تحریک تھے۔ جو فرقہ پرستوں اور بنیاد پرستوں سے سیدھی ٹکر لیتا تھا۔ شکر ہے کہ شاداب رشید، محمد اسلم پرویز اور الیاس شوقی 'نیا ورق' کو سنبھالے ہوئے ہیں۔

مضمون سمیٹ رہا تھا کہ پانچ جون ۲۰۱۵ء کو لاہور سے فخر زماں کی گھبراہٹ بھرا فون آیا کہ شوکت خانم کینسر اسپتال میں عبداللہ حسین ختم ہو گیا۔ کیا یہ صرف اتفاق تھا کہ میں اس وقت آئی ٹی او کے قبرستان میں تابندہ کی قبر پر سے خشک پتے چُن رہا تھا کہ یہی خشک پتے زوال اور موت کی علامت ہوتے ہیں۔

میری سمجھ میں اب بھی نہیں آرہا ہے کہ رفتگاں کے فون نمبروں کا کیا کروں؟

کیا خالد جاوید کو فون کروں کہ وہ حقیقت کی افہام و تفہیم کا جادوگر ہے؟ ■■

گوشہ اسد محمد خاں

اسد محمد خاں ان تخلیق کاروں میں سے ہیں جن کی تخلیقی جہات ایک سے زیادہ ہیں اس لیے ان کے تخلیقی سرچشموں تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔ وہ جتنے اچھے افسانہ نگار ہیں اتنے ہی اچھے شاعر بھی ہیں۔ اُن کے فن کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ افسانہ نگاری میں انھوں نے نہ کسی مخصوص موضوع کو اپنی تخلیقی سرگرمیوں کا حصہ بنایا ہے نہ ہی اپنے تخلیقی اظہار کے لیے کسی ایک مخصوص اسلوب کو اپنایا ہے۔ انھوں نے سادہ بیانیہ میں اگر باسودے کی مریم اور 'مئی دادا' جیسی غیر معمولی کہانیاں لکھی ہیں تو علامتی اسلوب میں 'غصے کی نئی فصل' اور 'ترلوچن' جیسی کئی کامیاب کہانیاں بھی لکھی ہیں جو اسلوب پر ان کی گرفت کی ضامن ہیں۔ مبین مرزا نے ان کی افسانہ نگاری پر بہت اچھا مضمون لکھا ہے جو اُن کے فن کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتا ہے لیکن ان کے فن پر ابھی اور بہت کچھ لکھنے کی گنجائش باقی ہے جس پر لکھا جانا چاہیے۔ (الیاس شوقی)

رانا محمد آصف

"ظلم پر کڑھتا ہوں لیکن اسے اپنی کہانی میں اشتہار نہیں بناتا۔"

آپ اُن کی کوئی بھی کہانی پڑھنا شروع کریں، اس کے کرداروں سے آپ کی ایک جذباتی وابستگی ہو جائے گی۔ محبت، نفرت، غصہ، رحم؛ جذبہ چاہے جو بھی ہو مگر دامن دل کو اس کوچے سے بچالے جانا آسان نہیں۔ کہانی کے اتنے بھرپور کردار کہ قاری تخیل میں انھیں چلتے پھرتے، بولتے، ہنستے، روتے دیکھتا ہی نہیں بلکہ مہارت سے بنے ان کے بیانیے میں وہ ان کرداروں کا جیسے لمس محسوس کرنے لگتا ہے۔ چہرے پورے تاثر کے ساتھ اس کے خیال میں ابھرتے ہیں، ایک دنیائے خواب، جس میں وہ منظر در منظر اُترتا جاتا ہے۔ جو کاری گری ایک مصور شیڈز کے استعمال سے دکھاتا ہے، ان کے ہاں لفظوں کی صورت گری بھی کچھ اسی ڈھب پر ہوتی ہے۔ یہ تذکرہ ہے اردو کہانی کے ایک عہد کا، جسے ہم اسد محمد خاں کے نام سے جانتے ہیں۔

وہ بانی ریاست بھوپال، سردار دوست محمد خاں کی نویں پیڑھی میں، ۲۶ دسمبر ۱۹۳۲ کو پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق قبیلہ اورک زئی کی شاخ میر عزیز خیل سے ہے۔ والد، عزت محمد خاں شاہ جہانی ماڈل ہائی اسکول، بھوپال میں آرٹ ماسٹر تھے۔ ان کے دس بہن بھائی تھے۔ اسد محمد خاں نے شاہ جہانی ماڈل اسکول سے ۱۹۴۹ء میں میٹرک کیا اور بعدازاں حمیدیہ کالج میں داخلہ لے لیا۔ والد صاحب مصوری کرتے تھے جنھیں دیکھتے دیکھتے ابتدائی عمر ہی میں اس فن سے لگاؤ پیدا ہوا۔ مہارت حاصل کرنے کے لیے بھوپال میں رہتے ہوئے جے جے اسکول آف آرٹس سے فری ہینڈ ڈرائنگ

میں ڈپلوما کیا۔ عہد نوجوانی میں اسد محمد خاں سوشلسٹ فکر سے متاثر ہوئے، کچھ عرصہ کمیونسٹ تحریک سے وابستگی رہی، میٹنگز میں شرکت کی اور ایک مرتبہ موتی مسجد کی دیوار پر پوسٹر لگاتے ہوئے گرفتار ہوئے۔ گھر والوں نے بہتیرا سمجھایا مگر سولہ روز تک اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ آخر کار بزرگوں کے پندونصائح کارگر ثابت ہوئے اور ان سے ایک معافی نامہ لکھوا دیا گیا۔ اس واقعے کے بعد ان کے اہل خانہ ان کے کامریڈ ساتھیوں سے شدید خفا تھے دوسری جانب کامریڈ اسد محمد خاں سے ناراض۔ حالات کچھ ایسے ہوئے کہ والد نے انھیں پاکستان بھجوا دیا۔ ۱۹۵۰ء میں اسد محمد خاں لاہور آئے اور وقفے وقفے سے ڈیڑھ برس کا عرصہ یہاں گزارا۔ پھر کراچی کا رخ کیا، اب تک یہیں سکونت پذیر ہیں۔ کراچی آنے کے بعد ایس ایم آرٹس کالج سے گریجویشن کی اور بعد ازاں جامعہ کراچی کے شعبہ انگریزی میں داخلہ لیا۔ ۱۹۶۳ء میں کراچی پورٹ ٹرسٹ میں ملازمت کا آغاز کیا۔ انسپکٹر امپورٹس کی حیثیت سے ۱۹۹۳ء میں ریٹائر ہوئے۔ اسد محمد خاں کے پہلے ہی افسانے "باسودے کی مریم" نے ادبی حلقوں میں دھوم مچا دی تھی۔ یہ افسانہ "فنون" میں شایع ہوا، اسی پرچے میں ان کا ایک اور شاہ کار "مئی دادا" بھی شایع ہوا اور اس کے بعد یہ صاحب اسلوب کہانی کار اردو کہانی کے گیسوئے تاب دار کو اور بھی تاب دار کرتے چلے گئے۔ ان کی پہلی کتاب "کھڑکی بھر آسمان" ۱۹۸۲ء میں شایع ہوئی جس میں افسانوں کے ساتھ نظمیں بھی شامل تھیں۔ ۱۹۹۰ء میں افسانوی مجموعہ "برج خموشاں" منظر عام پر آیا۔ ۱۹۹۷ء میں افسانوی مجموعہ "غصے کی نئی فصل"، گیتوں کی کتاب "رُکے ہوئے ساون" (گیت) شایع ہوئے۔ ۲۰۰۳ء میں "نربدا اور دوسری کہانیاں" شایع ہوئی۔ ۲۰۰۶ء تک تحریر کردہ افسانوں کا مجموعہ "جو کہانیاں لکھیں" کے نام سے قارئین تک پہنچا۔ اس مجموعے میں "ٹکڑوں میں کہی گئی کہانی" کے زیر عنوان سفرنامے اور تحریریں بھی شامل تھیں۔ ۲۰۰۶ء ہی میں "تیسرے پہر کی کہانیاں" اور ۲۰۱۰ء میں "ایک ٹکڑا دھوپ کا" کی اشاعت ہوئی۔ اسد محمد خاں کی تخلیقات کا ترجمہ انگریزی، ہندی، گجراتی، پنجابی، مراٹھی اور دیگر زبانوں میں ہو چکا ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے The Harves of Anger & Other Stories کے زیر عنوان ان کی ۱۲ کہانیاں انگریزی روپ میں شایع کیں۔ اعزازات کی بات کی جائے تو افسانوی مجموعے "نربدا" کو ۲۰۰۳ء کی بہترین تصنیف کا بابائے اردو ایوارڈ ملا۔ دوحہ کا فروغ ادب ایوارڈ اور شیخ ایاز ایوارڈ کے علاوہ انھیں تمغۂ امتیاز بھی پیش کیا گیا۔ افسانے اور کہانی کی طرح گیت نگاری میں بھی منفرد مقام بنایا۔ ریڈیو اور ٹی وی کے لیے قریباً ڈیڑھ سو گیت لکھے جن میں سے "انوکھا لاڈلا"، "موج بڑھے یا آندھی آئے"، "زمین کی گود رنگ سے، امنگ سے بھری رہے" اور "تم سنگ نیناں لاگے" ایسی مثالیں ہیں جو آج بھی سننے والوں کے دل و دماغ پر نقش ہیں۔ ڈراما نگاری میں بھی اپنا لوہا منوایا۔ "منڈی"، "الزام"، "سفر"، "دل دریا"، "پارٹیشن ایک سفر"، "زبیدہ" اور "شیر شاہ سوری" نے خوب داد سمیٹی۔ ان کا مقبول ترین ڈراما "شاہین" رہا۔ اردو کے اس ہمہ جہت عہد ساز ادیب کے ساتھ گذشتہ دنوں ہونے والے مکالمے کی روداد نذر قارئین ہے۔ ان کی کہانیاں تو بہت پڑھیں آئیے اس کہانی کار کو بھی پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سوال: آپ کیوں لکھتے ہیں؟

اسد محمد خاں: اصل میں ہر ایک کا ماحول ہوتا ہے۔ میرے والد پیشے کے اعتبار سے مصور تھے۔ مجھے آٹھ سال کی عمر میں مجھے بھی مصوری کا شوق ہو گیا تھا۔ جے جے اسکول آف آرٹس سے ایک ڈپلومہ بھی کیا۔ ہمارے والد نے مناظر زیادہ پینٹ نہیں کیے، حالاں کہ بھوپال بہت خوب صورت جگہ تھی۔ انھوں نے زیادہ تر مصوری

میں پورٹریٹس بنائیں۔ اس میں وہ مختلف میڈیمز استعمال کرتے تھے، زیادہ تر وہ آئل پینٹ اور کینوس پر پینٹ کرتے تھے۔ ہمارے گھر میں آئل پینٹ کی بو بسی رہتی تھی، جو ہم بچوں کے لیے اتنی پسندیدہ تھی کہ جب ہم چھٹیوں میں کہیں چلے جاتے تھے تو لگتا تھا کہ ہم کوئی بنیادی چیز مس کر رہے ہیں۔ پھر ایک زمانہ وہ آیا کہ والد صاحب کا رجحان مذہبیت کی طرف ہوگیا اور مصوری انھوں نے چھوڑ دی، لیکن ہمیں نہیں روکا۔ یعنی ان کے جو بچے پینٹ کر رہے تھے انھیں اس طرح کی کوئی تبلیغ نہیں کی کہ بھئی آدمیوں یا جانداروں کی تصاویر نہ بناؤ۔ میرے دونوں بھائیوں کو بھی یہی شوق تھا۔ ہم نے یہ دیکھا کہ والد جب کسی منظر کو کسی موٹے اچھے کاغذ پر پینٹ کرتے ہیں تو کریان سے اس کی آؤٹ لائن بناتے ہیں، جب فرصت میں ہوتے تو اس کے رنگ ابھارتے، کہیں دھیمے کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ یہ بتاتے تھے کہ مصوری ہمیشہ دو کیفیات کو بیان کرتی ہے، ایک وہ جو آپ کو اپنی آنکھوں سے نظر آ رہی ہیں دوسری، جو آپ اس منظر، انسان، پرندے، پہاڑی، یا اس پھول کے لیے دل میں محسوس کرتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ ٹھیک ہے کہ گلابی رنگ کی چڑیا کو میں گلابی رنگ دوں گا، لیکن اس وقت جو روشنی اس پر پڑ رہی ہے تو میں محسوس کر رہا ہوں کہ یہ رقص میں ہے۔ تو اس کے کچھ حصوں کو وہ روشن کر دیتے جس طرح پرندے کے پروں پر دھوپ پڑتی ہے، اور کچھ حصوں کو وہ سائے میں لے جاتے۔ پھر ہمیں کہتے کہ دیکھو میں نے اس پر محنت کی، اور اب اسے دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی جشن کے مرحلے میں ہے، شاید بہار آنے والی ہے۔ ایک آدمی آپ نے بنا دیا، اس کی شباہت آگئی تو بات ختم ہوگئی، لیکن وہ آدمی کس قدر غصہ ور، کیسا دلیر ہے یا کتنا دھیما ہے، یا یہ گائیک ہے تو اس کی آنکھوں میں ایک نمی ہے، ایسا لگتا ہے کہ وہ کوئی اُداس گیت کہنے یا سنانے والا ہے اور شاید سناتے ہوئے رو پڑے گا۔ یوں وہ مصوری کو بیان کرتے تھے۔ نویں دسویں کا طالب علم جتنا چیزوں کو سمجھ سکتا تھا، میں سمجھتا تھا۔ جب انھوں نے مصوری کا سارا سامان پیک کر کے رکھ دیا اور وہ تبلیغی دوروں پر جانے لگے، میرے لیے وہ بڑا اُداسی کا زمانہ تھا۔ وہ ہمیں بھی لے جاتے تھے۔ لیکن کبھی یہ نہیں کہا کہ تم تصویریں مت بناؤ۔ بلکہ ایسا بھی ہوا کہ میں اپنے دوستوں میں سے کسی کی پورٹریٹ بنانے لگا تو چلتے ہوئے ایک فقرہ انھوں نے کہہ دیا کہ اس میں بیک گراؤنڈ تم ہلکے ہاتھ سے کرو ورنہ اس کے چہرے پر جو تاثرات ہیں وہ دب جائیں گے۔ یہ کشادہ دلی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ فائن آرٹس کا تحفہ تھا، جو ان تک پہنچا۔ ہم کبھی تو ان کے ساتھ تبلیغی دوروں پر جاتے تھے اور کبھی بہانا بنا دیتے تھے۔ سترہ ساڑھے سترہ برس کی عمر میں پاکستان آیا۔ مصور کے وسائل تھے نہیں، مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ سول اسپتال کے مقابل ایک پارسی کی بہت کمال کی دکان تھی جس میں مصوری کا سامان بکتا تھا۔ میں دفتر آتے جاتے کبھی اس کا شوروم دیکھنے جاتا تھا۔ میں ان سارے اوزاروں کو پہچانتا تھا۔ ان کی قیمتیں دیکھتا تو بہت اُداس ہو جاتا۔ اس لیے کہ میں وہ خرید نہیں سکتا تھا۔ سیکڑوں روپے کا ایک پیکٹ بنتا تھا جب کہ میری تنخواہ سو سوا سو روپے تھی۔ یہ بات میں نے اپنے خط میں کسی بہن بھائی کو لکھ دی۔ والد صاحب نے جواب میں خود تو نہیں لکھا، انھیں کہہ دیا کہ اپنے بھائی سے کہو کہ یہ اوزار اور رنگ وغیرہ ہی تخلیق کی بنیاد نہیں، یہ تو ایک سپورٹ ہے۔ جو چیزیں تم دیکھتے ہو، انھیں بیان کیوں نہیں کرتے؟ انھیں معلوم تھا کہ میں کبھی نثر لکھتا تھا۔ نویں دسویں میں اسکول کے میگزین کے

لیے میں نے دو یا تین مضامین لکھے تھے، ایک طنزیہ تھا اور ایک تصوراتی مضمون مہاتما گاندھی کی موت پر۔ وہ اسی اسکول میں آرٹ ماسٹر تھے۔ یعنی ان کا اشارہ یہ تھا کہ تم نثر لکھو، اپنے خیالات کو لفظوں میں ایکسپریس کرو، اور جب خدا توفیق دے، وسائل ہو جائیں تو مصوری بھی کرو۔ تو وہ بات دل میں جم کر رہ گئی۔ میں مطالعہ پابندی سے کرتا تھا۔ پی آئی بی کالونی میں ہم لوگ ایک عزیز کے ہاں رہتے تھے، ٹاور تک آتے آتے گھنٹہ لگتا تھا۔ وہ اُس زمانے کا سب سے بڑا بس روٹ تھا۔ تو سفر میں کتاب پڑھتا تھا اور زیادہ تر فکشن۔ اسی دور میں اکا دکا مصرعے گیت کے ذہن میں بننا شروع ہوئے، تو میں نے گیت لکھنا شروع کر دیا، اس بات سے بے نیاز تھا کہ انھیں کہیں چھپوایا جائے یا نہیں۔ یہ زمانہ ۵۶-۵۵ کا ہوگا۔ پہلا گیت لکھا تھا ''میں وندھیاچل کی آتما'' دوستوں کا اصرار تھا کہ یہ گیت کہیں شایع ہونے کے لیے دیا جائے، یہ جمیل جالبی صاحب کے پرچے 'نیا دور' میں شایع ہوا۔ قمر جمیل کو پہلا افسانہ 'باسودے کی مریم' لکھ کر سنایا۔ اطہر نفیس کے بھائی کے ہاں احمد ندیم قاسمی تشریف لائے ہوئے تھے۔ وہاں یہ افسانہ پڑھا۔ سن کر قاسمی صاحب آبدیدہ ہو گئے۔ کہنے لگے کہ یہ ''فنون'' کی کہانی ہے، ہمیں دے دیجیے۔ ''مئی دادا'' لکھنے میں ایک سال لگا اور وہ بھی فنون میں شایع ہوا۔

سوال: قلم کا سفر شروع ہونے کے بعد مصوری کی طرف کیوں نہیں لوٹے؟

اسد محمد خاں: جی نہیں! پھر موقلم دوبارہ ہاتھ میں نہیں لیا۔ مجھے کمرشل ڈیزائنگ کے لیے ملازمت ملی۔ ایک چھوٹی سی دکان تھی، انھوں نے اخبار میں اشتہار دیا، میں نے انھیں ایک لیٹر بھیج دیا، اپنی ٹریننگ کے بارے میں بتایا۔ انھوں نے فون کر کے بلا لیا۔ وہ صاحب خود بھی جے جے اسکول آف آرٹس میں تربیت پا چکے تھے۔ بہت اچھے آدمی تھے۔ وہ جینی تھے۔ ان کی پیش کش بھی اچھی تھی۔ انھوں نے یہ بتا دیا تھا کہ تخلیقی کام سے زیادہ ہمارے ہاں کمرشل ڈیزائننگ ہوتی ہے۔ ماچس کی ڈبیا کا کور ڈیزائن کرنے کے لیے دیا۔ پہلا دن تو میں نے جیسے تیسے گزار لیا۔ اشتہارات وغیرہ کا کام میں تیزی سے نمٹا دیتا تھا۔ لیکن مصوری کے لیے تخلیقی کام کا موقع نہیں ملتا تھا۔ عام طور پر گاہک کسی مشہور برانڈ کا ریپر لے کر آتے اور کہتے تھے ایسا ڈبہ بنانا ہے تو اس سے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ میں نے پندرہ بیس دن کے بعد ان سے معذرت چاہی، وہ کہنے لگے ہم اور ہمارے کسٹمر آپ کے کام سے مطمئن ہیں، میں نے کہا لیکن میں اپنے کام سے مطمئن نہیں ہوں۔ سو، اجازت چاہی۔ انھوں نے اصرار کر کے پورے مہینے کا اعزازیہ لفافہ میں رکھ کر دے دیا۔ اس کے بعد بھی میں ان کے پاس ہیلو ہائے کہنے جاتا رہا۔ پھر ریڈیو کے لیے خاکے لکھتا رہا۔ قمر جمیل نے کہا کہ ٹھیک ہے خاکے بہت مزے دار ہوتے ہیں لیکن اب مکمل ڈرامے لکھو۔ اس کے بعد ڈرامہ لکھنا شروع کیا۔

سوال: ''باسودے کی مریم'' اور ''مئی دادا'' ابتدائی افسانے تھے اور ماسٹر پیس بھی۔ ان سے شہرت ملی، اس کے بعد کہانیاں افسانے لکھتے ہوئے کبھی یہ خیال پیدا ہوا کہ اب یہ ایک معیار بن چکا ہے اور اس پر پورا اترنا ہوگا؟

اسد محمد خاں: نہیں، بالکل نہیں۔ اس لیے کہ میں ہر شعبے میں اس بات کا قائل ہوں کہ ہر میڈیم کے پورے پورے امکانات کو تلاش کیجیے۔ میں نے بڑی تجرباتی کہانیاں لکھیں۔ ان کے دوسری زبانوں میں

تراجم کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ مثلاً ایک مختصر سی کہانی ہے "ترلوچن"۔ اس پر مجھے ہندوستان کے دوستوں، اللہ بخش مشہور افسانہ نگار انور خان کے خط ملتے رہتے کہ بھئی مراٹھی میں تمھاری اس کہانی کا ترجمہ دیکھا۔ میں نے جو تجربات کیے کئی شعبوں میں اس کا رسپانس ملا۔ یہ علامتی کہانی کا زبردست دور تھا، جس میں رشید امجد جیسے ہمارے سینیئرز نے بہت کام کیا۔ وہ ایک دفعہ کہنے لگے کہ تمھاری کہانیاں بیانیہ ہوتی ہیں لیکن ہم علامتی کہانی لکھنے اور پڑھنے والے بالآخر اس میں الجھ کر رہتے ہیں اور ہمیں اس میں مزہ آنے لگتا ہے۔ میں نے ہر طرح کے پہلو تلاش کیے اور بڑے تجربات کیے۔ مثلاً "سارنگ" ایک کہانی ہے، جس میں "پلس" اور "مائنس" کا مکالمہ ہے وہ کہانی عجیب کیفیت بیان کرتی ہے۔ میرے کام پر اس وقت کئی اسکالر بھی کام کر رہے ہیں۔ جن میں سے کچھ کا کام مکمل بھی ہو گیا ہے۔ ہمارے ہاں زندہ آدمی پر پی ایچ ڈی کی رسم نہیں۔ میرے کام پر یہاں بھی بہت سے لوگوں نے ایم فل کیا ہے۔ علی گڑھ میں عبدالرحمن خاں طالب علم ہیں، ان کا بھی تھیسس پورا ہو گیا ہے۔ اپنی تحریروں پر ہونے والے علمی کام سے بڑی مسرت ہوتی ہے۔ ہم سے بڑے سینیئر لکھنے والوں میں بعض بہت بڑے لوگ تھے، جنھیں زندگی میں بہت دکھ ملے۔ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جنھیں مخصوص حلقے نے تسلیم کیا۔ تو کم سے کم اپنے حوالے سے یہ اطمینان ہے کہ نوجوانوں اور سینیئرز کا ایک گروہ ہے، جو علمی سطح پر میرے کام کو دیکھ رہا ہے۔ اب یہ احساس ہوتا ہے کہ لکھنے میں وہ پہلی جیسی روانی نہیں رہی۔ پہلے میں رات دو ڈھائی بجے تک کام کرتا تھا، اب ایک کہانی پر بھی مہینوں کام کرتا ہوں۔ لیکن شکر گزار ہوں کہ لکھ تو رہا ہوں۔

سوال: ابتداً آپ سوشلسٹ رہے، اس "جرم" میں ماخوذ بھی ہوئے، آپ نے اپنے ماموں، جو پولیس افسر تھے، ان کے سامنے اپنے نظریات کا دفاع بھی کیا، لیکن یہاں آنے کے بعد آپ نظریاتی وابستگی برقرار کیوں نہ رکھ سکے؟

اسد محمد خاں: سندھی ادب میں ہم سے زیادہ سیاسی شعور رکھنے والے شاعر اور ادیب ملیں گے۔ ہمارے ہاں کے چالاک لوگوں نے کمیونزم کو لامذہبیت سے جوڑ دیا۔ یہ وڈیروں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا اٹھایا گیا پورا ریکٹ تھا، جو کامیاب ہوا۔ آج بھی سندھ میں وہ مزاحمت جاری ہے لیکن یہ اس پیمانے کی نہیں۔ دھرنوں کا ماحول بھی آپ نے دیکھا۔ ایک جانب نچلے طبقے کے گرے ہوئے، دبے ہوئے لوگوں کی مزاحمت ہے اور دوسری جانب ایک سلیبریٹی جس نے کھیل میں اپنا نام پیدا کیا، کم سے کم چیزوں کو ان کے صحیح رنگ میں دیکھ رہا ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ سیاست پر کس طبقے کا قبضہ ہے۔ یہی ایک صدی پہلے ہاتھ سے کام کرنے والوں کا خاندان تھا، انھوں نے ریل کی پٹریاں فروخت کیں، اور اپنے آپ کو ایک سلطنت میں بدل دیا۔ یہ ایک چھوٹا سا خاندان ہے، یہاں پورا سیاسی منظر نامہ ایسے لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک ایسا نہیں ہے جس نے محنت کر کے اپنی تحریک کو مڈل کلاس یا لوئر مڈل کلاس تک پھیلایا ہو۔ مزدور اور کسان کی سطح پر تو کوئی کام ہو ہی نہیں رہا۔ ایک تحریک صرف شہر کے لوگوں تک چلی اور ناکام ہو گئی۔ ناکام اس لیے کہ اسمبلیاں بھری پڑی ہیں ایسے لوگوں سے جن کے فارم میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ خدا کا بھی نام لیتے ہیں اور جمہوریت کا بھی۔ لیکن ان کو دیکھ کر ہنسی آتی ہے کہ نہ وہ خدا کے زیر سایہ ہیں اور نہ جمہوریت کے۔ اب دیکھیے یہ

عذاب کب تک چلتا ہے۔ جہاں تک ذاتی زندگی میں عملی جدو جہد کی بات ہے تو آدمی کی ایک زندگی ہوتی ہے، جس میں اسے روزی کمانا ہوتی ہے۔ اور لکھنے والے کو اس کے چند محدود مواقع ہی ملتے ہیں۔ اگر آپ کو ریڈیو میں ترجمہ کار یا خبریں پڑھنے کی نوکری ملتی ہے اور وہاں آپ اپنے نظریے پر بات کریں گے تو فوراً الگ کر دیے جائیں گے، ہوا یہی۔ میں برطانیہ کے لیے جانے والی سروس میں کام کرتا تھا۔ ایک بج کر پانچ منٹ پر پانچ منٹ کی خبریں ہوتی تھیں۔ بڑے مشہور لوگوں نے وہاں کام کیا۔ رات کو وہاں ادیبوں شاعروں کا اجتماع ہوتا تھا تو ان میں سے کوئی کہتا تھا کہ آہستہ بات کرو کہ کچھ پتا نہیں کہاں سے کوئی سنے اور رپورٹ کر دے۔ اور ایسا ہوتا تھا کہ صاحب فلاں آدمی ریڈیو میں لامذہبیت کی تبلیغ کر رہا ہے تو اسے دوڑا دیا جاتا تھا۔ تو ایک تو رزق نے آدمی کو باندھ کے رکھا ہے، مڈل کلاس کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔ میں اگر مزدور ہوتا تو پھر کسی تحریک میں حصہ لیتا، بھلے سے مار دیا جاتا، لیکن تحریک میں چلا سکتا تھا۔

سوال: آپ نے شیر شاہ سوری پر بھی کہانیاں لکھیں، اسکرین پلے بھی لکھا، اس شخصیت میں ایسا کیا ہے؟

اسد محمد خاں: دیکھیے! غلجیوں اور لودھیوں کا دور ہے، ہر آدمی درہ خیبر سے آتا ہے، اور یہ سوچے بغیر کہ جسے میں مار رہا ہوں کلمہ گو ہے، مار دیتا ہے۔ خوب قتل کیے، مسلمانوں نے مسلمانوں کے، بس یہی ہو رہا تھا۔ محمود جس کی ہم بہت تعریف کرتے ہیں، میں کہوں گا نہ جانے کتنے آدمی مارے۔ شیر شاہ موجودہ پاکستان کے اس علاقے کے رہنے والے ہیں، گومل ندی کے قریب ایک بستی تھی ''روہری''۔ پشاور یونیورسٹی کے صدر شعبۂ تاریخ ڈاکٹر حسین خان نے پوری زندگی تحقیق کر کے شیر شاہ پر انگریزی میں ایک کتاب ''استادِ شاہاں'' لکھی، جو بہت مقبول ہوئی۔ شیر شاہ وہ آدمی تھا جس نے نظام حکومت میں اصلاحات کیں، سرائے قائم کیں جہاں مفت قیام تھا، سایہ دار درخت لگائے۔ اس نے خبروں کی ترسیل کا سائنسی طریقہ نکالا۔ ڈھاکے سے خبر چلتی تھی اور دوسرے تیسرے دن آگرے پہنچ جاتی تھی۔ اس کی مجلس بادشاہوں کی طرح نہیں ہوتی تھی۔ فرشی نشست پر چاروں جانب تکیے لگے ہوتے، اس میں مشاورت ہوتی تھی۔ یہ واحد آدمی ہے جس نے کسی صورت سے قتل عام کا حکم نہیں دیا اور ساڑھے چار برس بے مثال عہد گزارا۔ میں تاریخ کا طالب علم رہا ہوں۔ اس شخصیت کی یہی بات مجھے فیسینیٹ کرتی تھی، اور پھر ڈاکٹر حسین خان کی کتاب پڑھ کر شیر شاہ کی شخصیت سے مزید متاثر ہوا۔ وہ واحد مسلم سلطان ہے جس نے جمہوری مزاج رکھا، دین کو ایکسپلائٹ نہیں کیا، حالاں کہ پابند صوم وصلوۃ تھا۔ اس کے تین بڑے وزیر اکبر اعظم کے وزیر و مشیر مقرر ہوئے۔ ٹوڈرمل شیر شاہ کی دریافت تھا۔

سوال: آپ کی کہانیوں میں کئی جگہوں پر ایک فلیش بیک نظر آتا ہے جس میں پٹھان خاندانوں کی روایات اور کردار نظر آتے ہیں، اس کا سبب کیا قبائلی تفاخر ہے؟

اسد محمد خاں: ایک چھوٹا سے افسانہ ہے ''میں اور میرے لوگ''۔ اس میں جہاں میں نے اپنے آباو اجداد میں ان پندرہ بزرگوں کا تذکرہ کیا ہے جو گدی نشیں ہوئے، وہیں اس میں دو تانگے والوں کا ذکر بھی ہے۔ پٹھانوں میں ''پختون ولی'' کردار سازی کا پیغام ہے، جو پشتوں سے چلا آرہا ہے۔ اس میں یہ ہے کہ تم اپنے بڑے بزرگوں کے اچھے کاموں کو یاد رکھو، ان کی بداعمالیوں پر اپنی اولاد کو تاکید کرو۔ تمھارے قبیلے کا گراپڑا کم

زور جسم آدمی جس کی مالی حالت بھی خراب ہو اس کی مدد کرو اور ہمیشہ یہ یاد رکھو گے کہ یہ میرے قبیلے کا ہے، میرا خون ہے، اس کے ساتھ احسان کرنے کی کوشش کرو۔ یہ پختون ولی کے طے شدہ اصول ہیں۔ ہمارے بزرگ اورنگزیب کے زمانے میں آئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پیسے کے لیے تلوار چلانے والا قبیلہ تھا۔ اُنیس آدمی آئے تھے۔ اورنگزیب نے ان لوگوں کو یہیں روک لیا، انھیں زمینیں دے دیں۔ جب اورنگزیب کی اولاد ختم ہو رہی تھی تو ان لوگوں نے وسط ہند کے علاقے میں اپنی پسند کی زمینیں گھیر لیں اور اعلان کر دیا کہ ہم یہاں کے بادشاہ ہیں۔ ان کی قریبی سلطنت دکن تھی، نظام کو پیغام بھیجا کہ آپ ہمیں اپنی سند دیجیے، ہم آپ کے نیاز مند ہیں جو آپ حکم کریں گے ہم سال کے سال بھیج دیا کریں گے۔ ہمارے بزرگوں کو حکم رانی کی پہلی سند دلی سے نہیں دکن سے ملی۔ پھر وہ لوگ اپنے رشتے داروں اور قرابت داروں کو عہدے دیا کرتے تھے۔ ہمارے دادا کے دادا جرنیل تھے۔ بھوپال کے سب خاندانوں نے ان روایات کو محفوظ رکھا ہے۔ جب ہم اپنا نام لکھنے کے قابل ہو گئے تھے، پہلے دادا نے بلایا اور کہا تھا کہ اپنے باپ دادوں کے نام لکھنا شروع کرو۔ تو بس یہ انہی حالات کا بیان ہوتا ہے۔

سوال: ادب لکھتے ہوئے آپ نظریات کے بکھیڑے میں نہیں پڑے، لیکن لکھنے والے کا کوئی نہ کوئی زاویہ نظر تو ہوتا ہے، اس بارے میں کچھ فرمائیں؟

اسد محمد خان: میرا زاویہ نظر ہے صاحب! کہ خدا کی نعمتیں ہر شخص کے لیے ہیں۔ وہ کسی بھی منصب پر ہو، اس کا کوئی بھی مذہب ہو، بس یہ کہ شیطنت نہ کرتا ہو۔ اُس کا حق ہے کہ وہ زندہ رہے۔ اور اپنے پڑوسیوں کے ساتھ آسائش سے رہے۔ میرے کئی دوست ہندو تھے۔ تقسیم سے پہلے کا وہ زمانہ دیکھیے کہ وہ عید کے موقعے پر ہمارے گھر آتے تھے، عید ملتے تھے، عیدی لیتے تھے۔ ہم ان کے تہواروں پر اسی طرح انھیں ملنے جاتے۔ اسی طرح مزدوروں کسانوں پر ہونے والے ظلم پر کڑھتا ہوں لیکن میں اسے اپنی کہانی میں کسی اشتہار کی طرح نہیں لکھتا، میں بس کہانی سناتا ہوں اور بین السطور بات کہہ دیتا ہوں۔ ترقی پسند بہت کھل کر لکھتے تھے۔ مجھے کہا بھی گیا کہ تمھاری کہانیاں موٹیویشنل ہونی چاہییں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ کہانی، کہانی ہونی چاہیے۔ پڑھنے والے کو خود ہی مظلوم سے محبت ہو جائے گی۔

سوال: آپ کے اسلوب اور زبان کا خمیر جس تہذیبی پس منظر سے اُٹھا، آج اور آئندہ کا قاری اس سے گہرا تعلق نہیں رکھتا، کیا اس سے اجنبیت پیدا نہیں ہو گی؟

اسد محمد خاں: وہ محاورہ جو میں استعمال کرتا ہوں، جس میں کلاسیک کی چھوٹ پڑتی ہے، اپنے سے سینیر لکھنے والوں کی طرح لفظوں کی دھنک بناتا ہوں۔ لیکن یہ شوق میں ایک دو پیراگراف میں پورا کر لیتا ہوں۔ اپنی کہانی میں، میں سادگی سے بات کہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کہیں مجبور ہوں، جیسے اگر میں شیر شاہ کے دربار کا منظر دینا چاہتا ہوں تو صاحب ظل ہما، مشیت اللہ فی الارض، سلطانِ عادل والمعدل، یہ کچھ تو لکھنا پڑے گا۔ اس وقت ایسی آوازیں نہیں لگائی جاتی تھیں۔ یہ سب میں نے کری ایٹ کیا ہے۔ اس میں مشکل بھی ہو گی لیکن اچھے پڑھنے والے سے میں یہ توقع کرتا ہوں کہ اگر میں ''صاحب ظلِ ہما'' لکھتا ہوں تو وہ اسے سمجھنے کی کوشش

کرے۔ میرے زیادہ تر کردار، مزدور، کلرک، ہاتھ سے کام کرنے والے محروم اور پسے ہوئے لوگ ہیں۔ میں ان کی زبان لکھتا ہوں۔ پنجاب میں کچھ عرصہ رہا، کچھ پنجابی بھی جانتا ہوں، سندھ کی دیہاتی زبان میں جانتا نہیں لیکن اس کے لیے میں یہ کرتا ہوں کہ بندیل کھنڈ کی دیہی زبان سے استفادہ کرتا ہوں۔ وہ میری مجبوری ہے۔

سوال: غیر معمولی تاریخی واقعات ادب کو مواد فراہم کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں تقسیم پر تو بہت لکھا گیا لیکن گذشتہ دو تین دہائیوں میں پیدا ہونے والے حالات پر ہمارے ہاں کس حد تک ادب کا موضوع بن سکے؟

اسد محمد خاں: اردو کی مجموعی صورت حال پر تو میں بہت دکھی ہوں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جن کی مادری زبان اردو ہے انھوں نے بھی اپنی اولاد کو اس زبان سے دور کر دیا ہے۔ میں اس بات کا شکوہ کس سے کروں کہ وہ اپنے بچوں سے رواں انگریزی میں بات کرتے ہیں۔ انگریزی اچھی زبان ہے، میں نے تاریخ عالم اور عالمی ادب سے اسی زبان کی معرفت پڑھا ہے۔ اگر یہ زبان مجھے نہ آتی تو میں کارل مارکس کے نظریات سے بے بہرہ رہتا۔ میں عرض کروں کہ ہم نے ملک کے قیام کے وقت یہ وعدہ کیا تھا کہ یہ قومی زبان ہوگی، یہ وعدہ پورا نہیں کیا۔ اب کچھ نہیں کیا جا سکتا، اردو میں لکھنے والے بے شک خوب لکھ رہے ہیں۔ میرے ساتھی، میرے سنیئرز بڑی محنت سے اس زبان میں لکھ رہے ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ میں اس کا کریڈٹ پنجاب کو دوں گا۔ پنجاب نے اردو کو جس قدر مضبوط اور مستحکم کیا ہے اس کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ منشا یاد مرحوم پنجابی کے بھی بہت اچھے کہانی کار تھے۔ میں ان سے اکثر کہتا تھا کہ یار اگر تم دو کہانیاں اردو میں لکھتے ہو تو ایک پنجابی میں بھی لکھا کرو، کیوں کہ ماں بولی کا حق سب سے پہلے ہے۔ اردو کے مستقبل کے بارے میں ہمیشہ دعا گو رہتا ہوں۔ بڑی مضبوط زبان ہے۔ میرؔ سے لے کر فیضؔ اور فیضؔ سے لے کر ذیشان ساحلؔ تک کی زبان ہے۔ ہمارے نوجوان بھی بہت اچھا لکھ رہے ہیں تو یہ زبان مر تو نہیں سکتی۔ لیکن ابھی اردو کو بڑے امتحانی مراحل سے گزرنا ہے۔

سوال: پاپولر لٹریچر اور ادب عالیہ کی بحث میں آپ کا کیا موقف ہے؟

اسد محمد خاں: پاپولر لٹریچر میں جس طرح ابن صفی نے جم کے لکھا، کہانی کے جو لوازمات پورے کیے، وہ ایک بڑے ادیب ہیں۔ آپ انھیں پاپولر فکشن کا ادیب کہہ کر ان کے مرتبے میں کوئی کمی نہیں کر سکتے۔ بابائے اردو نے ان کے کام کی قدر کی، سلیم احمد انھیں پڑھتے تھے اور کہتے تھے کہ دیکھو اس آدمی کا بیانیہ اور کہانی کی بنت کیسی ہے! میں تو انھیں جینوئن ادیب مانتا رہوں گا۔

سوال: ناول نویسی کی طرف کیوں نہیں آئے؟

اسد محمد خاں: تصویر کو جلدی سے ختم کر دینے کی جو عادت تھی، وہ رہی۔ بعض میری لانگ شارٹ اسٹوریز ہیں مثلاً ''گھوبا اور تاریخ فرشتہ'' وہ ایک ناولٹ ہے۔ ناول کے لیے ایک باب میں نے لکھا تھا ''خانوں'' کے نام سے لیکن اسے پورا نہیں کر سکا ''رسالے دار'' کے نام سے ایک ناولٹ بھی زیر طبع ہے۔ ناول کے لیے جس کی ضرورت ہوتی ہے اب خیر اتنی محنت کر بھی نہیں سکتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ الگ صنف ہے۔

سوال: شاعری اور نثر کے تراجم بھی کیے، آپ کے خیال میں ترجمہ کا بنیادی مسئلہ کیا ہے؟

اسد محمد خاں: ہمارے ہاں ترجمہ کرنے والوں کو اچھی، مضبوط لغت سے مدد لینا چاہیے۔ اردو کا ذخیرۂ الفاظ، کچھ بھی کہیں، محدود ہے۔ اس زبان میں اچھی بات یہ ہے کہ اس میں ہندی، فارسی اور مقامی زبانوں سے بھی لفظ مستعار لیے جاسکتے ہیں۔ ترجمے میں کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اصل سے قریب تر ہو، تاکہ ترجمے کی قدر ہو۔ سرسری، کمرشل ترجمے کے حق میں نہیں ہوں۔ ترجمے کی ہمیں بہت ضرورت ہے، اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے والے ہمارے ہاں بہت کم ہیں۔ جس کی وجہ سے دوسری زبانوں میں اردو کے اچھے لکھنے والوں کی ترسیل نہیں ہوسکی، جو کہ ضروری ہے۔

سوال: ادبی گروہ بندی کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

اسد محمد خاں: یہ بڑی شرم ناک بات ہے، بعض لوگوں نے اسے لسانی رنگ دیا۔ اس طرح کہ جو میرے علاقے کی زبان بولتا ہے وہ میرا اپنا ہے اور انھوں نے اس پر ڈھیروں محنت کی۔ ہوتا یوں ہے کہ جو مستحق نہیں ہوتے ان کا کام آگے آجاتا ہے۔ اگلے پچاس برسوں میں پڑھنے والا اتنا سیدھا اور بھولا نہیں ہوگا، اسے معلوم ہوگا کہ آپ نے کس پس منظر میں کام کیا ہے اور اسے کس طرح دیکھنا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ نے اپنے بھانجے، بھتیجوں اور دوستوں کی مدد سے خود پر ایک ضخیم نمبر ترتیب دے لیا۔ وقت گزرنے پر وہ خاص نمبر ردی کی ٹوکری ہی میں رہ جائے گا۔ ادب میں گروہ بندی کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ اس میں بعض لوگوں کے مفادات ہوتے ہیں کہ میں ایک گروپ کا ہیڈ بن جاؤں گا تو مجھے باہر سے بلاوا آجائے گا۔ میں اس ادارے کا صدر بن جاؤں گا، ممکن ہے۔ مالی منفعت بھی سامنے ہو مگر اس سے ہوتا کچھ نہیں۔

سوال: آپ کے نزدیک لکھنے کی صلاحیت خداداد ہے، لیکن کرافٹ کتنا ضروری ہے؟

اسد محمد خاں: کرافٹ ایک لازمی چیز ہے، اسے سامنے نہ آنے دیں، یہ ایک خاص بات ہے۔ لکھنے والے کو کرافٹ سے واقفیت ہونا ضروری ہے لیکن اسے مسلک بنانا بے کار ہے۔ اس طرح یہ محض فارمولا بن کر رہ جائے گا۔ وہ کسی پڑھنے والے کو اپنی طرف کھینچے گا نہیں۔ کرافٹ سے جان کاری کی ضرورت ہے، اسے برتنے کی ضرورت نہیں۔

سوال: آپ نیر مسعود کی نثر کے بہت قائل ہیں، معیاری نثر کا آپ کے ہاں کیا معیار ہے؟

اسد محمد خاں: نیر مسعود کی نثر سیدھی اور رواں ہے۔ ان کی کہانیوں کے مشاہدات بہت متاثر کن ہوتے ہیں۔ مجھے بہت سے لوگوں نے کہا ان کی کہانیاں "کافکا ئیک" ہوتی ہیں، یعنی ان کا طرز تحریر کافکا جیسا ہے۔ دیکھیے کافکا ایک مرحلے پر اپنے کردار کو گم کردیتا ہے، نیر مسعود اسے زندہ کرتے ہیں، اسے نکال کر لاتے ہیں اور اسے ریشنالیٹی میں داخل کرتے ہیں۔ کافکا کی بہت سی کہانیاں معاف کیجیے گا، مجھے اریشنل (Irrational) لگیں۔ نیر کے دیکھنے کا ذہن منفرد ہے۔ صرف نیر ہی لکھ سکتے ہیں ایسی کہانی۔

سوال: کلاسیک کا مطالعہ بھی بہت کیا، کون سے ایسے نام ہیں جو ذہن میں تازہ رہتے ہیں؟

اسد محمد خاں: کلاسیک میں سارے اکابر کو پڑھنا ضروری ہے۔ نظم و نثر میں سارے بڑوں کو پڑھ کر ہی آدمی سیکھ سکے گا کہ انھوں نے کس طرح اپنے فن کو کمال پر پہنچایا، اس کے بعد ہی انفرادیت پیدا ہوتی ہے۔

سوال: نئے لکھنے والوں میں کسے پڑھتے ہیں؟

اسد محمد خاں: کئی نئے لوگ ایسے ہیں۔ ان میں طاہرہ اقبال کو میں باقاعدگی سے پڑھتا ہوں، انھوں نے اپنے علاقے کو جس طرح بیان کیا ہے، وہ اس کی سمجھ اور جان کاری رکھتی ہیں، وہ بڑی قابل تعریف ہے۔ اور بہت سے اچھے لوگ ہیں جو لکھ رہے ہیں۔ اچھی کہانی لکھی جا رہی ہے اور لکھی جاتی رہے گی۔

سوال: آپ کے تراجم تو ادبی جرائد میں شایع ہوتے رہتے ہیں، طبع زاد کہانیوں کا سلسلہ کیوں رُک گیا ہے؟

اسد محمد خاں: کم ہو گیا ہے۔ میری ایک کہانی ایک سال پہلے چھپ جانی چاہیے تھی، میرے ایک دوست کے پرچے کے لیے لکھی تھی۔ ممکن ہے وہ کہانی چھپی ہوئی دیکھوں تو تحریک ہو جائے۔ ایک دور ہوتا ہے، وہ گزر گیا۔ میں اب کم کم لکھنے والوں میں سے ہوں۔ ایک زمانے میں خوب لکھا۔

سوال: ادیبوں کو ناقدری کا گلہ رہتا ہے، آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟

اسد محمد خاں: یہ ایک بے کاری بات ہے۔ ہمارے اس عہد کو سمجھنے والا کبھی کوئی شکوہ نہیں کرے گا۔ ہم باقی رہے یہ ہمارا کمال تھا۔ جو لوگ بقا کی جنگ نہ لڑ سکے، وہ کم زور پڑ گئے۔ اس میں ان کا بھی کوئی قصور نہیں۔ ہم اس بات پر خوش ہیں کہ ہم نے سروایو کر لیا۔ اور یہ کہ اب آگے ہم چلتے ہیں یا نہیں یہ بھی ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ اپنی بساط بھر جو کچھ لکھ سکتے تھے لکھ دیا۔ اب اس کام میں آئندہ وقتوں میں زندہ رہ جانے کی ہمت ہو گی تو رہ جائے گا۔ ورنہ سب مٹی میں مٹی تو ہونا ہی ہے۔

سوال: اپنے ہم عصر اور سینیئرز کے ساتھ جو وقت گزرا، اس بارے میں بتائیے؟

اسد محمد خاں: ہماری خوش نصیبی تھی کہ سلیم احمد جیسے حقیقت پسند جنھوں نے بے حد مطالعہ کیا وہ ہماری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ حسن عسکری سلیم احمد کے استاد تھے۔ انھیں دور سے دیکھا۔ ایک دو کہانیاں انھیں سنانے کی عزت حاصل کی۔ لیکن وہ جس طرح کے اوریجنل آدمی تھے۔ اس نسل اور پچھلی نسل نے بھی ایسا آدمی نہیں دیکھا ہو گا۔ ان کے کام پر لڑکے لڑکیوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لیں مگر سلیم احمد نے گریجوایشن نہیں کیا تھا۔ لیکن جس وقت وہ پڑھاتے تھے تنقید کرتے تھے، اور جو انگریزی پر ان کی گرفت تھی۔ اس کے کیا کہنے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں اُن لوگوں سے ملا، اور ان کے ماحول میں رہا۔ ان میں سے بعض کی صحت بھی ساتھ نہیں دیتی تھی مثلاً ذیشان ساحل کی صحت اس قابل نہیں تھی، وہ جتنا کر سکتا تھا اس نے ہمت سے کیا۔ اطہر نفیس بیمار رہتے تھے۔ جون ایلیا کا بھی یہی مسئلہ تھا۔ اب شدید تنہائی کا احساس ہوتا ہے کہ میرے سب ہم عصر اور ساتھی روانہ ہو گئے۔ لیکن اس سے فرق نہیں پڑتا، مجھے جس حد تک کچھ کرنا ہے کرتا رہوں گا۔ اس لیے کہ میں نے دیکھا، ان میں سے کسی کا کوئی قصور نہیں تھا۔ علیم مجھ سے عمر میں چھوٹا تھا، اسے رہنا چاہیے تھا۔ اس کے جانے کا دُکھ رہے گا۔

■■

مبین مرزا

نئی زمین نئے آسماں تراشتا ہوں

باتوں، لہجوں اور ماجروں کو جوڑ توڑ کر کہانی بنانے والا، جذبے اور احساس کو ملال کی آنچ دے کر شعر کاڑھنے اور گیت کا ریشم بُننے والا، رنگوں میں زندگی کی حرارت گوندھنے والا اور چاک پہ مٹی دھر کے اُسے بولنا سکھانے والا ایک آدمی... کوئی بھی آدمی، بلکہ یہ سب کے سب لوگ اپنے ہنر میں اور فن میں جُوا کھیلتے ہیں۔ زندگی کا جُوا۔ جی اُٹھنے یا پھر مر رہنے کی بازی۔ سو یوں اگر دیکھا جائے تو ہمارے زمانے کی کہانی کی دُنیا میں اس شخص نے جس کا نام اسد محمد خاں ہے، بڑا تگڑا جُوا کھیلا ہے۔ اور اُنھیں جو جاننے والے ہیں، جاننا چاہیے اور ماننا چاہیے کہ جیت لی ہے بازی اس شخص نے۔

تو اب ایسا ہے کہ وہ جنھیں جاننے اور سمجھنے کا ذوق ہے، تو انھیں اطمینان کے ساتھ دیکھنا اور سمجھنا چاہیے کہ آخر اسد محمد خاں کے فن کی جیت کیا ہے؟ اور کیسے ہے! کہ یہ شخص جو آج کے ادب کے صدر میں بیٹھا کہانیاں کہتا اور قصے سناتا ہے، اوّل اوّل قصہ گو تو نہیں تھا افسانہ دافسوں سے اس آدمی کو بہت بعد میں ذوق ہوا، ورنہ پہلے تو یہ شعر کاڑھنے اور گیت بُننے والا آدمی تھا۔

میں وِندھیاچل کی آتما...

جیسا مدھر گیت جس میں واقعی آتما گاتی گنگناتی سنائی دیتی ہے، بھلا کسے یاد نہ ہوگا! تو اپنے بھائی اسد محمد خاں یہ اور ایسے ہی دوسرے گیتوں کی مدھرتا بکھراتے اور تانیں اڑاتے، ادب کی وادی میں اُترے تھے اور سوچتے تھے کہ اپنے زمانے کے ادب میں بس کہیں حاشیے پہ ٹک رہیں گے۔ لیکن پھر یوں ہوا (اور ہونا بھی یوں ہی چاہیے تھا) کہ مَیٔ دادا اور باسودے کی مریم کے قصوں نے انھیں تاک لیا۔ اور بس پھر کچھ لوگ تھے اور کچھ نئے زمانے تھے، نئی زمینیں تھیں کہ ایک الگ لحن، ایک انوکھا لہجہ اور ایک منفرد آواز جنھیں گڑھتی، بناتی، تراشتی اور ہمارے سامنے رکھتی جاتی تھی۔

تو ایسا ہے اب کہ یہ قصہ جب چھڑ ہی گیا ہے تو کیوں نہ میں اس کا سرا وہیں سے تھام لوں جہاں میں نے اسد محمد خاں اور ان کی کہانی کو پہلے پہل دریافت کیا تھا اور خواہش کی تھی اسے جاننے اور سمجھنے کی۔

کچھ یوں لگا کہ پوری ایک دنیا ہے... بھانت بھانت کے لوگوں سے بھری ہوئی۔ جیون جوجھتے، کشٹ اٹھاتے، وضع نبھاتے اور جیتے مرتے لوگوں سے بھری ہوئی دنیا۔ اچھے بھی ہیں ان میں، بہت اچھے، سچے اور اندر باہر سے سولہ آنے کھرے۔ اور یہی نہیں بلکہ ایک سے ایک بڑا حرام الدہر بھی پڑا ہے ان میں... بلکہ سچ پوچھو تو یہ رذیل کمینے ہی زیادہ کھائی پڑتے ہیں یہاں بھی۔ ہماری اپنی دنیا کی طرح۔ دوسروں کا استحصال کرتے، انھیں دباتے، زندگی کو ان کے لیے ایک مسلسل عذاب بناتے اور برائی کا کاروبار کرتے لوگ، اُچکے، اُٹھائی گیرے، کرائے کے بدمعاش اور دلال... ہر طرح کا موذی ہے ان میں۔ ہاں، وہ کوٹھوں کا اُجالا، نصیبوں والیاں بھی ہیں یہاں پر۔ لیکن بکھیڑا یہ ہے کہ ان بُرے اور برائی کرتے لوگوں میں بھی نیک دل مرد، اور بھلی طبیعت کی عورتیں نکل آتی ہیں، بلکل اسی طرح جیسے خود اپنی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ کسی بہت بُری جگہ یا کسی بہت بُرے کام میں کوئی ایسی روح سامنے آجاتی ہے جو اپنے کام کی ساری معصیت کے باوجود ہمیں معصوم نظر آتی ہے۔ سو ان افسانوں میں بھی بہت سے ہیں جو بے قصور ہیں مگر زندگی کو سزا کی طرح بھوگتے ہیں۔ ان لوگوں کی بپتا سنتے اور انھیں جیون بھوگتے دیکھ کر بلکل یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی آئینہ ہے جو ہماری زندگی کا عکس دکھاتا ہے، کوئی فلم ہے، ایک مسلسل اور طویل فلم یا پھر ایک فلم کے ٹکڑے ہیں جن میں خود ہم ہیں اور عین مین ہمارے اردگرد کا ماحول۔ کیسے جیتے جاگتے اور کتنے حقیقی ہیں یہ کردار۔ جی ہاں، اسد محمد خاں کے جہانِ افسانہ و افسوں کے کرداروں سے میرا پہلا تعارف کچھ اسی قسم کا تھا۔

اب، جب کہ میں ان کرداروں کے ساتھ طویل، بہت طویل عرصہ گزار چکا ہوں اور اس منزل میں ہوں کہ جہاں مجھے ان کرداروں کے کردار کی بابت اپنا بیانِ حلفی ریکارڈ کرانا ہے، تو ضروری ہے کہ میں اعتراف کروں کہ آگے چل کر مجھے اپنی اُس رائے میں تبدیلی کرنا پڑی جو میں نے اولین تعارف کی بنا پر ان کرداروں کے بارے میں قائم کرلی تھی۔

انسانی تہذیب اور سماجی رشتوں کی بنتی بگڑتی اور بدلتی صورتِ حال کی جیسی جامع، تہ دار اور بلیغ دستاویز افسانوں اور ناولوں میں مرتب ہوتی ہے ویسی تہذیب و ثقافت کے کسی دوسرے فن میں ہمیں نہیں ملتی۔ اس کا ایک اہم سبب تو ظاہر ہے اس فنِ لطیف سے وابستہ لوازم ہیں جو فن کار کو اپنے موضوع کی خارجی اور داخلی صورت گری کی یکساں قدرت کا حامل بناتے ہیں۔ دوسری طرف ایک بات اور بھی قابلِ توجہ ہے۔ وہ یہ کہ کہانی کہنے اور اس سے محظوظ ہونے کے اسالیب، فنی لوازم اور اظہار و ابلاغ کے پیرائے، زمانوں اور معاشروں کی مزاجی کیفیات اور تقاضوں کے تحت تبدیل تو ضرور ہوتے رہے ہیں، لیکن کہانی کا وہ بنیادی جوہر جو ایک انسان کو دوسرے، بہت سے انسانوں بلکہ پورے پورے معاشروں اور زمانوں کی زندگی کو جاننے ہی کا نہیں، بسر کرنے کا لطف بھی دے جاتا ہے۔ آج بھی کہانی کے haunting elements میں سے ہے۔ وقت کی کم یابی اور مسائل و مشاغلِ حیات کی افزونی کے اس دور میں بھی یہی وہ جوہر ہے جو کہانی کا اثبات کرتا اور کہانی

کے فن کا جواز بنتا ہے۔

یہیں اگر ایک اور امر کا اعتراف بھی کر لیا جائے تو چنداں مضائقہ نہیں۔ یہ کہ ہمارا زمانہ، جس کی بابت عام تاثر یہ ہے کہ اس نے انسان کی معنوی دلچسپیوں اور باطنی اظہار کی سرگرمیوں کے آگے بڑے بڑے سوالیہ نشان لگا دیے ہیں اور ہمیں خارجی زندگی کے ہنگاموں میں محو کر دیا ہے... ان سب باتوں کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ ہمارا زمانہ اچھی کہانیوں کے لیے توجہ اور قبولیت سے آج بھی عاری نہیں بلکہ بڑی کہانیوں کے امکانات سے اب بھی اسی طرح بھرا پڑا ہے جیسے اس سے قبل کے زرخیز زمانے رہے ہیں۔ ہاں، بس اب یہ ہے کہ وہی کہانی کار فوکس ہو سکیں گے جو کہانی کہنے بُننے سے پہلے خود اپنے اندر اور اپنے فن کے اندر کہانی کو بسر کرتے ہیں... ایسے ہی کہانی کاروں کی ایک مثال ہمارے زمانے میں اسد محمد خاں ہیں۔

ایک بار میں نے اسد محمد خاں سے دریافت کیا، کیا پہلی بار میں ہی کہانی ایسی گتھی ہوئی صورت میں اتر آتی ہے؟ انھوں نے نہایت سادگی اور متانت سے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا، "نہیں، ہرگز نہیں۔ بھائی جان! بڑی جان لگانی پڑتی ہے۔ کبھی تو سولہ سترہ بار ڈرافٹ کرتا ہوں، تب کہیں جا کر کہانی کی صورت دیکھنے کو ملتی ہے۔" ٹھیک کہتے ہیں اسد محمد خاں، بالکل ٹھیک۔ جو کہانی وہ لکھتے ہیں، وہ اس سے کم ریاضت کے بغیر ممکن بھی نہیں۔

اب یہاں میں نے لفظ ریاضت استعمال کیا ہے تو ضروری ہے کہ بتا تا چلوں، ریاضت کی نوعیت بھی مختلف فن کاروں میں مختلف ہوا کرتی ہے۔ کچھ کے یہاں ریاضت محض مشق سخن کے درجے میں رہتی ہے اور کچھ لوگ اس کے ذریعے ذرا اور آگے بڑھتے ہیں، اپنی آواز پانے کی سعی کرتے ہیں۔ لیکن وہ جو بڑا فن کار ہوتا ہے، وہ ریاضت کے ذریعے اپنی زندگی کو انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر پہلے تو rediscover کرتا ہے اور پھر relive بھی کرتا ہے... زندگی کے پورے کیف و کم اور احساس کی تہ در تہ شدتوں کے ساتھ۔ یہ ادب و فن کو جیتی جاگتی زندگی کا لمس دینے اور اس کی معنویت کو سماجی سیاق و سباق میں متعین کرنے کا عمل ہے۔ اب یہاں مثال کے طور پر آپ اسد محمد خاں کے پہلے افسانوی مجموعے "کھڑکی بھر آسمان" ہی کو سامنے رکھ لیجیے۔ افسانے پڑھتے جائیے ایک ایک کر کے، آپ دیکھیں گے کہ افسانہ نگار نے پے در پے ایسے کرداروں کو لکھا ہے جو ہند اسلامی کلچر کے پیدا کردہ ہیں۔ اسد محمد خاں نے بڑی احتیاط سے کام لیا ہے کہ اپنے کرداروں پر علاقائی عصبیت کی چھاپ نہیں پڑنے دی اور نہ ہی انھیں کسی مذہبی رول ماڈل کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ انھوں نے تو ان کرداروں اور ان کے ماجروں کو اس تناظر میں دیکھا اور دکھایا ہے جس پر برصغیر کی ثقافتی روح کی چھوٹ پڑتی ہے۔ خیر و شر کے باہم آمیز عناصر کے ساتھ اور مخلوط معاشرے کی complex situations میں پورے قد کے ساتھ ابھرتے ہیں اسد محمد خاں کے تراشے ہوئے یہ کردار۔ ان کرداروں کے ماجروں کی حقیقت قدر و قیمت کو سمجھنے کے لیے ہمیں اپنا تہذیبی اسٹرکچر، اس کی تمام تر رنگارنگی اور تنوع کے ساتھ سامنے رکھنا پڑے گا... ورنہ یہ سب کردار گھٹ کر محض زندگی کی کھلواڑ کا ایسا نمونہ ہو کر رہ جائیں گے جس کا مقصد وقت گزاری کے لیے تفریح طبع کا سامان فراہم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ تو بس اب ضروری ہے

کہ ہم یہاں رُک کر پہلے اُس اصول کو سمجھ لیں جس کے تحت برصغیر کی تہذیبی و ثقافتی روح نے ظہور کیا ہے۔

برصغیر پاک و ہند کی تہذیبی و ثقافتی روح نے اپنے اظہار کے لیے زمین اور وقت کے جتنے بھی دائرے قائم کیے، ان سب میں اصولِ کثرت ہمیں مشترک ملتا ہے۔ تہذیبوں کا مطالعہ کوئی ایسا کام تو خیر نہیں ہے کہ جس کے لیے جمع تفریق یا ضرب تقسیم کی قسم کا کوئی ضابطہ مقرر کرلیا جائے اور پھر اسی کے تحت تہذیبوں کے مظاہر اور ان کی نمو کا جائزہ لیا جائے۔ اس لیے کہ تہذیبوں کے باطن میں جو تخلیقی جوہر کارفرما ہوتا ہے، وہ اپنے اصول خود اپنی ہی نہاد سے اخذ کرتا ہے۔ تاہم انسانی صورتِ حال اور اس کے سماج کو سمجھنے کے لیے ہمیں کوئی نہ کوئی قاعدہ تو اختیار کرنا ہی پڑتا ہے۔

خیر، بات ہو رہی تھی کہ اسد محمد خاں تاریخی اعتبار سے بیسویں صدی کے آخری ربع میں ہمارے افسانوی منظر نامے کا ایک ایسا نام ہے جس کے فن کارانہ طرزِ احساس اور تخلیقی شعور کو ثقافتی تناظر سے منہا کر کے سمجھنا ممکن نہیں۔ اس لیے کہ اسد محمد خاں کے افسانے اپنی اوپری سطح پر اظہار و ابلاغ کا کتنا ہی ڈرامائی، سہل اور رواں دواں اسلوب کیوں نہ اختیار کریں، واقعہ یہ ہے کہ یہ افسانے تہ در تہ معنویت کا ایک گمبھیر اور پیچیدہ سلسلہ رکھتے ہیں۔ ایک فن کار صرف اپنے موضوعات اور مسائل کی وجہ سے بڑا نہیں بنتا ہے بلکہ اس کی بڑائی میں اس کے اسلوب اور طرزِ احساس کا بھی اتنا ہی حصہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا اسلوب اور طرزِ احساس نہ صرف معنویت کی متنوع سطحوں کا حامل ہوتا ہے بلکہ ابلاغ و تفہیم کے بھی مختلف دائروں میں بیک وقت کام کرتا ہے۔ پریم چند باقی کے فن کی طرح اُس کا فن بھی اپنی دیدہ زیبی اور فن کاری کے لیے عامتہ الناس اور اہلِ ذوق و نظر سے الگ الگ قسم کی داد وصول کرتا ہے۔ اسد محمد خاں کے افسانے دل چسپ، سادہ اور grasping ہونے کی وجہ سے اپنا وسیع تر عوامی حلقہ ضرور رکھتے ہیں لیکن بایں ہمہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دل چسپی اور سادگی محض برائے فن نہیں ہے بلکہ زندگی کے نہایت گنجلک تجربے اور عمیق احساس کو خود زندگی کے لب و لہجے میں بیان کی شدید فن کارانہ کاوش نے انھیں سہل بنا دیا ہے۔ گویا یہ سادگی سادگی نہیں بلکہ پختہ کاری کی انتہا ہے۔ اظہار کے اس سہل ممتنع کے پیچھے فنی الجھنوں اور فکری دقیقوں کا ایک طویل عمل ہے جس سے فن کار پوری ثابت قدمی کے ساتھ گزرا ہے۔ صبح منھ اندھیرے، نور کے تڑکے سانس پکا کرنے کا ریاض۔ جی ہاں، فن کار کسی شعبے کا ہو فن کی اگلی منزلوں کی طرف بڑھنے کے لیے سانس تو اُسے پکا کرنا ہی پڑتی ہے۔ تو بات یہ ہے کہ اسد محمد خاں نے یہ ریاض بہت کیا ہے۔ اسی ریاض کی دین ہے کہ ان کے افسانوں میں فکر و فن کی ساری گمبھیرتا ایک زیریں سطح پر سفر کرتی ہے اور between the lines معنویت کی ایک تہ جماتی چلی جاتی ہے۔ خیر، اس پر مزید گفتگو ہم آگے چل کر کریں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اہم فن کاروں کی تفہیم اور تعینِ قدر میں جو ایک مسئلہ بالعموم ہمارے یہاں پیش آتا ہے، وہی اسد محمد خاں کے افسانوں کے حوالے سے بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ مسئلہ ہے فن کار کے کسی ایک پہلو کی ایسی تعمیم کہ اس کا سارا فنی کارنامہ محض اس ایک پہلو سے موسوم نظر آئے۔ اسد محمد خاں کی بابت ایک عام رائے یہ پائی جاتی ہے کہ انھوں نے خطِ افلاس سے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کا احوال قلم بند کیا ہے۔ یہ رائے اسد محمد

خاں کے جہانِ افسانہ کی بابت غلط تو بے شک نہیں ہے لیکن یہ بھی واقعہ یہ ہے کہ یہ ان کے پورے فن کو اس کی کلیت میں بیان نہیں کرتی بلکہ اس کے محض ایک جزو کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس قسم کی آرا کسی بھی تخلیق کار کی من حیث المجموع قدر و قیمت کے تعین میں نہایت مہلک قسم کی گم راہی کا سبب بنتی ہے۔ لیکن اب اس کا کیا کیا جائے کہ ہماری تنقید نے اپنے تناظرات میں بالعموم اور فکشن کے باب میں بالخصوص پہلے بھی ایسے کئی ایک لطیفے سنائے ہوئے ہیں، مثلاً منٹو کو طوائفوں (یا جنس) کا، قرۃ العین حیدر کو طبقۂ اشراف کا اور انتظار حسین کا ناسٹلجیا (یا اساطیر) کا کہانی کار قرار دینے والے بیانات ہماری تنقید کی کام چوری سے پیدا ہونے والے لطیفے نہیں ہیں تو اور کیا ہیں۔ پروفیسر قسم کے دانش وروں اور فکشن کے فروغ اور تفہیم میں ہماری تنقید نے خاطر خواہ کردار ادا نہیں کیا ہے۔ خیر، اس وقت نہ تو نقادوں کی گوشمالی مقصود ہے اور نہ ہی اپنی تنقید کی نارسائی کے مصائب کا بیان۔ تو آئیے واپس اسد محمد خاں کی طرف۔ ان کے بارے میں جو عام تاثر ہے کہ وہ پسے ہوئے اور زندگی گزیدہ کرداروں کے کہانی کار ہیں، یہ رائے ان کے فن کا پورا احاطہ کرتی اس لیے ہمیں اس سے الگ ہو کر اپنا کام کرنا پڑے گا۔ یہ ہیں وہ دو بنیادی باتیں جنھیں ہمیں آغاز ہی میں جان لینا چاہیے۔

انسانی احساس کی وسعت اور اس کے تجربے کی گہرائی کماحقہ تو خیر کس سے بیان ہوئی ہے اور کیوں کر بیان ہو سکتی ہے، لیکن اس اعتراف کے باوصف اگر ہم آج اکیسویں صدی کے اولین عشرے میں اپنے افسانوی ادب کا جائزہ لیں اور یہ دیکھنا چاہیں کہ ہمارے کن کن فنکاروں نے انسانی احساس اور اس کے تجربے کا زیادہ سے زیادہ ریکارڈ مرتب کیا تو درجہ اول کے ناموں میں ایک نام اسد محمد خاں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اسد محمد خاں نے اپنے افسانوں میں انسانی احساس کے عجیب منطقوں کو دریافت کیا ہے اور ان منطقوں کی سیاحت کے دوران گہرے تجربوں کے زندہ رنگوں کو سمیٹا ہے۔

اسد محمد خاں کے افسانوں کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ ان کو جوڑ کر دیکھنے سے ہند اسلامی کلچر یا گنگا جمنی تہذیب کی سماجی صورتِ حال اور انسانی رویوں کا خاصا معقول کوائف نامہ مرتب ہو جاتا ہے۔ یہ کہنا تو درست نہیں ہوگا کہ اسد محمد خاں کے افسانوں میں پہلی بار ہند اسلامی کلچر کے نمائندہ کردار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایسا تو یقیناً نہیں ہے۔ یوں بھی اسد محمد خاں نے جس زمانی دائرے میں اپنے افسانوی سفر کا آغاز کیا، اس سے پہلے اولیت کے سارے ہی سہرے بندھ چکے تھے اور پھر یہ بھی بُرا ماننے کی کوئی بات نہیں کہ اولیت کا اعزاز تو اپنی جگہ، لیکن ہمارے یہاں ایک زمانے میں جس طرح اس قسم کا سہرا باندھنے کا فیشن رہا ہے، کیا کسی تخلیقی فن کار کی حتمی سبقت میں وہ کوئی فیصلہ کن کردار ادا کر سکتا ہے؟ میرا ذاتی جواب نفی میں ہے۔ اس لیے کہ تخلیقی فنون میں درجہ بندی کے لیے قطار کا نہیں صف کا اصول درست ہوتا ہے۔ قطار بندی اسکول کے لڑکوں کے ڈسپلن کے لیے تو ٹھیک ہے لیکن فن کاروں پر اس کے اطلاق میں جس hard and fast قسم کے رویے کی ضرورت پیش آتی ہے، مجھے اس پر اندھے کی لاٹھی کی پھبتی سوجھتی ہے۔ پھر یہ کہ خود اسد محمد خاں ایسے تخلیقی فن کار کی ذاتی دل چسپی بھی اپنے کام کے تخمین و ظن میں تو بے شک ہوگی لیکن اولیت کے قضیے میں نہیں۔ یہ تو محققوں کا مسئلہ ہے، سو اسے انھیں کے سپرد کر دینا چاہیے۔

تو بات یہ ہے کہ گنگا جمنی کردار ہم نے اوروں کے یہاں بھی دیکھے اور اُن کی کتھا پڑھی ہے لیکن اسد محمد خاں کے یہاں ایسے کردار اپنے پورے وجودی تجربے اور باطنی احساس کے ساتھ اس طرح آتے ہیں کہ ان کے اطوار سے ہمارے سامنے مناسبات کا پورا ایک سلسلہ روشن ہوتا چلا جاتا ہے اور یوں پوری سماجی زندگی کا منظر نامہ ظہور کرتا ہے۔ کائنات عالم اکبر ہے اور انسان عالم اصغر۔ وہ سب کچھ جو کائنات کے دائرے میں افشا ہوتا ہے، عالم اصغر میں بہ صورتِ تصغیر پایا جاتا ہے۔ چناں چہ خارجی کائنات اور انسان کے داخل کے مابین تناسب کا ایک رشتہ ہے۔ بڑا کہانی کار اپنے تئیں اس تناسب کو جاننے اور بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ بیج میں پورا ثمر بار شجر خوابیدہ ہوتا ہے تو اس تمثیل کا اطلاق کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ بعینہٖ ایک فرد (یا ایک کردار) میں پورا ایک سماج اور اسکی زندگی کا پورا ایک دائرہ مضمر ہوتا ہے۔ فرد اپنی ذات میں اپنے سماج کے امکانِ نمو کو ظاہر کرتا ہے اور کہانی کار اسی امکان کو رُو بہ عمل لاتا ہے۔ اسد محمد خاں کی کہانیاں ''باسودے کی مریم'' اور ''مئی دادا'' فرد کے اسی امکان کو رُو بہ عمل لانے اور explore کرنے سے معرضِ اظہار میں آئی ہیں۔ اپنے اجمال میں ان کہانیوں نے کتنے ہی بڑے کرداروں اور ان کرداروں کے سماجی منظر نامے کی تفاصیل کو سمیٹ لیا ہے۔ کہانی تلوار کی دھار پر سفر کرتی ہے۔ ایک طرف مذہبی اختلاف کا جہنم ہے تو دوسری طرف انسانیت کی ناپاس داری کا الاؤ۔ ایسے میں فن کی معراج یہ ہے کہ فن کار کو بسلامت روی پار جا اُتارے۔

فکشن کے عام مطالعات اور جائزوں میں زندگی میں عکاسی اور سماج سدھار بھاشن کا بہت کریڈٹ افسانہ نگار کو دیا جاتا ہے۔ تنقید نے بھی کیا کیا ڈھکوسلے بنائے ہیں۔ مغربی ادب میں یہ شوشہ رینے سال کی دین ہے۔ ہمارے یہاں کی اس کی ابتدائی شکلیں تو سرسید احمد خاں کی اصلاحی تحریک کے زیر اثر سامنے آئی تھیں لیکن بعد ازاں سماجی حقیقت نگاری اور افادی ادب کے تصورات نے اس بدعت کو رائج کرنے میں بڑی مدد دی۔ ترقی پسندوں کی بدعتیں بھی ترقی یافتہ تھیں۔ تخلیقی فن کار کی فکری وفنی خود مختاری کا جو استحصال اس تحریک کے اثرات کے تحت ہوا، ویسا اس سے پہلے کبھی نہ ہو سکا تھا۔ بہر حال، اس حساب کو پھر کسی موقعے کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

بات ہو رہی تھی ''باسودے کی مریم'' اور ''مئی دادا'' کی۔ تو ٹھیک ہے کہ ان افسانوں میں ہمیں انفرادی کردار بھی ملتے ہیں اور ان کا وہ تفاعل بھی افسانے میں نظر آتا ہے جسے زندگی کی عکاسی سے عبارت کیا جا سکتا ہے لیکن ''یوم کپور''، ''گھر''، ''ترلوچن'' اور ''براوو براوو'' ایسے افسانوں کی بابت کیا کہا جائے گا۔ یہ افسانے تو اسد محمد خاں نے محض بیانیے کی تکنیک میں لکھے ہیں۔ ان میں عمل اور ردِّ عمل کی وہ صورت حال ہے ہی نہیں، جسے بیان کرنے پر افسانہ نگار کو عرفِ عام میں زندگی کی عکاسی اور سماج کی درستی کا کریڈٹ دیا جاتا ہے۔ صیغہ واحد متکلم یا کہانی کار کے سیدھے سادے بیانیے میں کہیں بھی زندگی کی کشاکش افسانے میں ظاہر نہیں ہوتی۔ تو کیا ان افسانوں کو پڑھ کر ہم افسانہ نگار سے وہ کریڈٹ واپس لے لیں جو ہم پہلے اسے دے آئے ہیں؟ یہ ہے وہ نظریاتی جبریت جس سے ادب و نقد کی شرمساری کا مرحلہ آغاز ہوتا ہے۔

دیکھیے، بات یہ ہے کہ لکھنے والے سے قاری کے جو بھی مطالبات ہوں وہ سر آنکھوں پر، لیکن افسانہ نگار کے فنی کمال کا تعین اس سے نہیں ہوتا کہ اس نے سماج کی کتنی زندہ تصویریں پیش کی ہیں یا یہ کہ معاشرے کے

کتنے عیب گنوائے ہیں اور کس کس ثواب کو بیان کیا ہے؟ اس کا اصل کام یہ نہیں ہے، بلکہ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس نے اپنے سماج، اپنی تہذیب، اپنی زندگی کے جو رخ پیش کیے ہیں اور جو تصویریں دکھائی ہیں، ان سے معانی کیا پیدا ہوتے ہیں؟ اور پھر یہ کہ جو معانی پیدا ہوتے ہیں، وہ کسی خاص مذہبی، فکری یا نظری دائرے میں انسانی احساس سے relate کرتے ہیں یا ان سے بلند ہو کر ہمیں بلا تفریق مذہب و نسل محض انسانی رویے اور طرزِ احساس کو سمجھنے کی راہ سجھاتے ہیں۔

کسی بھی جینوئن افسانہ نگار کا یہ مسئلہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ سماج کی تصویروں کا کوئی البم مرتب کرے۔ اسے براہ راست نتائج یا منضبط خیالات سے کچھ بہت زیادہ دلچسپی بھی نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کے فن کا کمال یہ ہے کہ وہ سماجی احوال کی کوئی سالانہ ریکارڈ بک ترتیب دے۔ اس کی توجہ تو ان روزمرہ تبدیلیوں پر مرتکز ہوتی ہے جو سماج کے اجتماعی شعور میں غیر محسوس انداز اور نہایت خاموشی سے رونما ہوتی چلی جاتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں پہلے پہل پیدا تو افراد کی زندگی میں ہوتی ہیں لیکن دھیرے دھیرے یہ پورے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ یہ تہذیبوں اور معاشروں کی کایا کلپ کا عمل ہے۔ بڑا تخلیقی فن کار اسی عمل کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور یہی کوشش اس کے فن کا جواز قرار پاتی اور اس کی تخلیقی شخصیت کی شناخت بنتی ہے۔ وہ صحافی نہیں کہ ہم تک معاشرے کی روزمرہ خبریں پہنچاتا رہے، وہ مورخ یا وقائع نگار بھی نہیں ہے کہ اپنے عہد کی تاریخ یا واقعات کو قلم بند کرتا رہے، وہ مصلح بھی نہیں ہوتا کہ اصلاحِ معاشرہ کے لیے قصے گھڑتا اور سماج سدھار اداروں کے لیے کام کرتا رہے۔ ہاں، یہ درست ہے کہ اس کے اندر یہ سب افراد اپنے احساسات اور مدرکات کے ساتھ کسی نہ کسی شکل میں موجود ہوتے ہیں لیکن کہانی کار ان تینوں میں سے کسی کے لیے کام نہیں کرتا، کام وہ اپنا ہی کرتا ہے۔ وہ ان تینوں کے مجموعے سے سوا ہوتا ہے۔ چناں چہ وہ صرف زندگی کو نہیں دیکھتا بلکہ اس کی نظریں اس کے ماسوا تک دیکھنے کی جستجو میں رہتی ہیں۔ یہ ورائے حیات کا نظارہ ہے، افراد کو اور سماج کو ان کے تہذیبی و ثقافتی منظرنامے میں دیکھنا۔

اچھا تو اب آپ "یوم کپور" کے narrator کو دیکھیے، کیا اس کا گریہ ایک فرد کا گریہ ہے؟ یا یہ صدیوں کا سفر کرتی تہذیب کے برگشتہ عنصر کا گریہ ہے جو اس تہذیب کی متوازی پگڈنڈی پر سفر کر رہا ہے۔ پھر "باسودے کی مریم" کی طرف آئیے۔ کیا مریم ہند اسلامی کلچر کی اس قوت کا استعارہ نہیں جو اپنے مرکز سے دور ہے، اس کے تاریخی و جغرافیائی فکر و فہم سے عاری ہے لیکن اس کے باوجود یہ قوت کھینچتی ہے اپنے مرکز ہی کی طرف۔ یہ را مٹیریل ہے جسے زمانے کے سہاگے نے unpurify نہیں کیا ہے۔ اور وہ اس کا بیٹا ممدو... مریم کی معصوم روح کے بطن سے پھوٹتا ہوا انحراف کا بیج جو عذاب کی طرح مریم کی جان سے ایسے لگا ہوا ہے کہ مرتا ہے اور نہ مانجھا دیتا ہے۔ ان دونوں کرداروں کے ساتھ اسد محمد خاں نے ہند اسلامی کلچر کے جن زاویوں کو دیکھا ہے، ان کا بے حد بلیغ بیان اس افسانے کی اختتامیہ سطریں ہیں:

> اماں حج کر کے لوٹیں تو بہت خوش تھیں۔ کہنے لگیں، "منجھلے میاں! اللہ نے اپنے حبیب کے صدقے میں حج کرا دیا۔ مدینہ طیبہ کی زیارت کرا دی اور تمھاری انا بوا کی دوسری وصیت بھی پوری

کرائی۔ عذاب ثواب جائے بڑی بی کے سر۔ میاں! ہم نے تو ہرے بھرے گنبد کی طرف منہ کر کے کہہ دیا کہ یارسول اللہ! باسودے والی مریم فوت ہو گئیں، مرتے وخت کہہ رئی تھیں کہ نبی جی سرکار! میں آتی ضرور مگر میرا ممدو بڑا حرامی نکلا۔ میرے سب پیسے خرچ کرا دیے۔

یہاں بھی فقرے اپنے پورے معانی دیں گے لیکن افسانے کے تسلسل میں جب ہم ان اختتامی سطروں تک آتے ہیں تو افسانے کا ابلاغ ہمیں اس بلند سطح پر لے جاتا ہے جہاں ہم پر ادب کی ماہیت کھلتی ہے۔ انسان کے خارج کو رنگنا تو کوئی ایسا کام نہیں ہے، یہ کام تو سیاسی جماعتوں کے نعرے اور ٹیلی ویژن کے نغمے بھی کر لیتے ہیں لیکن افسوس کہ کرنے والوں نے ادب سے کیا بھی تو ایسا سرسری اور چھوٹا مطالبہ کیا۔ ادب تو انسان کے باطن کو رنگتا ہے اور اس طرح رنگتا ہے کہ جیون کا رنگ ہی بدل جاتا ہے۔ ایسے افسانے تو انسان کے درون کو تغیر آشنا کرتے ہیں۔ اس کے اندر ایک نئے آدمی کو جنم دیتے ہیں۔ اس کی قلب ماہیت میں معاون ہوتے ہیں۔ ہاں، اندر کا تغیر اُن امکانات کے بہ رُوئے کار آنے کا حوالہ ہے جو انسان کے نمو اور نئی صورت گری سے حیات و کائنات کی معنویت کا کوئی نیا پہلو سامنے لاتے ہیں۔ یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید کہ تفسیر ایسے ہی کرداروں سے تو ہوتی ہے اور وہ جو سمرسٹ مام نے کہا تھا کہ یہ کائنات ایک بار وجود میں آ کر مکمل نہیں ہوئی بلکہ ہر نیا فن کار اسے نئے سرے سے تخلیق کرتا ہے، اس کے یہی معنی تو ہیں کہ ہر بڑا فن کار کچھ ایسے کردار تخلیق کرتا ہے جو اس کائنات کی نئی تفہیم اور از سرِ نو صورت پذیری میں کام آتے ہیں۔

اب ذرا ایک نظر "ممی دادا" کے مرکزی کردار پر بھی ڈالتے چلیے۔ ممی دادا کیا تھے؟ ہندو، سکھ، عیسائی، یہودی یا مسلمان، کیا تھے؟ افسانے کی فضا پہلے انھیں مسلمان دکھاتی ہے، پھر غیر مسلم کر ڈالتی ہے... اور آخر میں اس کے باوجود کہ وہ غیر مسلم ثابت ہو چکے ہیں اور خود انھوں نے اس کا اعتراف بھی کر لیا ہے:

"بھان کی گھوڑی مرتے مرتے کالک لگوا دی تو نے... لڑکے کیا سوچیں گے؟" پھر ان کے رونے کی آواز آئی۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ "ٹھی ی ی ک ہے، تیلی کا لمڈا پٹھانوں کے پالے سے پٹھان تو نہیں بن جاتا۔"

لیکن افسانے کا اختتامیہ، خاندان کے سب سے معتبر فرد سے بیان دلواتا ہے اور انھیں ایک بار پھر مسلمان بنا دیتا ہے:

"وہ کوئی بھی تھے، تمھیں بس ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ تم سے محبت کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ تم اپنے دادوں پر دادوں کی طرح عزت کے ساتھ جینا سیکھ جاؤ.... سمجھے! جاؤ اب کھیلو۔" پھر وہ جاتے جاتے غصے سے پلٹے، "اور سنو، کون خبیث کہتا ہے وہ مسلمان نہیں تھے، کون کہتا ہے پٹھان نہیں تھے؟"

کہیے کیا بات دھیان میں آئی؟ ممی دادا چاہے اور جو کچھ بھی تھے لیکن اصلاً وہ ہند اسلامی کلچر کا ایک ایسا جیتا جاگتا کردار تھے جو خاص اسی تمدن کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا، جو اس تہذیب کے اُس جوہر کی نمائندگی کرتا ہے جس میں جذب ہونے اور جذب کرنے کی بے پایاں صلاحیت ہے، جو انسان کی سب سے بڑی جذباتی

عصبیت یعنی مذہب تک کو پیچھے چھوڑ کر انسان کو اس کے خالص انسانی حوالے کی بنیاد پر اوپر اٹھا لیتا ہے، اپنا بنا لیتا ہے۔ تو اسی جوہر کی بنیاد پر میں نے اسد محمد خاں کے افسانوں کو اور ان افسانوں کے کرداروں کو ہند اسلامی کلچر کا نمائندہ کہا ہے۔ یہ کردار صدیوں میں مرتب ہونے والے تمدن نے پیدا کیے ہیں۔ ایک ایسے تمدن نے جس کی معاشرتی hierarchy میں انسانیت پہلے مرتبے میں آتی ہے، زندگی کے باقی سب حوالے بعد کے مراتب میں آتے ہیں۔ یہ کردار اسی تمدن کی تمثیل ہیں۔ جی ہاں، عالم اصغر کا اثباتی مظہر۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان گنگا جمنی کرداروں کی ماہیت کیا ہے؟ کیا وہ ہماری کسی ذہنی، جذباتی یا فکری ضرورت کو پورا کرتے ہیں؟

بات یہ ہے کہ ہمارا عہد تہذیبوں کے انہدام کا عہد ہے۔ سائنس کی ترقی اور ہماری زندگی میں اس کا بڑھتا ہوا دخل، گلوبل ولیج کی راہ ہموار ضرور کر رہا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ہمیں ایک ایسی معاشرت کی طرف لیے جا رہا ہے جس میں معاشروں کی تہذیبی شناخت ختم ہو جائے گی۔ اپنے اپنے معاشی مسئلوں کو حل اور وجودی مسرتوں کے حصول میں سرگرداں افراد کا ایک انبوہِ کثیر اس گلوبل ولیج کی منزلِ مقصود ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ یہ انبوہِ کثیر اپنی روح کے مطالبات سے ناواقف ہے یا ان سے آنکھیں چراتا ہے کہ ان کی آواز پر لبیک کہنا اس کی وجودی مسرتوں کو ملیامیٹ کر سکتا ہے۔ منہدم تہذیب اور منقسم شخصیات... یہ ہے ہمارا آئندہ۔
یہاں ہمیں ٹامس ہارڈی کے حوالے سے لکھا ہوا فرینک او کانر کا وہ فقرہ یاد آتا ہے:

> ...دو تہذیبیں ٹکراتی ہیں تو یہ نہیں ہوتا کہ برتر تہذیب غلبہ پا لے بلکہ ہوتا یوں ہے کہ کم زور تہذیب اس کے بعد دلوں میں پناہ ڈھونڈ لیتی ہے۔

تو بس ہر عہد کا بڑا فکشن اپنے ثقافتی کرداروں کے لیے جو پہلا کام کرتا ہے، وہ یہی ہے کہ انھیں دلوں میں پناہ ڈھونڈ دیتا ہے۔ لہٰذا باسودے کی مریم اور مئی دادا ایسے ہی کردار ہیں اور اسد محمد خاں نے انھیں جس طرح تراشا اور پیش کیا ہے تو اب چاہے وہ ہماری خارجی زندگی کے مصرف کے نہیں رہے لیکن داخلی ضرورت کو ضرور پورا کرتے ہیں۔ اسی ضرورت سے ان کرداروں کی ماہیت طے ہوتی ہے۔ ان افسانوں اور ان کرداروں کے ذریعے فن کار ایک کام تو یہ کرتا ہے کہ ایک طرزِ معاشرت اور ایک تہذیب کو sterilize کر کے محفوظ کر لیتا ہے اور دوسرا کام یہ کرتا ہے کہ ہمیں دوسروں کی زندگی کے وجودی تجربے کو احساس کی سطح پر live کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اس لیے کہ جو تہذیب اور جو کردار اس نے اپنی کہانیوں میں محفوظ کیے ہیں، وہ آرکائیوز اور نیشنل میوزیم میں رکھی ہوئی اشیا کی طرح حنوط کیے ہوئے نہیں ہیں۔ اس کے یہاں تو جو کچھ ہے، زندہ ہے اور اس طرح زندہ ہے کہ اس کا لمس تک محسوس کیا جا سکتا ہے۔ "باسودے کی مریم" اور "مئی دادا" تو اسد محمد خاں کے فنی سفر کے ابتدائی سنگ میل ہیں، آپ وہاں سے آگے کے افسانوں "نربدا"، "موتبر کی باڑی"، "ایک دشت سے گزرتے ہوئے" اور "ندی اور آدمی" تک چلے آئیے۔ آپ کو ہر جگہ احساس کی ایک ایسی لہر موجزن ملے گی جو بیک وقت وجود اور روح کی سطح پر زندگی کے تجربے کو بیان کرتے نظر آتی ہے۔ ایک ایسے intense تجربے کو جو خود آپ کا نہیں ہے لیکن معنویت کے کسی نہ کسی دائرے میں آپ اس سے خود کو شدت

کے ساتھ identify ضرور کرتے ہیں۔

میں نے اوراقِ گزشتہ میں ایک مقام پر حقیقت اور زندگی کی عکاسی کا نعرہ بلند کرنے والوں کو گدگدایا ہے۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ میں ادب میں حقیقی زندگی کے عکس و آہنگ کی پیش کش کے خلاف ہوں۔ نہیں، بلکہ میرا اختلاف تو اس تصور سے ہے جو حقیقت یا زندگی کی عکاسی کے حوالے سے اس قسم کی فرمائش کے پس منظر میں کام کرتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ کہانی کار کا شعور مکمل طور پر اس کے دماغ اور مشاہدے کا مرہونِ منت نہیں ہوتا بلکہ انسانی وجود کے ہر رگ و ریشے سے جو احساسات و مدرکات ترتیب پاتے ہیں اور پھر روح ان احساسات و مدرکات کو اپنے جو معنی دیتی ہے، ان سب کے مجموعے سے کہانی کار کا شعور مرتب ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ جس حقیقت کا سراغ لگاتا اور اظہار کرتا ہے، اس کی تفہیم محض تعقلات کی مدد نہیں ہو سکتی۔

حقیقت نگاروں کا مسئلہ یہی ہے کہ وہ سامنے کی چیزوں اور عقلی تناسبات میں اس درجہ الجھ جاتے ہیں کہ ورائے عقل حقائق تک ان کی رسائی ہو ہی نہیں پاتی۔ سماجی رابطے کا اُتھلا پن اور جذباتی رشتوں کی کچی باتیں وقت گزاری کے مشغلے کے لیے کہانیاں پڑھنے والے قارئین کو پسند آسکتی ہیں کہ ان کا بنیادی مسئلہ (time killing) اس قسم کی باتوں سے حل ہو جاتا ہے لیکن وہ سنجیدہ قاری جو کہانی پڑھنے سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی اپنے مطالبات رکھتا ہے، ان کہانیوں سے اس کی تشفی نہیں ہو سکتی۔ ادب کا سنجیدہ کہانی کار time killing اور recreation of life کے بنیادی فرق کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہے۔ آپ اسد محمد خاں کے افسانے ''فورک لفٹ ۳۵۲ حمود الرحمن کمیشن کے روبرو''، ''طوفان کے مرکز میں'' اور ''وقائع نگار'' پڑھیے اور دیکھیے کہ ہماری ہم عصر سماجی سیاسی زندگی کے کیا کیا احوال و آثار ان افسانوں میں بیان ہوئے ہیں۔ لیکن ان افسانوں میں وہ سماجی حقیقت نگاری کہیں نہیں ملتی جو مثال کے طور پر رضیہ بٹ، سلمیٰ کنول اور بشریٰ رحمن کی 'معاشرتی کہانیوں' میں نظر آتی ہے۔ اصل میں سماجی حقیقت نگاری کا وہ مطالبہ جو کبھی ترقی پسندوں نے کیا تھا، اس کے تو شاید پھر بھی کوئی معانی تھے اور اس تحریک کے زیرِ اثر بعض سنجیدہ لکھنے والوں نے اس مطالبے کو فنی تناظر میں ہی قبول بھی کیا تھا لیکن آج تو اس مطالبے کا مطلب سوائے اس چٹخارے کے اور کچھ رہا ہی نہیں جو ٹیلی وژن کے مقبول رومانی ڈراموں یا ڈائجسٹ کے سلسلوں میں پایا جاتا ہے۔ اہلِ نظر نے اس نوع کی چیزوں کو ہمیشہ لچر پن کا عنوان دے کر الگ رکھا ہے لیکن افسوس کہ آج کی سماجی حقیقت نگاری اور معاشرتی کہانیاں اسی مفہوم و مطلب کی حامل ہو کر رہ گئی ہیں۔ تاہم سنجیدہ لکھنے والے آج بھی پاپولر کہانیوں کے طومار سے الگ ہیں۔ آپ اسد محمد خاں کے ان تینوں افسانوں کا مطالعہ کیجیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ادب کے شعور سے بہرہ مند فن کار اپنے موضوع کے انتخاب ہی میں نہیں اس کے برتاؤ میں بھی کن لوازم کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ ادب تاریخ نہیں ہوتا لیکن کبھی وہ تاریخ کے لیے raw material فراہم کرتا ہے اور کبھی تاریخ کی چھان پھٹک کے لیے وہ Parallel history کی دستاویز مرتب کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے، سو اسد محمد خاں کے مذکورہ بالا تینوں افسانے کچھ اسی نوع کا کام کرتے نظر آئیں گے۔ یہ تینوں افسانے مختلف المزاج ہیں۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ تینوں مختلف واقعات کے تناظر میں لکھے گئے ہیں لیکن اس کے علاوہ

اہم ترین بات یہ ہے کہ افسانہ نگار نے ان کی الگ الگ زمانی واقعیت اور مکانی حوالوں کو معرض اظہار میں لانے کے لیے ایسے اسالیب وضع کیے ہیں کہ حقائق نہ تو افسانے کو خراب کرتے ہیں اور نہ ہی افسانہ حقائق کو مسخ کرتا ہے۔ ان میں بعض مقامات پر افسانوں کی بلکل داخلی ضرورت کے تحت حقیقت اور علامت کا ایک آمیزہ افسانے کے قالب میں ڈھلتا محسوس ہوتا ہے اور کہیں کہیں سادہ بیانیے میں ہلکے رنگوں کا satire اسلوب میں شامل ہوجاتا ہے۔ ایسے مقامات فن اور فن کار کی کڑی آزمائش کے مراحل ہوا کرتے ہیں۔ ذرا سی فنی کمزوری افسانے کو سیاسی نعرہ بنا کر رکھ دیتی ہے یا پھر افسانہ نگار کی ذرا سی بے احتیاطی سے افسانہ تیسرے درجے کے جذباتی ملغوبے میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اسد محمد خاں کے افسانے اس قسم کی کسی پینک میں نظر نہیں آتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے واقعات اور حقائق کو کبھی over play نہیں کیا اور نہ ہی افسانے کو بھاشن دینے کے لیے استعمال کیا ہے، مزید برآں یہ کہ انھوں نے اپنے فن کو نظریاتی آلودگی سے بھی محفوظ و مامون رکھا ہے۔

دیکھیے، یہاں مجھے خیال آتا ہے کہ میں "چاکر"، "مردہ گھر میں مکاشفہ"، "ہٹلر، شیر کا بچہ" اور "ایک دشت سے گزرتے ہوئے" کا حوالہ دوں بلکہ صرف انھیں کا نہیں، طوائفوں کے حوالے سے لکھے گئے افسانوں (مثلاً "برجیاں اور مور"، "اک میٹھے دن کا انت"، "نصیبوں والیاں" وغیرہ) کا بھی ذکر کروں اور ان کے حوالوں اور مثالوں سے واضح کروں کہ اسد محمد خاں نے زندگی کے حقیقی کرداروں، واقعات، معاملات اور مسائل کو کس طرح اپنے افسانوں میں برتا ہے لیکن فلحال بہت تفصیل وطوالت سے حذر کرتے ہوئے بس دو ایک حوالوں پر اکتفا کرتا ہوں:

رجّو نے پیسے لے لیے۔ دیدے گھما کر بولا "سام کائے کو کھلوارئی ہو، دُعا دو۔ دونوں عمر میں چھوٹے ہوں گے تم سے۔"

> دڈی پلّو سے آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ سر اٹھا کے بولی "ہوں گے کیا، پاگلا! دونوں ہی عمر میں چھوٹے ہیں۔ پر گن وان اور کلاونت اپنے کاموں سے بڑے ہوتے ہیں۔ حبیب خاں جس ویلے وینا پہ ہاتھ رکھ دیں یا اللہ رکھا خاں صاحب طبلے کو انگلیاں چھوادیں تو سمجھو اس ویلے سب کے بزرگ بن جاتے ہیں۔ سمجھا کچھ؟" (اک میٹھے دن کا انت)

ایک اور اقتباس دیکھیے:

> شاہ زیب نے ملزم کی ہتھ کڑیوں کا تالا اور بیڑیوں کے رپٹ کھول دیے۔ "ضابطے کے تحت اسے وقوعے کی جگہ پر ادھر ہی دشت میں دفن کیا جاسکتا ہے۔ ویسے بھی حکم ہے کہ جلدی کرنی چاہیے... پر آگے جو بھی آرڈر ہو" مُلاں نے کہا۔
>
> دور درختوں میں تین پرچھائیاں رُکی ہوئی تھیں۔ ان میں سے دو مردوں کی پرچھائیاں تھیں، تیسری ایک عورت کی۔ وہ اتنی دھندلی تھیں اور ایسے لرزتی تھیں کہ ان کے پار دشت کا سب کچھ نظر آتا تھا، بلکل اسی طرح جیسے روحیں جیسٹ کرتے ہوئے فلم کے ڈبل ایکسپوژر میں پرچھائیاں دکھلائی

جاتی ہیں تو ان کے پار بھی سب کچھ نظر آتا ہے۔

نہیں کہا جاسکتا کہ وہ تین، جو اب مل کے بھی زندہ جاوے نہیں بن سکتے تھے، کیا کریں گے؟

آگے کہاں جائیں گے؟ بس دشت کے آف سیٹ میں وہ وہیں رُکے ہوئے تھے۔

اور تبھی کھلا کہ جب کوئی امنگوں بھرا جوان مرتا ہے تو ایک دوست اس کا ایک داشتہ اُسی کے ساتھ مرجاتے ہیں۔ (ایک دشت سے گزرتے ہوئے)

پہلے ذرا 'اک میٹھے دن کا انت' کے اقتباس کو دیکھیے۔ اتنا تو اس ٹکڑے میں اندازہ ہوجاتا ہے کہ ایک کوٹھے والی استادوں کو نیاز گزار رہی ہے۔ یوں تو یہ بس ایک عام سی بات ہے۔ ہر شعبے میں بڑوں کو بعد میں آنے والے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہی ہیں لیکن کوٹھے والوں کا رکھ رکھاؤ اور ان کی ریت رسم تو ہوتی ہی کچھ اور ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان فقروں میں ادا کیے گئے احساسات کے معانی انھی لوگوں پر کھل سکتے ہیں جو کوٹھے کے کلچر سے واقف ہوں لیکن اتنی بات تو ہم سبھی سمجھ سکتے ہیں کہ اس گئے گزرے زمانے میں کہ جب کوٹھوں کی تہذیب رخصت ہو چکی، اب تک وہاں یہ چلن باقی ہے کہ بڑوں کی نذر نیاز اور ادب احترام کانوں کی لویں چھو کر کیا جاتا ہے۔ یہ کسی شخص کا نہیں بلکہ اُگنوں کا اعتراف ہے۔ آدمی کی قدر و منزلت کسی اور شے میں نہیں اس کے کمالِ فن میں مضمر ہوتی ہے۔ بڑا تو آدمی کو اس کا کام بناتا ہے۔ یہ اعتبار کی دنیا ہے۔ بظاہر ایک چٹخارے کے ساتھ شروع ہوتی اور آگے بڑھتی اس کہانی کے عقب میں جھانک کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ افراد کی توقیر ہی میں نہیں، خود اُن کے رویوں کی تشکیل میں بھی معاشرے کی تہذیب و ثقافت کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔ بلند ترین تصورات کی سطح سے لے کر اراذل و اسفل شعبوں تک حفظِ مراتب کا یہ پورا نظام کام کرتا ہے۔ اسد محمد خاں کے فن میں ہمیں اپنی ثقافتی اقدار کی ایسی ایسی متحرک تصویریں مل جاتی ہیں جو اب معاشرے میں مفقود ہو چکی ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسد محمد خاں نے ان تصویروں کو اچھائی اور برائی کے لیبل لگائے بغیر دکھانے یا محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے اور یہی فن کا اصل مقصود ہوتا ہے۔

دوسرا اقتباس جس کہانی سے لیا گیا ہے وہ تو اپنی تکنیک میں بھی ایک نہایت عمدہ تجربہ ہے۔ ماضی و حال کے منظروں، کرداروں کی داخلی و خارجی صورتِ حال اور ان کے احساس و حقیقت کو جس خوبی کے ساتھ اسد محمد خاں نے بلینڈ کیا ہے، اُس سے افسانے میں معانی کی مختلف جہتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اس افسانے کی خاص بات یہ ہے کہ یہ اگر ایک طرف علامت اور تجرید کے الگ الگ تناظرات میں اپنے معانی متعین کرنے میں کامیاب رہتا ہے تو دوسری طرف حقیقت نگاری کے حوالے سے بھی اسے ایک عمدہ مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسد محمد خاں نے افسانے کو جس طرح conclude کیا ہے، اُس سے اس میں ایک سیاسی جہت بھی نمایاں ہوجاتی ہے۔ اب افسانے کے معانی بلکل بدل جاتے ہیں۔ افراد کی بے حسی اور سفاکی کا وہ رویہ جو گاہ گاہ افسانے میں ہمارے سامنے آتا رہا ہے، اب اُس کا مفہوم ہم واضح طور پر سمجھ سکتے ہیں... اور اس کے تضاد میں دوست اور داشتہ کی شخصیات کو جس طور پیش کیا گیا ہے، وہ ان کرداروں کی انسانیت کو نہایت شدت کے ساتھ اُجاگر کرتا ہے اور تہذیبِ نو کے آئین اور اصولوں کے آگے سوالیہ نشان لگا دیتا ہے۔

بات یہ ہے کہ اسد محمد خاں کا افسانہ خواہ وہ ''وقائع نگار'' ہو، ''طوفان کے مرکز میں'' ہو، ''مردہ گھر'' ہو، ''اک میٹھے دن کا انت'' یا ''ایک دشت سے گزرتے ہوئے''... ان کے یہاں ہمیں کسی بھی مقام پر نہ تو سیاست و تاریخ پڑھنے کو ملتی ہے اور نہ ہی صرف زندگی... بلکہ ہم ان کے افسانوں میں افسانے ہی پڑھتے ہیں۔ جی ہاں، افسانے... جو ادب ہیں اور وہ ادب جو ہمیں مسکّن ادویات کی طرح entertain نہیں کرتا بلکہ ہمارے احساس کے تاروں کو جھنجھنا دیتا ہے اور ہمیں زندگی کے سوالوں پر سوچنے کی راہ دکھاتا ہے۔ ان افسانوں کا لکھنے والا نہ تو خود at ease ہے اور نہ ہی ہمیں at ease رہنے دینا چاہتا ہے۔ اس نے راست زندگی کو نہیں لکھا، نہ ہی رومانس کی نیلگوں فضائیں اس کے افسانوں کے موسموں میں رنگ بھرتی ہیں اور نہ ہی حیاتِ انسانی کے دکھوں، محرومیوں اور نارسائیوں کو glamourize کرنے میں اس نے اپنے فن کا آب و رنگ خرچ کیا ہے۔ وہ زندگی کو نہ تو equations میں سوچتا ہے اور نہ ہی لکھتا ہے۔ وہ نہ تو کسی نظریے کا طرف دار ہے اور نہ کسی اخلاقی منصوبے کا نمائندہ۔ کسی قسم کی اخلاقی کارگزاری، نظریاتی آسودگی یا جذباتی تسکین کی خاطر کہانیاں پڑھنے والے لوگوں کو اسد محمد خاں کے افسانے پڑھ کر سخت مایوسی ہوگی۔ اسد محمد خاں ہمارے عہد کے اُن لکھنے والوں میں ہیں جو زندگی اور اس کے مظاہر کو دیکھتے ہیں تو سوالوں سے دوچار ہوتے ہیں اور ان کا فن ان سوالوں کا سامنا کرنے کی جرأت سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسے لوگ لکھتے ہوئے عوام الناس کی خواہشات اور مطالبات کو نہیں بلکہ اپنے فن کے تقاضوں اور فکر کے زاویوں کو سامنے رکھتے ہیں۔ ان کا افسانہ اپنے اظہار و ابلاغ میں زندگی کے عام سے تناظر اور معمولی مسائل سے شروع ہو کر ورائے اور اک حقائق کی طرف اپنے پڑھنے والوں کو لے کر چلتا ہے۔

دیکھیے، بات یہ ہے کہ کہانیاں ہمیں ایک زندگی میں ایک سے زیادہ زندگیاں جینے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ کس طرح؟ یوں کہ ان کے احوال و کوائف سے ہم identify کرتے ہیں، اپنے احساس کو، اپنی سوچ کو، اپنے وجود کو... اور اپنی روح کو۔ اسد محمد خاں کا افسانہ ایک ایسے آمیزے کی صورت رکھتا ہے جس کے تمام عناصر ایک خاص تناسب کے ساتھ گوندھے گئے ہیں... لیکن انھیں الگ الگ کر کے شناخت کرنا ممکن نہیں... ہماری زندگی کے اپنے آمیزے کی طرح کہ اس کی ساری رونق، چاشنی اور رنگ و آہنگ جو کچھ بھی اس میں ہے، وہ اصل میں اس کی کلیت میں ہے۔ کسی بھی لکھنے والے کے یہاں یہ صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ زندگی کو کسی آدرش، کسی نظریے، کسی ایجنڈے کے تحت نہیں دیکھتا اور نہ ہی ایسی کسی خارج سے عائد ہونے والی cause کو serve کرنے کی خاطر لکھتا ہے بلکہ یہ صورت تو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ تجربۂ حیات کو اور انسانوں کو خود ان کی اصل حالت پر قبول کرنے لگتا ہے، نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ لکھنے والے کے اپنے تعصبات نہیں ہوتے یا یہ کہ وہ کوئی ترجیحات نہیں رکھتا یا یہ کہ وہ جب لکھنے بیٹھتا ہے تو اپنے تعصبات اور ترجیحات کو یکسر ترک کر دیتا ہے۔ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ یہ تو پیغمبرانہ شان ہے۔ ہاں، اس شان میں سچے اور بڑے لکھنے والے کا اتنا حصہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ اپنے تعصبات اور ترجیحات کے پورے نظام کو اپنی تحریر میں suspended حالت میں ظاہر کرتا ہے... وہ بھی اگر ظاہر کرنا ازبس ضروری ہو تو۔ اسی خصوصی

استعداد کی بنا پر وہ دوسروں کو جو، جہاں اور جیسا ہے کی بنیاد پر قبول کرتا ہے اور باور کرتا ہے کہ ہر انسان میں احساس اور عمل کا نظام بیک وقت اچھائی اور برائی کے متضاد رویوں کے تحت کام کرتا ہے۔ اسد محمد خاں کے افسانوں میں ہمیں خراب جگہوں اور خراب لوگوں میں جو ایک خوبی یا اچھائی کی اچانک جھلک دکھائی دے جاتی ہے یا کہیں اچانک اچھائیوں کے جھرمٹ میں چھپی ہوئی برائی نظر آجاتی ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ انھوں نے اپنے کرداروں کو انسانی سطح پر دیکھا اور انسانی حوالوں سے برتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانی کیمسٹری کسی ملٹی نیشنل میڈیسن کمپنی کی کیمسٹری لیب کے نتائج کی پابند نہیں ہوتی۔ وہ اپنے نتائج اپنے اصولوں کے تحت ترتیب دیتی ہے، proto types کے تحت نہیں۔ آپ چیخوف کے افسانوں میں دیکھیے، کیسے کیسے کردار نظر آتے ہیں۔ نہایت زندہ کردار مگر زندگی کی عین مطابقت میں نہیں... کہیں اس سے زیادہ اور کہیں اس سے کم۔ آپ چیخوف کی ایک کہانی کے اُس کوچوان کو یاد کیجیے جو سارا دن لوگوں کے ساتھ گزارتا ہے، صبح سے شام تک مسلسل لوگوں کے بیچ... لیکن سخت تنہائی کے احساس سے دو چار۔ لوگ اس سے باتیں کرتے ہیں، وہ بھی ان سے بات کرتا ہے لیکن وہ بات جو وہ بتانا چاہتا ہے، نہیں بتا پاتا... اور پھر جب رات میں وہ اپنے گھوڑے کو تھان پر لا کر کھولتا ہے تو اس سے اپنی بات کہتا ہے۔ دیکھیے، کہانی کے اختتام پر لا کر چیخوف نے پورے معاشرے کے بیچ فرد کی تنہائی کو کتنا بڑا اور کتنا حقیقی بنا دیا ہے۔ کیا یہ تنہائی واقعی اتنی ہے جتنی کہ ہم زندگی میں دیکھتے ہیں؟ نہیں، یہ اس سے کہیں زیادہ بڑی ہے۔ میں نے ابتدا میں بتایا کہ پہلے پہل مجھے اسد محمد خاں کے کردار بلکل حقیقی زندگی کے مماثل نظر آئے، لیکن بعد میں مجھے اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ یہ کردار حقیقی زندگی کے کرداروں سے کہیں کہیں بڑے ہو جاتے ہیں، خاصے بڑے۔ میں اسد محمد خاں کو اردو کا چیخوف نہیں بنا رہا ہوں محض مناسبات کی نشاندہی مقصود ہے، آپ اسد محمد خاں کا افسانہ "طوفان کے مرکز" میں پڑھیے اور دیکھیے کہ افسانہ نگار نے زندگی کے integrated vision کو ٹوٹنے کے عمل کو کس طرح مجسم کر دیا ہے۔ اسی طرح "موتبر کی باڑی" میں دیکھیے، اختتامیہ ساری دبدھا کو کیسی reality میں منقلب کرتا ہے... انسانیت اور محبت کا اصل روپ کس طرح بے نقاب اور بے حجاب ہو کر ہمارے سامنے اُبھرتا ہے۔ تو یہاں آ کر ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ فن زندگی کے اسکیل پر خود زندگی سے بڑھ جاتا ہے۔ افسانے کی سچائی زندگی کی سچائی سے زیادہ بڑی اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔

یہاں اہم سوال یہ ہے کہ فن larger than life کیسے ہو جاتا ہے؟ ایسے ہو جاتا ہے کہ وہ ورائے زمان و مکاں سفر کرتا ہے اور اپنے ساتھ ساتھ خود تجربہ حیات کی نئی معنویتیں دریافت کرتا چلا جاتا ہے۔ اس میں فرد کی سچائی absolute انسانی سچائی میں ڈھل جاتی ہے اور یہ سچائی کسی تہذیبی، سماجی، تاریخی اور سیاسی حوالے کے بغیر بھی ہم سے اپنا اثبات کراتی اور رشتہ استوار کر لیتی ہے۔ آپ "زبدا"، "رگھوبا اور تاریخ فرشتہ"، "جانی میاں"، اور "ایک دشت سے گزرتے ہوئے" کے کرداروں کو ملاحظہ کیجیے۔ کیسے دلچسپ تضادات کی دنیا اور گہرے انسانی رویوں کا منظر نامہ اجاگر ہوتا ہے۔ کئی مقامات پر ہم ان کرداروں اور ان کی صورتِ حال سے یوں مربوط ہو جاتے ہیں کہ ان کے تجربے اور احساس کی گواہی دینے لگتے ہیں۔ نارنگ سنگھ، سارنگ سنگھ اور

لڑکی (زبدا)، رگھوبا،تسم چند، امتے (رگھوبا اور تاریخ فرشتہ)، جانی میاں، ریٹابائی، وحید، سلطان بھائی (جانی میاں)، باوا، رگاں، اللہ بخش، کالا ناگ (ایک دشت سے گزرتے ہوئے) ذرا ان کرداروں کو دیکھیے...
ویسے یہاں پہلے میں ایک بات واضح کردوں کہ بہت ہاتھ کھینچ کر گنائے ہیں میں نے یہ کردار، ورنہ اسد محمد خاں کی کہانی چاہے، وہ مکمل narration ہی میں کیوں نہ ہو، اس کے کرداروں سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں۔ خیر، تو جب ہم ان کرداروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو انسانی فطرت کی شیرینی، ملاوت، تلخی، تیزی، ترشی اور نمک، غرض ہر ذائقہ الگ الگ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اب لطف کی بات یہ ہے کہ ان میں بعض کردار تو ایسے ہیں کہ بیک وقت تلخ، ترش، شیریں محسوس ہوتے ہیں۔ میں نے آغاز میں کہا تھا کہ اسد محمد خاں کے جہانِ افسانہ وافسوں میں ہمارا واسطہ ایسے لوگوں سے پڑتا ہے کہ اچھوں میں گنے جائیں مگر بُروں میں بھی الگ نہیں لگتے... ساتھ ہی ساتھ بُروں میں ایسی اچھائیاں کرنے والے بھی نظر آتے ہیں کہ انسانیت کی مثال ٹھہرائے جائیں۔ تو اسد محمد خاں کے فن کا امتیاز اصل میں یہی ہے کہ مسلسل suspension of belief پر اصرار کرتا ہے۔ یہ کردار زندگی کی عکاسی تو کرتے ہیں لیکن محض زندگی کی عکاسی معراجِ فن نہیں ہے۔ فن کا کمال تو یہ ہے کہ وہ جو سامنے نظر آرہا ہے، اس کے پس منظر کی خبر لے آئے... وہ جو اصل دکھائی دے رہا ہے، اس کی بنیاد کا سراغ پالے اور اس سے بھی آگے یہ کہ اس کے گزشتہ کو حال ہی سے نہیں، آئندہ سے بھی مربوط کر کے دکھائے۔ یہی ہے فن کو larger than life بنانے والی reality۔ سارنگ سنگھ، رگھوبا، امتے، جانی میاں، جاوا، اللہ بخش کالا ناگ... دیکھیے تو سہی کہ صرف انسان کی نہیں بلکہ انسانیت کی کیسی کیسی حقیقتوں کے مظہر ہیں یہ کردار۔ ان حقیقتوں کے جن کو سہارتے ہوئے خود زندگی پچک جاتی ہے، بچیں بول جاتی ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ اپنی جگہ سے سرکتے ہیں تو سماج کی بولیں ہل جاتی ہیں۔ حالاں کہ یہ کردار تو کسی سماجی وسیاسی نظام کے نمائندے ہیں اور نہ ہی کسی اخلاقی و مذہبی فکر کے رول ماڈل۔ بس انسان ہیں... انسان کا وہ سانچہ کہ جس کی realities سے دوسرا انسان باوجود اختلافات اور ناپسندیدگی کے، خود کو associate کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے نہیں رہ سکتا کہ یہ کردار اپنی اچھائی اور برائی کے دائرے میں فطرتِ انسانی کو کھولتے ہیں... generic انسان کو decode کرتے ہیں۔

اسد محمد خاں کے فن کی بنیادی جستجو اصل میں انسان کو اس کی سرشت میں مثبت و منفی علائق کے ساتھ سمجھنے سے عبارت ہے۔ ہم ان کے پورے فنی سفر کو سامنے رکھ کر اس نکتے کو بہتر انداز میں سمجھ سکتے ہیں۔ ان کے پہلے مجموعے ''کھڑکی بھر آسمان'' کے افسانے ہوں جو افراد اور ان کے شخصی کردار کو موضوع بناتے ہیں یا دوسرے مجموعے ''برجِ خموشاں'' کے افسانے کہ جن میں حالات اور واقعات پر کرداروں کی بہ نسبت افسانہ نگار کی توجہ زیادہ محسوس ہوتی ہے... اور آخری دونوں مجموعوں ''غصے کی نئی فصل'' اور ''نربدا اور دوسری کہانیاں'' میں تو خیر اب ان کی کہانی بنتی ہی افراد اور اس کے ماحول کے ایسے تال میل سے ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا محال ہے۔ لیکن از اول تا آخر ہم ایک بات بخوبی محسوس کر سکتے ہیں کہ اسد محمد خاں نے خواہ افراد کی کہانیاں لکھی ہوں یا ماحول کی یا پھر دونوں کے گھال میل سے قصہ بنایا ہو لیکن ان کی خاص توجہ اصل میں فرد کی

اس سرشت پر رہتی ہے جو نیکی میں بدی اور بدی میں نیکی کے اصول خود بناتی اور ان کے تحت کام کرتی ہے۔ ان اصولوں کی ہماری سماجی صورتِ حال، اخلاقی اور اقداری نظام سے کوئی relavance ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے تو وہ محض انسانی اور اتفاقی ہے۔ ہم اسد محمد خاں کے کرداروں کی اکثریت کو اچھا کہیں یا بُرا لیکن اتنی بات ہمیں بہر طور تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ یہ کردار پوری سچائی کے ساتھ نظر آتے اور زندگی کو پورے وجود سے بسر کرتے ہیں۔

اسد محمد خاں کے جہانِ افسانہ میں ہمیں رذیل اور کمینے لوگوں سے زیادہ واسطہ پڑتا ہے۔ اس کا کیا سبب ہے؟ بات یہ ہے کہ انسان کا خمیر اٹھا تو خیر سے ہے لیکن اس کے ساتھ نفس کا جو لازمہ لگا ہوا ہے وہ بدی کو کسی لمحے اس سے الگ ہونے کا موقع فراہم نہیں کرتا۔ ادب و فن کا کلاسیکی تصورِ انسان میں خیر کے عنصر کو غالب سمجھتا اور غالب پیش کرتا ہے، جب کہ نئے ادب کا مسئلہ یہ ہے کہ یہ خیر کا انکار تو نہیں کرتا لیکن یہ انسان کے اندر خیر کو غالب بھی نہیں سمجھتا۔ اس نے زندگی کو خیر و شر کی آویزش میں دریافت کیا ہے اور شر کو خیر پر غلبہ پاتے دیکھا ہے۔ چناں چہ اسد محمد خاں، کہ جدید عہد کے افسانہ نگار ہیں، انھوں نے اپنے فن میں جو انسانی صورتِ حال پیش کی ہے وہ خیر و شر کی اسی نئے تصور کے تحت وقوع پذیر ہوتی ہے۔ اور یہاں ہمیں اس حقیقت کو بھی پوری سچائی کے ساتھ تسلیم کرنا چاہیے کہ انسانی فطرت میں داخل شر کے عنصر کا جو اظہار ہمارے عہد کی زندگی میں ہو رہا ہے وہ غالباً اس سے قبل کی انسانی تاریخ میں نظر نہیں آتا۔ اس عہد میں بدی زیادہ طاقت ور ہی نہیں ہوئی ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہول ناک بات یہ ہے کہ اس نے نیکی پر غلبہ پانے کے لیے خود نیکی کے اوزاروں کو بھی استعمال کرنا سیکھ لیا ہے۔

اب آخر میں آ کر میں ضمناً اسد محمد خاں کے بارے میں سامنے آنے والے دو ایک تاثرات پر بھی اظہارِ خیال کرنا چاہوں گا۔ اسد محمد خاں کے افسانوں کی بابت ایک رائے یہ پائی جاتی ہے، اور اس کا اظہار نہایت خوشی کے ساتھ کیا جاتا ہے، گویا ایسا ان کی کسی خوبی کے اعتراف میں کیا جا رہا ہے اور اس کا جواز ان کی "پٹھانیت" کو قرار دیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں غصے کی ایک لہر کو ہمہ وقت دوڑتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ان کے ایک مداح نے ان کے طوائفوں والے افسانوں کے لیے وفورِ جذبات میں یہ بھی کہا کہ افسانے میں بجلیاں سی دوڑتی محسوس ہوتی ہیں۔ سبحان اللہ، جیسی جس کے گمان میں آئی۔ یاروں کے کھیل نرالے، کہیں فن میں بھی نسلی تعصب کی گنجائش نکال لیتے ہیں اور کہیں اپنے ناگفتہ جذبوں کی تھکن دور کرنے کے لیے افسانے سے وہ نسخۂ کیمیا برآمد کر لیتے ہیں جو رگ و پے میں بجلیاں دوڑا سکتا ہے۔ اصل میں اس قماش کے لوگ بھول جاتے ہیں کہ ذمہ دار کہانی کار اپنے کرداروں اور ان کی تقدیر سے صرف اور صرف فکری، ذہنی یا نظری رشتہ نہیں رکھتا بلکہ ان سے اس کی وابستگی احساس اور جذبے کی سطح پر بھی نہایت مستحکم ہوتی ہے۔ چناں چہ اسد محمد خاں کے یہاں جس شے کو غصے اور برقی لہر سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ اصل میں کہانی کار کی اسی وابستگی و پیوستگی کی قوت ہے۔ یہ کردار کو محض اس کے وجود میں نہیں بلکہ روح میں جاننے اور بیان کرنے کا ہنر ہے اور کہانی کار اس ہنر کو استعمال کرنا اُسی وقت سیکھتا ہے جب وہ اپنے کردار اور اس کی تقدیر سے اپنے تئیں مستحکم

رشتے استوار کرتا ہے۔ یہ فن اور زندگی کو احساس کی بلند سطح پر آمیز کرنے کا تجربہ ہے، اس بلند سطح پر جہاں فن چقماق بن جاتا ہے اور زندگی سے رگڑ کھاتا ہے تو چنگاری پیدا کیے بغیر نہیں رہتا۔ ایک ایسی قوت کے قالب میں ڈھل جاتا ہے جو اپنے اظہار کے لیے راہ خود نکال لیتی ہے۔

ایک بات اور، اسد محمد خاں نے اپنے افسانوں میں اسلوب، تکنیک اور بیانیہ کے بہت تجربے کیے ہیں۔ ان کے پیش روؤں میں پریم چند، منٹو، بیدی اور عزیز احمد کے یہاں بھی ہمیں اس نوع کے خاصے تجربات ملتے ہیں لیکن مختلف المنہاج تجربوں کا جو سلسلہ ہمیں اسد محمد خاں کے یہاں ملتا ہے، وہ اپنی نوعیت میں الگ بھی ہے اور دل چسپ بھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ سبقت افسانہ نگار کے کام کے مجموعی تخمین وظن میں کام آسکتی ہے؟ جی ہاں آسکتی ہے لیکن اس کا فیصلہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم ان تجربوں کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ دیکھنا یہ ضروری ہے کہ کیا یہ تجربے کسی قسم کے فنی التزام کا حاصل ہیں یا افسانے کی ماہیت اور افسانہ نگار کے فنی سفر کی کسی داخلی ضرورت کے نتیجے میں رونما ہوئے ہیں؟ اگر ان تجربوں کا اہتمام محض فنی التزام کی بنا پر ہو تو بھی اس کی داد افسانہ نگار کو ضرور دی جانی چاہیے۔ اس لیے التزام سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فنی التزام اگر معنویت کی افزونی کے لیے ہے تو بڑا کام ہے بصورتِ دیگر محض آرائش۔ کلیاں پھندنے ٹانکنا بھی ایک کام تو ضرور ہے لیکن زندگی کے بڑے تجربوں کی معنویت کھولنے میں یہ کام کچھ ایسا مفید مطلب ثابت نہیں ہوتا۔ خیر، stylists کی اہمیت ہر زمانے اور ہر ادب میں رہی ہے لیکن اصل میں بڑا فن کار وہ ہے۔ جس کا ہر کام اس کے فن کے بنیادی نکتے کی تشکیل وتعبیر میں کوئی نہ کوئی کردار ادا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ موپاساں کو لیجیے۔ اس کے یہاں آپ کو ہر فنی تجربہ اس کے معنوی تجربے سے منسلک ملے گا۔ ہیمنگوے کو دیکھیے، یہی صورت نظر آئے گی۔ بورخیس کے یہاں ملاحظہ کیجیے، ایسا ہی نقشہ ملے گا۔ غرض کہ بڑا افسانہ نگار اپنے فن کے ہر ایک جزو اور ہر ایک عنصر کو برتتے ہوئے ایک نامیاتی وحدت میں ڈھالتا ہے اور ایک کُل میں جوڑتا ہے اور اس کُل سے اپنے معانی وضع کرتا ہے۔

آخری بات... اگر ہم سے کوئی یہ دریافت کرے کہ بھئی اسد محمد خاں کا خاص رنگ کیا ہے؟ تو ہم مخمصے میں پڑ جائیں گے۔ ہاں واقعی اسد محمد خاں کا تو کوئی خاص رنگ ہے ہی نہیں۔ ان کے یہاں تو ہمیں کوئی patent اسٹائل ملتا ہی نہیں۔ تو وہ لوگ جو ادب میں کسی خاص رنگ اور کسی خاص اسٹائل کے بغیر لقمہ توڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے، اسد محمد خاں کا افسانہ ان کا کپ اوف ٹی نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہاں ایک لمحے کے لیے رُک کر ہمیں یہ جاننے کی کوشش ضرور کرلینی چاہیے کہ آخر اس زندگی کا اور اس کائنات کا بھی کیا کوئی خاص رنگ یا خاص اسلوب ہے؟ جی ہاں، اس سوال کا جواب ہی اس قضیے کو حل کرسکتا ہے کہ ایسا کوئی مطالبہ کسی فن کار سے کیا بھی جانا چاہیے یا نہیں۔ تو جواب یہ ہے کہ نہیں کیا جانا چاہیے۔ اس لیے کہ خود حیاتِ انسانی کا اور انسانوں کی اس کائنات کا کوئی مخصوص رنگ نہیں ہے۔ یہاں تو رنگارنگی بہار دکھاتی ہے۔ جس طرف نگاہ کیجیے، نگارِ ہزار شیوہ رُو بہ رُو ہے، دُکھ کے ہزار رنگ ہیں اور سکھ کے بھی ہزار رنگ۔ اور لطف یہ ہے کہ ان میں بھی کبھی کوئی رنگ dominate کرتا ہوا نظر آتا ہے اور کبھی کوئی رنگ۔ تو وہ لوگ جنھوں نے ایک خاص رنگ اور ایک خاص

اسلوب وضع کر لیا، ان کے فن کا داخلی مطالبہ وہی ہوگا۔ انھیں ہم مسترد نہیں کرتے، بلکہ ان کا احترام اپنی جگہ ہے۔ تاہم یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ جس فن کار نے ایسا نہیں کیا وہ بھی اپنے کسی داخلی فنی مطالبے کی وجہ سے نہیں کیا ہوگا۔ اسد محمد خاں کے افسانوں کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہر نیا قصہ ایک نئے تجربے کے ساتھ اس لیے آتا ہے کہ یہ حقیقت کو ہر رُخ سے جاننے اور ہر رنگ میں دیکھنے کی جستجو کا حاصل ہے۔ جب انسان خود کوئی فارمولا نہیں ہے تو آخر اس کے بیان کو کسی فارمولے میں کیوں کر ڈھالا جا سکتا ہے؟ اسد محمد خاں نے اصل میں اپنے کرداروں کو ان کے الگ الگ زمانوں اور الگ زمینوں میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ہر تجربے کے ساتھ نئی زمین نئے آسمان تراشنے کا عمل ہے۔ انسانی احساس کو پرت در پرت کھولنے کی آرزو کا سفر۔ نئے جہانِ معانی کی ہمہ وقت جستجو کا سفر۔ تو بس یہ ہے کہ ہمیں ایسے فن کاروں کو اپنے لگے بندھے فرمائشی پروگراموں کے ساتھ نہیں پڑھنا چاہیے بلکہ ان کے مطالعے میں اس آزادی کو روا رکھنا چاہیے جو انسانی زندگی کے داخلی مطالبات سے مرتب ہوتی ہے۔ اور ادب و فن اسی کے لیے اور اسی کے ساتھ کام کرتے ہیں۔

■■

اسد محمد خاں

ایک واقعہ

احمد ندیم قاسمی صاحب بارہا کراچی تشریف لائے تھے اور اُن سے محبت کرنے والوں نے، اس شہر کے حوالے سے بھی، بہت کچھ اپنی یادوں میں بسا رکھا ہے۔

میرے پاس بھی سنانے کو ۷۰/ ۷۱ ء کی ایک مہکتی ہوئی یاد محفوظ ہے۔

مَیں نے ۵۸/ ۶۰ ء سے لکھنا شروع کیا تھا۔ کراچی، لاہور، بنگلور اور الہ آباد کے معتبر و محترم ادبی جریدے میرے لکھے گیتوں نظموں کو، گویا پہلے ہی دن سے، چھاپنے لگے تھے تو سن ستر سے مَیں نے کہانیاں بھی لکھنی شروع کر دیں۔

میری پہلی کہانی 'باسودے کی مریم' لکھ لی گئی تھی، دوستوں کو سنا دی گئی تھی۔ دوستوں کے سرخیل، سلیم احمد سے اور جمال پانی پتی، جونؔ ایلیا اور بھائی اطہر نفیس سے، اُن کے برادرِ بزرگ، کنور اصغر علی خاں صاحب (علیگ) سے، اُن کے عزیز پیر بھائی، نواب راحت سعید خاں صاحب چھتاری سے اس کہانی کے کھاتے میں، مَیں ڈھیروں داد بھی وصول کر چکا تھا... تاہم اُس وقت تک اس کہانی کو چھپوانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔

وجہ بہت دلچسپ بلکہ intriguing تھی:

کہانی کی خواندگی کی کسی 'روٹین' نشست میں، بھائی اطہر نفیس، شہر کے ایک جاننے والے مدیر کو قول ہار چکے تھے کہ اسدؔ کی یہ کہانی اُسی کے جریدے میں چھاپی جائے گی۔

اُس راجپوت دوست کا کسی بھی سلسلے میں قول ہار دینا، ہم سب کے لیے "جان جائے پر وچن نہ جائے" ہونا چاہیے تھا... اور فی الحقیقت ایسا تھا بھی۔ مگر میرے اندر کوئی گڑبڑ چل رہی تھی۔

مَیں اسے وہاں چھپوانا نہیں چاہتا تھا جہاں کے لیے اطہر بھائی وعدہ کر بیٹھے تھے۔

مَیں سمجھتا تھا کہ مجھے یہ کہانی… اپنی پہلی کہانی، 'فنون' ہی میں چھپوانی چاہیے۔ اس لیے کہ اُس وقت تک قاسمیؔ صاحب میری کتنی ہی نظمیں اور گیت 'فنون' میں درج کر چکے تھے؛ جو میرے لیے خوشی اور خوش بختی کی بات تھی… اور ہمیشہ رہے گی۔ مگر مارے (محبت اور) خوف کے، مَیں یہ بات نہ تو 'قول ہارنے والے' اُس راجپوت سے کہہ سکتا تھا، نہ کسی اور سے۔ جس سے بھی کہتا وہ اطہر نفیس سے جا لگاتا۔ مجھ سمیت سبھی اُن صاحب کے گرفتار تھے۔

شہر کی خوش نصیبی، جو ہم نے سُنا کہ قاسمیؔ صاحب آنے والے ہیں اور اطہر نفیس نے برادرِ بزرگ، اصغر بھائی کے گھر ایک شعری نشست کا اہتمام کیا ہے۔

تو میرے چالاک، چابک دست، منصوبہ کار 'قصباتی' ذہن نے بالا ہی بالا ایک حکمتِ عملی تیار کر کے فوری استعمال کے لیے فائل کر لی۔ کسی کو اس کی ہوا بھی نہ لگنے دی۔

قاسمیؔ صاحب کے کراچی آنے تک مَیں نے دو کہانیاں اَور لکھ لی تھیں۔ تاہم، منصوبے کے مطابق مَیں نے کسی سے ذکر نہیں کیا تھا۔

تو نشست کی شام آئی۔ مَیں گیتوں، نظموں کی بیاض اُٹھائے اور کُرتے کی جیب میں 'باسودے کی مریم' سمیت، دو کہانیوں کے مینو اسکرپٹ دھرے، اصغر بھائی کے گھر جا پہنچا۔ سبھی لوگ آ چکے تھے، یا آنے والے تھے۔ قاسمیؔ صاحب کا اور اطہر بھائی کا انتظار تھا۔

وہ آئے۔ بھائی اطہر، قاسمیؔ صاحب کو اپنے بھائی کے گھر پہلی بار لا رہے تھے؛ سو، کھلے پڑتے تھے۔ قاسمیؔ صاحب، ہم سب نیاز مندوں، شاعروں کو دیکھ کر بے حد خوش تھے۔

نشست کی صدارت اُنھی کو کرنی تھی۔ بھائی اطہر کیوں کہ میزبان تھے، تو نشست کا آغاز اُنھوں نے اپنی غزل سے کرنا چاہا۔ ہم جونیئر شاعروں نے کہا، "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، آپ ابھی بیٹھیے، ہمیں سنیے۔"

غرض کہ شعر خوانی ہوتی رہی۔ ایک سے ایک اچھا کلام سننے کو ملا۔ پھر قاسمیؔ صاحب نے اپنی تازہ نظمیں عطا کیں اور سب کو پُر مایہ کیا۔ اصغر بھائی کے اشارے پر ڈنر شروع ہوا۔

میزبانی کی مصروفیت کہیے یا اس نشست کا لطف اور سرشاری کہ اصغر بھائی وہ سب کچھ بھول گئے جو انھیں ڈنر ختم ہوتے ہوتے کہنا تھا… اور جس کے لیے مَیں نے ان سے رازدارانہ درخواست کی تھی۔

شعر سن کے، سنا کے، قاسمیؔ صاحب کو اپنے درمیان پا کے سبھی مگن تھے۔ مگر ڈنر ختم ہوئے پر قاسمیؔ صاحب چلے جائیں گے… اب کیا ہو سکتا ہے؟

مَیں نے مُنھ لٹکا لیا۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟ کچھ نہیں۔ مجھے اس طرح دیکھ کر دوستوں میں سے کسی نے ضرور کچھ کہا ہوگا اور مَیں نے ہوں ہاں کر دی ہوگی۔

آخر ڈنر ختم ہوئے پر جبکہ سب لوگ بڑے کمرے کی طرف آ رہے تھے، اصغر بھائی کو وہ سب یاد آ گیا، جو انھیں میری فرمائش پر اپنے معزز مہمان سے کہنا تھا؛ تو انھوں نے اپنے پُر شوق انداز میں قاسمیؔ صاحب سے کہا کہ حضرت، شعری نشست تمام ہوئی، کھانا بھی ہو گیا… اب کافی پی جائے گی، پھر ہم آپ سے افسانہ سنانے کی

درخواست کریں گے... کیوں اسد ٹھیک ہے نا؟ قاسمی صاحب تشریف لائیں اور ان سے افسانہ نہ سنا جائے؛ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔ اطہر! بچوں سے کہو، قاسمی صاحب کے سب مجموعے یہاں پہنچا دیں۔

مَیں جیسے جی اُٹھا۔ اپنے جوش میں تقریباً ہکلاتے ہوئے میں نے تائید میں کچھ نہ کچھ کہنا شروع کر دیا، اور وہ سب بھول گیا جو اس موقعے پر کہنے کے لیے خوب سوچ ساچ کے رکھا تھا۔

کسی نے کہا، "زبردست تجویز ہے! شعر و افسانہ دونوں آپ کی مملکتیں ہیں، جنابِ والا! افسانہ عطا ہو۔"

قاسمی صاحب مسکرائے، کہنے لگے، "اچھی بات ہے۔ ایک افسانہ بھی سن لیجیے۔" یہ صحیح وقت تھا۔ اب مَیں نے سرگوشی میں اطہر نفیس کو بتا دیا کہ بھائی! مَیں نے دو کہانیاں اور لکھ لی ہیں۔ وہ خوش ہو گئے، لہک کے قاسمی صاحب سے کہنے لگے کہ ٹھیریے گا حضرت! پہلے اسد سے اس کی تازہ کہانی سن لیجیے۔

قاسمی صاحب کے لیے تو یہ خبر تھی کہ مَیں ناچیز افسانے بھی لکھنے لگا ہوں، خوش ہو گئے، مسکرا کے بولے، "سبحان اللہ! کیا اچھی بات سننے کو ملی۔ جی اسد! بسم اللہ!"

مَیں نے کہا، میرے لیے اس سے بڑی سعادت کیا ہو گی اور مَیں سنبھل کے دوزانو ہو بیٹھا، جیب سے دونوں مینواسکرپٹ نکال لیے۔

اصغر بھائی بولے، "اوہو۔ بھئی کیا وہ کہانی بھی لائے ہو؟ مریم والی؟"

اُس وقت تک مَیں اطہر بھائی کی طرف سے گھوم چکا تھا، عرض کیا کہ جی اصغر بھائی! لایا ہوں۔ کہیے تو وہی سنا دوں؟ ویسے ایک اور کہانی بھی لکھ لی ہے، مختصر سی، عنوان ہے: یوم کپور۔

چھتاری صاحب اُن دنوں اُردن میں پاکستان کے سفیر تھے۔ عنوان سن کے تجسس کے ساتھ بولے "خوب! Yom Kippur؟ بھئی یہ سناؤ۔"

قاسمی صاحب نے فیصلہ کیا کہ اسد محمد خاں سے دونوں کہانیاں سنی جائیں گی۔ مَیں تو انتظار ہی میں تھا؛ سو پہلے 'یوم کپور' پھر 'باسودے کی مریم' سنا دی۔ بعد میں اطہر بھائی نے بتایا کہ مریم کی کہانی ختم ہوئی تو قاسمی صاحب آبدیدہ تھے۔

مَیں نے دل میں کہا کہ لو میاں! کام ہو گیا۔

قاسمی صاحب نے مجھے دیکھا، ہلکے سے مسکرائے، کہنے لگے، "یہ دونوں کہانیاں اِدھر دیجیے۔ یہ 'فنون' کی کہانیاں ہیں۔"

اطہر نفیس نے دونوں کہانیاں میرے ہاتھ سے لے کے قاسمی صاحب کو پیش کر دیں۔ اب کہیں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

کتنے ہی برس گذر گئے۔ میری بہت سی کہانیاں 'فنون' میں درج ہونے کے بعد قاسمی صاحب نے کسی کو انٹرویو دیتے ہوئے مریم کی کہانی کے بارے میں وہ کچھ فرمایا کہ جو اَب تاریخ کا حصہ ہے... اور جو مجھے تاعمر گرم و سرشار رکھے گا۔ خدا اُن کی یاد کو جگمگاتا رکھے۔

■■

افسانہ
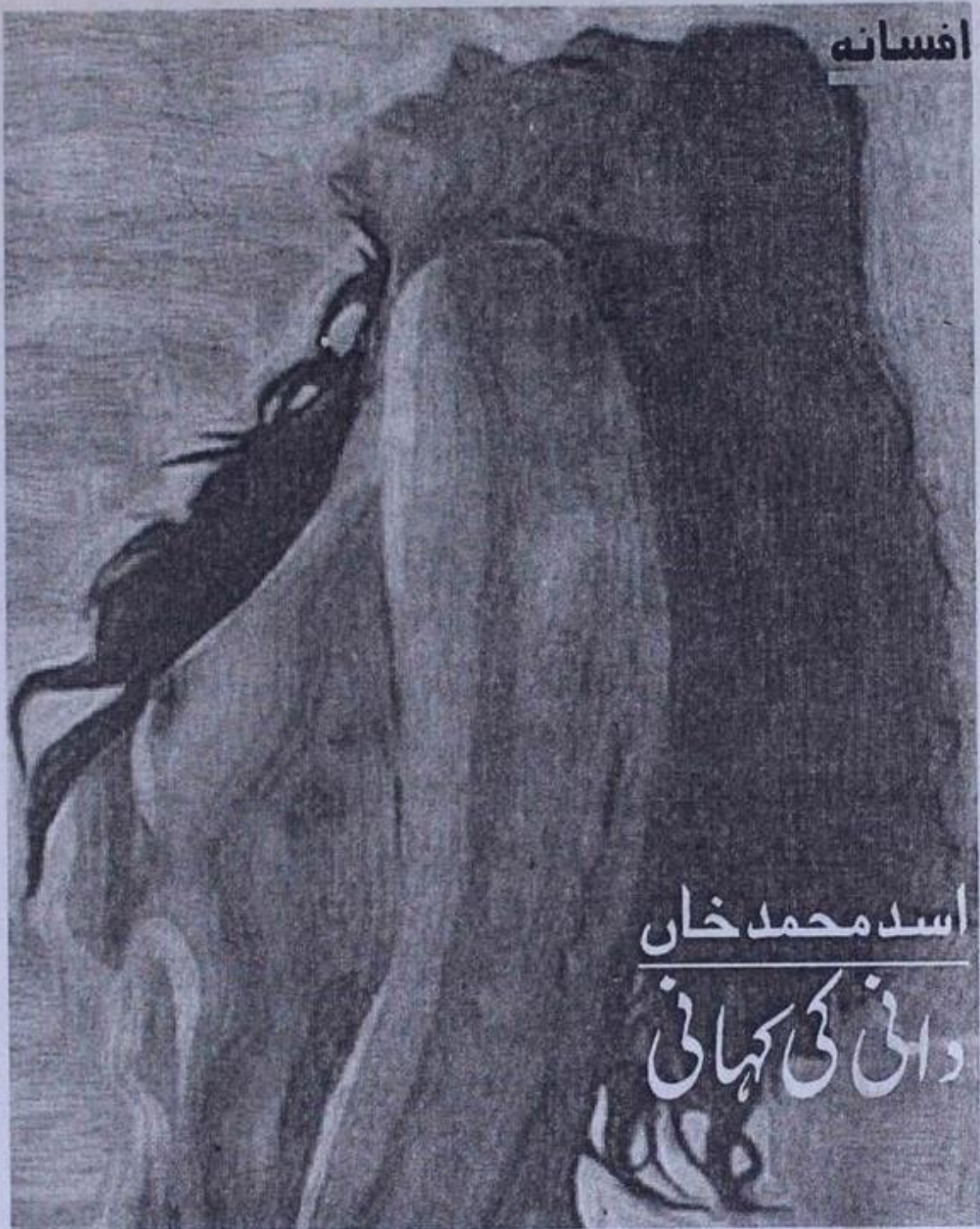
دانی کی کہانی

اسد محمد خان

میرا نام جاوے ہے۔

مَیں جو سنا رہا ہوں، یہ میری اور دانی کی کہانی ہے۔

اور یہ بیلا بائی صاحب کی، تانی بائی کی، اور بھورے جابر بے غیرت کی، اور میرے دوست مَلباری کی بھی کہانی ہے۔ پر دیکھا جائے تو یہ الٰہ بخش شیدی کا قصہ ہے جو شہر کے اس بڑے جنگل میں راتوں کو کالے شیر کی طرح نکلا کرتا تھا۔

الٰہ بخش کے بہت سے نام تھے۔ یار محمد مکرانی، یارو شیدی، کالا شیر... کتنے ہی نام، مگر میں اسے پہلی بار ملا تھا تو مجھے اس نے اپنا نام الٰہ بخش بتایا تھا۔

میری اس کی ملاقات اتفاقیہ تھی، اور میں اس وقت اسے ایک چھوٹی سی بات سمجھا تھا۔ پھر اللہ بخش نے ایک بار بڑے جذبے سے کہا تھا کہ، "جاوے! بچہ تم اگر اُس یتیم خدا پروردگار کا بھیجا ہوا اُدھر نہیں آجاتا تو کالا شیر ہمیشوں ہمیش کو گیا تھا۔ بس، ایک دم خلاص۔"

شاید ایسا ہی ہوا ہو۔

اب تو خیر کتنے ہی برس گزر گئے۔ میں جاوے، سات اوپر ساٹھ برس کا ہو گیا اور یارو شیدی، کالے شیر کو لوگ بھول بھال گئے۔

اس وقت، بہت ہوا تو میں پندرہ سولہ سال کا لڑکا ہوں گا، اور یارو شیدی اللہ بخش پینتیس ایک برس کا پختہ کار مرد۔

اور شہر کا یہ جنگل اتنا پھیلا نہ تھا۔

میں، بیلا بائی صاحب اور لڑکیاں؛ ہم سب گانے بجانے، پیشہ کرنے والیوں کے علاقے جاپانی روڈ کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ میں، بیلا بائی صاحب کا لے پالک تھا، گھر کا کام کاج کرتا تھا، اور وہ میرے کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کا سب خرچ اُٹھاتی تھیں۔ سب لوگ مجھے بیلا بائی والا جاوے کہہ کر بلاتے تھے۔ پر وہ سب تھے ہی کتنے؟ اس وقت کوئی اتنے زیادہ لوگ نہیں ہوتے تھے۔

ہماری بلڈنگ کی تین منزلوں پہ کل بارہ فلیٹ تھے۔ چھ فلیٹ ہمارے زینے پہ کھلتے تھے اور چھ دوسرے زینے پہ۔ ان فلیٹوں میں سے دو کی مالک بیلا بائی صاحب تھیں۔ ایک میں ہم سب رہتے تھے، دوسرا بیلا بائی نے تانی بائی کو کرائے پر دے رکھا تھا۔ تانی بائی والا اور ہمارا فلیٹ آمنے سامنے ایک ہی لینڈنگ پہ تھے۔ وہ بیلا بائی کی کرایے دارنی تھی اس لیے میرے لینڈنگ پہ بستر اجمانے پر کچھ نہیں کہتی تھی۔ دوسرا کوئی اسطرح جگہ گھیرنے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔ تانی بائی، بیلا بائی صاحب کی عمر کی عورت تھی مگر مزاج کی اتنی گرم نہیں تھی۔ وہ سویرے ہی اٹھکر فلیٹ کے دروازے میں کرسی ڈال کے بیٹھ جاتی پھر شام تک گڑگڑا اپنا حقہ پیتی رہتی۔ بلڈنگ والیوں میں سے جو بھی زینے پہ چڑھتی اترتی قابو میں آجاتی، تانی بائی اسے اپنے چھت والے "بغیچے" کا حال سنانے کو ضرور روک لیتی تھی۔

بلڈنگ کی چھت پر لکڑی کی کیبنوں کے پاس تقریباً آدھی جگہ میں تانی بائی نے اپنا گملا باغیچہ بنا رکھا تھا۔ کوئی پچاس ساٹھ بڑے بڑے گملے ہونگے جن میں تانی بائی نے پھول پھلواری، پودینہ، مرچ اور ٹماٹر لگا رکھے تھے۔ اوپر چھت پر چھ سات چھوٹی کیبنیں تھیں اور پانی کی ٹنکی سے ملا ہوا ایک کاکوس بنا تھا۔ کاکوس میں فلیٹوں والے تالا ڈال کے رکھتے تھے کیوں کہ سب چندہ کرکے صفائی والے جمعدار کو تنخواہ سے اوپر کچھ پیسے دیتے تھے۔ تالے کی ایک ایک چابی سب کے پاس تھی۔ شام کو یہ کاکوس اور کیبنیں کھول دی جاتی تھیں۔

چھت پر کیبنوں کا خیال پہلے پہل بیلا بائی صاحب ہی کو آیا تھا۔ کہتی تھیں، گھر تو رہنے کے لیے ہوتا ہے اور ہم "گایک لوگ" ہیں ہمارا گھر "راگ داری" کے لیے ہے۔ جسے ہاتھ پیروں کی بانگی دکھانی ہو، وہ گھر سے باہر جائے؛ جو مرضی کرے۔ وہ گھر کا غسل خانہ بھی غیروں کے لیے بند رکھتی تھیں۔ دو کیبنیں بیلا بائی نے بنوائی

تھیں۔ ان میں ہمارے تالے پڑے رہتے تھے۔ میرا کام یہ بھی تھا کہ شام کے وقت کیبنوں اور کاکوس کے تالے کھول دیتا تھا اور پھر سونے سے پہلے ہی مَیں چھت پر جاتا تھا۔ وہ بھی تالے ڈالنے کو۔ بیچ میں اُدھر کا رخ نہیں کرتا تھا۔ وہاں میرا کام بھی کیا تھا؟ تالا کھولنے بند کرنے کے سوا میں اوپر کی کیبنوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتا تھا۔ اوپر کیبنوں میں فلیٹ کے بے کار بکسے کرسی چوکی وغیرہ پڑے رہتے تھے۔ ہر کیبن میں ایک پرانی مسہری اور بستر بھی پڑا رہتا تھا۔ شبو کی نتھ بڑھائی نہیں ہوئی تھی اسے اوپر جانے کی ممانعت تھی؛ اتنی سخت کہ اگر بیلا بائی صاحب کو پتا چل جاتا کہ شبو چھت پر گئی ہے تو وہ ہاتھ پیر باندھ کے اس کی پٹائی کر دیتیں۔

جیسا کہ بتایا؛ مَیں لینڈنگ پر سوتا تھا۔ رات میں غسل خانے جانے کی ضرورت ہوتی تو چابی لے کے اوپر کے کاکوس میں چلا جاتا۔

ایک رات مجھے اوپر جانا پڑا۔ اس وقت ٹھیک تین بجے تھے: کیونکہ میں نے دور ٹاور سے آتی گھنٹے کی آواز سنی تھی اور نیند میں بھی صحیح گنتی گنی تھی۔

مَیں کاکوس کا تالا کھول ہی رہا تھا کہ بلڈنگ کے دوسرے زینے سے ایک سایہ جھپٹ کر اوپر چھت پر آیا۔ وہ سر سے پیر تک سیاہ تھا، یا پھر آنکھوں کی سفیدی نظر آرہی تھی جس سے وہ کچھ اور ڈراؤنا بن گیا تھا۔ میں بھوتوں اور جنات وغیرہ کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ میری ماں یا بہن بھائی ہوتے تو بھوت پریت کے قصے سناتے۔ جن لوگوں نے مجھے پالا انھیں قصوں کہانیوں کا وقت ہی نہیں ملتا ہوگا۔ اس لیے میں اس سائے کو آدمی ہی سمجھا۔ کوئی دوسرا وقت ہوتا؛ مَیں نیند میں نہ ہوتا تو ڈپٹ کے پوچھتا کہ تو کون ہے؟ یہاں کیا کر رہا ہے؟ مجھ سے کچھ اور نہ بن پڑا تو جھپاک سے تالا کھول، کاکوس میں چلا گیا اور اندر جا کے اسٹیل کی چادر والا دروازہ بند کر لیا۔ یہاں مَیں محفوظ تھا؛ تو ہوا کی لیے بنائی ہوئی جھری سے باہر جھانکنے لگا۔

سایہ سیدھا کاکوس کی طرف آرہا تھا، مگر جب اس نے مجھے اندر بند ہوتے دیکھا تو پھرتی سے وہ کیبنوں کی طرف چلا گیا۔ مَیں نے سونے سے پہلے اپنی والی دونوں کیبنوں کا تالا لگا دیا تھا۔ دوسروں نے بھی ایسا ہی کیا ہوگا۔ سایہ بجلی کی سی تیزی سے سب کیبنوں کے تالے دیکھ چکا تو چھت کی منڈیر کیطرف لپکا۔ برابر والی بلڈنگ آٹھ نو فٹ دور ہوگی۔ سائے نے چھلانگ مار کر دوسری چھت پر پہنچنے اور نکل بھاگنے کا ارادہ کیا؛ لیکن اسٹارٹ لینے کی جگہ نہیں تھی۔ تانی بائی کے گملوں کی وجہ سے کچھ فاصلے تک بھی دوڑ کر چھلانگ لگانے کا موقع نہیں تھا۔ وہ منڈیر سے ہٹ گیا۔ ہمارے والے زینے سے اس نے نیچے اتر جانا چاہا، مگر پھر رک گیا۔ شاید اسے معلوم تھا کہ سڑک پر کھلنے والے اس دروازے میں سنیما ہال جیسی گرل لگی ہے؛ جسے بازار کا چوکیدار سویرے تک کھینچ کے اور تالا ڈال کے رکھتا ہے۔ خود چوکیدار ابھی ادھر ہی ٹہل رہا ہوگا؛ یا دکان کے تھڑے پر بیٹھا ہوگا۔

سایہ اب سیدھا میری طرف کاکوس کے رخ آیا۔ اُسنے اسٹیل کا دروازہ ہلکے سے بجایا اور کھردرے لہجے میں کہا، ”اےِ! ہم کو خبر ہے تم اندر بیٹھا ہے؛ ادھر سے گیا نہیں ہے۔ ہم کو پتا ہے۔“

مَیں کیا کہتا، خاموش رہا۔ سائے نے پھر اسی لہجے میں کہا، ”سنو بچہ! ہم پھنس گیا ہوں۔ وری ابھی ادھر سے نکلنا ہے۔ تم ادھری کا لڑکا ہے۔ دن میں ہم تیرے کو برو بر دیکھا ہے۔ ہم کو کوئی آئیڈیا دیو۔ کیا سمجھا؟ کوئی چھپنے

کا پوجی شن بتاؤ۔ ہم تیرے کو پیسا دیں گا، پچی بات۔''
اس کی بھاری آواز میں کسی طرح کا ڈر، خوف نہیں تھا۔ ہاں وہ جلدی جلدی ضرور بول رہا تھا جس سے لگتا تھا کہ وقت جو گزر رہا ہے؛ اسے اس کا خیال ہے۔ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہوگا۔
مَیں نے آہستہ سے پوچھا،''کون ہو؟ کیوں آئے ہو؟''
وہ روکھے پن سے ہنسا بولا،''چَر یا ہوں۔ پاگل پن میں نکل آیا ہوں۔ کوئی اُلٹا سیدھا کرنے آیا تھا۔ جاگ پڑ گئی، نکل نہیں سکتا... گھنٹا ایک کا واسطے چھپنے کا ہے۔ جگہ بتاؤ ہم کو۔''مَیں چپ رہا تو جھنجھلا کر بولا،''اڑے سو گیا؟ بولو نئیں!''
مَیں اپنا اطمینان کرنا چاہتا تھا۔ اس سے پوچھا،''پستول ریوالور تو نہیں ہے تمھارے پاس؟''
وہ سانپ کی طرح پھنکارا،''ابھی جرح نئیں کرو ڑے وکیل! ہم خالی ہاتھ ہوں، تم باہر آؤ۔ ہمکو ادھر کاکوس میں بیٹھنے دیو۔ ہم گھنٹا بھر پیچھے نکل جائیں گا۔''
اب میں نے دُور کسی قسم کی آہٹ سنی۔ لوگ واقعی اس کے پیچھے تھے اور وہ اسی طرف آرہے تھے۔ سائے نے بے چینی کی آواز نکالی۔
مَیں کاکوس کا دروازہ کھول کر باہر آگیا۔
اس نے جھپٹ کر اندر جانا چاہا۔ مَیں نے ہاتھ بڑھا کر اسکا بازو چھوا۔ سخت کسرتی بدن تھا۔ مَیں نے کہا، ''ٹھہرو۔ یہاں نہیں، وہ لوگ ادھر ہی آئے گا۔''
''تو پھر کدر؟ بولو؟ بولو؟''اب اس کی آواز میں بھی تیزی آچلی تھی۔
نیچے سیڑھیوں پر تیز تیز قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ کوئی پر جوش لہجے میں کہہ رہا تھا،''ہاں ادھر ہی چھت پہ گیا ہے۔''
سائے نے میرا بازو پکڑ کر جھٹکا،''بولو نئیں مُردار! ابھی کدر جاوے؟''
ہماری کیبنیں سامنے تھیں۔ مَیں نے چابی کے گچھے میں پہلی کیبن کی چابی ٹٹول کے پکڑی اور تالا کھول، دروازہ اپنی طرف کھینچ، سائے کو آہستہ سے اندر دھکیل دیا۔ مجھے باہر سے تالا بند کرنا تھا؛ اس لیے مَیں نے اسے تسلی دی،''استاد! فکر نہیں کرو، تالا ڈال رہا ہوں، بعد میں کھول دوں گا۔''
''ہا''کہہ کے وہ کیبن کے اندھیرے میں غائب ہوگیا۔
مَیں نے کیبن کو تالا مار، کاکوس کا رستہ پکڑا۔ اب انتہائی وقت تھا کہ مَیں اپنی ضرورت کا بہانہ کر کے سامنے سے ہٹ جاؤں۔
میرے اندر ہوتے ہی چھت پر ٹارچیں چمکاتے، تیز تیز باتیں کرتے چار، پانچ آدمی آگئے۔ ان میں بلڈنگ کا چوکیدار بھی تھا۔ دو تین کے پاس لاٹھیاں تھیں۔ دوسرے بھی نہتے نہیں ہوں گے۔
دو نے پانی کی ٹنکی او کیبنوں کی اوٹ میں ڈھونڈنا شروع کیا۔ ایک ہمارے والے زینے پر اترتا چلا گیا۔ ایک نے کاکوس کے دروازے پر ہاتھ مارا،''کھولو کھولو۔ کون ہے اندر؟''پھر اُس نے چیخ پکار کر کے سب کو بلا

لیا،"اَبے سنو، وہ کا کوس میں گھسا ہے۔"

اب سبھی ٹارچ اور لاٹھی لہراتے کا کوس کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ ایک نے اپنے ساتھیوں سے کہا،" سامنے سے ہٹو۔ ریوالو رہویئنگا اُسکے پاس، مجھے آگے رہنے دو۔ اُس نے حملہ کیا تو گولی مار دوں گا۔"

یہ پڑوس کا دودھ والا قاسم ہوگا، جو تین پونے تین بجے آجاتا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اُس کی گاڑی دودھ لے کے آتی ہوگی۔ قاسم اس علاقے کی نو دس دکانوں کو دودھ سپلائی کرتا تھا۔ ہزاروں روپے کی بکری ہوتی تھی؛ تو قاسم اپنی دونالی بندوق کارتوس ڈال کے تیار رکھتا تھا۔ اب جاگ پڑگئی تھی تو وہ خالی ہاتھ نہیں آیا ہوگا۔

مَیں نے سوچا، دیر نہیں کرنی چاہیے اور کا کوس کا دروازہ کھولنے سے پہلے مجھے بتا دینا چاہیے کہ اندر میں ہوں۔ ورنہ کیا لگے، قاسم گھبرا کے فائر جھونک دے۔ اس لیے مَیں نے چیخ کے کہا،" کیا ہے؟ ٹھہرو! کیوں دروازہ ٹھونک رہے ہو؟"

باہر سے چوکی دار نے لاٹھی بجا کے حکم دیا،"باہر نکلو۔ کون ہے تم؟"

مَیں نے چیخ کے بتایا،"لالہ! میں ہوں جاوے، بیلابائی صاحب کے فلیٹ والا۔"

زینے پر جانے والا واپس آچکا تھا۔ وہ لینڈنگ پر میرا خالی بستر دیکھ کے آرہا تھا، بولا،"ہاں ہاں جاوے ہے کا کوس میں۔ خیال کرنا قاسم! اندر جاوے ہے... بستر اخالی ہے اس کا۔مَیں دیکھ کے آرہا ہوں۔"

مَیں نے اندر سے جھنجلا کر کہا،"ارے بول رہا ہوں نا۔ مَیں ہوں۔"

تھوڑا وقفہ دے کر مَیں کا کوس سے نکلا تو دو کے سوا سبھی چھت پر گھوم پھر کر سائے کو تلاش کر رہے تھے۔ وہ دونوں کچھ پوچھنے کے لیے میرے انتظار میں تھے۔

مَیں نے عادتاً باہر آ کر کا کوس کو تالا لگا یا اور الٹا سوال جڑ دیا،"کیا بات ہے؟ کون تھا؟ کوئی جھگڑا ہوا ہے کیا؟"

"نہیں! چور آیا ہے چھت پر۔ تم اِدھر کتنی دیر سے ہو؟"

"ابھی آیا تھا، پانچ منٹ پہلے۔"

"تم نے نہیں دیکھا کسی کو؟ وہ ابھی ابھی دوسرے زینے سے آیا ہے۔ کالے کپڑے پہنے ہے۔"

مَیں نے کہا،"ہوگا؛ یہاں سے کدھر جا سکتا ہے۔"

"اَبے چھلانگ مار گیا ہوگا دوسری چھت پے... اتی اتی چھوٹی تو منڈیریں ہیں۔"

قاسم بولا،"چھلانگ کیسے مار سکتا ہے؟ دیکھ نہیں رہے، بیچ میں کتنی چوڑی گلی ہے؟ ادھر ہی کیبنوں میں نہ گھسا بیٹھا ہو، ذرا دکھانا ٹارچ۔"

میرا دل کیبنوں کے ذکر پر تیز تیز دھڑکنے لگا۔ یوں لگا جیسے مَیں ہی فرار ہو کے چھپا ہوں۔

ٹارچ والے نے کیبنوں کے دروازوں پر روشنی ڈالی۔ دوسرا پانی کی ٹنکی پر چڑھ کر کیبنوں کی ٹین کی چھتوں پر لائٹ مار رہا تھا۔ انھوں نے دیکھا کیبنوں پر تالے پڑے تھے۔ چھتیں بھی ٹھیک ٹھاک تھیں۔

قاسم دودھ والا بڑبڑانے لگا،"بلڈنگ والوں کو یہ کیبن، وے بن بنانے کی پرمیشن نہیں دینی چئیے تھی۔"

قاسم نے ایک زمانے میں یہاں بڑی سیاست چلائی تھی۔ وہ تو لاجی صاحب نے گالی گلوچ کرکے اور علاقے کے تھانیدار کی ٹھیک ٹھاک خدمت کرکے اسے قابو کیا تھا؟ قاسم کو اسی بات کی جھنجلاہٹ تھی۔

دوسرا پڑوسی، شمشی کا میاں بولا "ارے کیبنوں کا کیا ہے۔ دیکھ نہیں رہے، سب میں باہر تالے ڈلے ہیں اور چھتیں توڑ کے بھی کوئی نہیں گھسا۔ صاف نظر آرہا ہے۔ بَی دیکھو کہیں پائپوں کو پکڑ کے گلی میں نہ اتر گیا ہو۔"

شمشی کے میاں نے پائپوں والی لائن اچھی سجھائی تھی۔ اصل میں وہ کیبنوں کی طرف سے دھیان ہٹانا چاہتا تھا۔ ایک کیبن اُس کی بھی تھی۔ شمشی کے کوٹھے

پہ آنے والے بھی اسکے میاں کے کہنے کے مطابق "راگ رنگ کے قدردان" تھے۔ کہتا تھا کیبن تو میں نے گھر کے فالتو سامان کے لیے بنائی ہے۔

پائپوں کی بات سُن کے، سب کے سب، بلڈنگ کی گندی گلی کے رخ جھانک جھانک کر اور ٹارچیں چمکا چمکا کے بحثیں کرنے لگے۔ مَیں کچھ دیر اُن کے ساتھ رہا پھر یہ کہہ کر کہ آپ لوگ کو وہم ہوا ہوگا، زینہ اترتا اپنے بستر پر آ گیا۔

آدھے ایک گھنٹے تک ٹوئیاں مار کے وہ لوگ آخر کار واپس چلے گئے۔

ہمارے والے زینے پر میرے سوا کوئی نہیں جاگا تھا۔ تھوڑا وقت دے کر مَیں چھت پر آیا: چھت پر اب سناٹا تھا قاسم دودھ والے نے بڑی سڑک پر دودھ کے برتنوں کی لائن لگوانی شروع کردی تھی۔ شمشی کا میاں، دوسرے پڑوسی اور چوکیدار: بازار یا گلی میں کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ مَیں سمجھ گیا وہ سب شمشی کے فلیٹ پہ ہوں گے۔ شمشی کی نیند ایک بار ٹوٹ جائے تو پھر وہ نہ خود سوتی تھی نہ سونے دیتی تھی۔ اُس کا میاں، چوکی دار اور پڑوسیوں کو لے کر اس وقت اپنی لینڈنگ پہ پھڑ جمائے بیٹھا ہوگا اور شمشی بائی نے سب کے لیے چائے پکانا شروع کردی ہوگی۔

سائے کے لیے ہماری چھت سے نکل بھاگنے کا اس سے اچھا موقع اور نہیں ہوسکتا تھا۔

مَیں دل ہی دل میں شمشی کے میاں کی کہی ہوئی بات دہرا رہا تھا کہ کہیں پائپوں کے سہارے وہ نیچے نہ اتر گیا ہو۔

مَیں نے کیبن کا تالا کھولا، اندھیرے میں چھپے ہوئے سائے کو آواز دی، "استاد!"

"ہاں بچہ!" قریب سے آواز آئی۔

"لین کلیئر ہے استاد! پائپ سے پچھلی گلی میں اتر سکتے ہو تو اتر جاؤ۔"

وہ اندھیرے سے نکل کے کھلی چھت پر آیا۔ اس کے انداز ہی سے معلوم ہو رہا تھا کہ خطرہ ٹل چکا ہے اور وہ بے خوف ہے۔

سایہ میری طرف آیا۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اس نے کہا، "میں الٰہ بخش ہوں۔ تیرا کیا نام ہے؟"

مَیں نے بتا دیا۔

وہ بولا "جادے دوست! ابھی یہ الٰہ بخش، ساری زندگانی کا واسطے تمارا دوست بن گیائے۔ ہم لوگ دوست

کو، دشمن کو بُو، لتا ہیں ہوں۔"
مجھے یہ فکر لگی ہوئی تھی کہ بلڈنگ کی پچھلی گلی میں قاسم کی دکان کا آدمی یا کوئی اور نکل آیا تو مشکل ہو گی۔ مَیں نے الٰہ بخش کی بات کا جواب "اچھا" کہہ کر دیا اور اسے بتادیا کہ دودھ کی گاڑی آگئی تو اُن کا کوئی نہ کوئی آدمی گلی کی نالی ڈھونڈتا ہوا پچھواڑے آجائے گا۔ بہتر یہی ہے کہ وہ پائپوں کے سہارے اترے اور رستہ پکڑے۔ مَیں نے کیبن میں تالا ڈال دیا۔
سائے نے جھانک کر اطمینان کیا، پھر بولا، "جاوے بچہ! ہم نے پہلے سوچا تھا، تیرے کو پیسا میسا دے کے خوش کر دیں گا۔ ابھی ایسا ہے کہ پیسا کوڑی، اس ٹیم اپنے پاس کوئی نہیں۔" وہ ہنسا، "پیسا کوئی اچھا چیز نہیں ہے۔ یہ ہم تیرے کو بولتا ؤں۔ ہم پھر آؤں گا، کبھی دن کے ٹیم۔ تیرا احسان ہماری گردن پہ۔" اور الٰہ بخش نے میری گُدّی اپنے پنجے میں لیکر دوبار جھولا دیا؛ پھر وہ منڈیر پر جھکا اور اُس نے منڈیر پکڑ کر پائپوں کی تلاش میں ٹانگیں لٹکا دیں۔ ایک لمحے کو لگا کہ اسکے پیروں تلے کوئی ٹکاؤ نہیں ہے؛ وہ ہوا میں لٹک رہا ہے۔ مگر پھر اسکے پیر جم گئے اور پائپ سے چمٹ کر پھسلتا ہوا، وہ آہستہ آہستہ نیچے جانے لگا۔
مَیں وہاں سے ہٹ گیا۔ تانی بائی کے گملوں کے پیچھے بیٹھ کے مَیں نے نہ معلوم کیوں، الٰہ بخش کے لیے دعا مانگنا شروع کر دی تھی۔ منٹ بعد، مَیں نے چھت سے گلی میں جھانکا تو الٰہ بخش کا سایہ گلی کے پکّے فرش پر دکھائی دیا۔ وہ اوپر ہی دیکھ رہا تھا۔ میںنے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ الٰہ بخش نے بھی ہاتھ لہرایا؛ پھر وہ گلی کے ویرانے میں شکار کا تعاقب کرتے چیتے کی طرح زقندیں بھرتا غائب ہو گیا۔
مَیں اطمینان سے چھت سے چُپ چاپ اتر آیا اور چادر لیکر بستر پر لیٹ گیا۔
صبح بلڈنگ میں دس قسم کی کہانیاں پھیل رہی تھیں۔ ہمارے زینے سے بس مَیں ہی رات کو وہاں موجود تھا، اس لیے اِدھر والوں نے مجھ سے آآ کر پوچھنا شروع کر دیا تھا۔ میرے پاس بنی بنائی سیدھی سی کہانی تھی، وہ مَیں نے سنادی؛ کہہ دیا کہ تین بجے مَیں ضرورت سے چھت پر گیا تھا۔ کانوں میں تھا کہ مَیں نے دوسرے زینے والوں کو شور مچاتے آتے ہوئے سنا۔ ہم سبھی نے خوب تلاش کیا۔ کہیں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہم ہوا ہو گا۔

شمشی کا میاں وثوق سے کہہ رہا تھا کہ اس نے اپنے فلیٹ کا دروازہ تالا مارنے کے لیے کھولا تھا تو ایک جھلک کالے کپڑوں کی اسے نظر آئی تھی۔ وہ سمجھا سَنگل بابا سیڑھیاں چڑھ رہا ہے۔ اس کے زینے پر، اوپر کے فلیٹ میں کوئی جورا بائی جی رہتی تھی جو سَنگل بابا کی مریدنی تھی۔ یہ بابا، ایک مست ملنگ آدمی تھا۔ سر سے پیر تک کالے کپڑوں میں رہتا تھا۔ پیروں میں چپلیاں تک کالی ہوتی تھیں۔ لیکن شمشی کے میاں کو پھر یاد آیا کہ سَنگل بابا تو گلے، ہاتھوں، پیروں میں زنجیریں ڈالے رہتا تھا جو ذرا سے اشارے سے بجنے لگتی تھیں۔ یہ سَنگل بابا نہیں ہو سکتا۔ شمشی کا میاں یہ سوچ کے واپس فلیٹ میں آگیا؛ مگر پھر ہمت کر کے وہ سیڑھیاں چڑھا اور گھبرا کے بکو جمع کر لیا۔ اُس کے سوا کسی نے الٰہ بخش کے سائے کو نہیں دیکھا تھا۔ ہاں ایک پڑوسی نے، جو دوسروں سے پہلے چھت پر آگیا تھا، وہاں آوازیں ضرور سنی تھیں۔ اُسنے میری اور الٰہ بخش کی سرگوشی سنی ہو گی۔

یوں کئی طرح کی باتوں سے لوگوں نے نتیجہ نکالا کہ بیچے چوکیدار کے ہوتے کسی چور دور کی ہمت نہیں ہو سکتی کہ وہ بلڈنگ میں گھس جائے۔ شمشی کا میاں نشئی تھا۔ گولی چڑھا کے لینڈنگ پہ نکل آیا ہوگا اور اُس نے افیم کی پنک میں آدمی کا سایہ دیکھ لیا ہوگا۔

چھت پر سرگوشی سننے والے کو تو زور زور سے ریڈیو بجانے کا شوق تھا؛ لوگوں نے کہا، ''ریڈیو کے شور سے اس کے کان خراب ہو گئے ہیں؛ آپ ہی آپ بجتے ہیں۔''

غرض الٰہ بخش کا بلڈنگ میں گھسنا اور اس کا فرار سب کے لیے معمہ بن گیا۔

چوتھے دن میں لاجی کی ''دوائی'' کا ادھا لینے کامل گلی والے پارسی بھائی کی دوکان پر گیا۔ ''دوائی'' کا ادھا کاغذ اور کپڑے میں لپٹا میری بغل میں دبا تھا؛ مَیں تیز تیز قدموں سے گلی پار کر رہا تھا کہ سفید پینٹ، پھول دار بش شرٹ پہنے، سفید کٹ چمڑے کے فیشن والے جوتوں میں کالی ڈاڑھی والا ایک مکرانی بھائی تیز چلتا ہوا میرے برابر آ گیا۔ مَیں نے سر گھما کے دیکھا، وہ مسکرا رہا تھا۔

اس طرح کے فیشن ایبل لوفروں کو دیکھتے بھگتتے تو میری اب تک کی عمر گزری تھی۔ مَیں نے گھور کے اسے دیکھا، پوچھا، ''ہاں بھائی! کیا پریشانی ہے تیرے کو؟''

وہ بولا، ''پریشانی کیا ہوئیں گا جاوے! تو نظر آ گیا، میں نے سوچا ہلو کر لوں۔''

آواز سُنی ہوئی سی لگی، مگر مَیں آدمی کو نہیں پہچان پایا تھا۔

مجھے الجھن میں دیکھ کر بولا، ''اڑے نئیں پہچانا بچہ؟ ہم الٰہ بخش ہوں۔'' واہ واہ! مَیں نے دل میں کہا، کالے کپڑوں کا الٰہ بخش دن کے اجالے میں ایسے وٹ دار کپڑے پہنکے دوسرا ہی آدمی لگ رہا ہے۔ مجھے حیران دیکھ کر وہ ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے روانی میں بولا، ''جاوے! یہ تو پارسی بھائی کی دوکان میں کیا کر رہا تھا؟''

''ایں؟ ہاں، یہ بیلا بائی صاحب کی دوائی لینے گیا تھا۔''

الٰہ بخش کو حیرت ہوئی، ''تجھ سے منگاتی ہے؟ اڑے شراب لانیکو ادھر اس کے دَلّے ایجینٹ نہیں ہیں۔'' الٰہ بخش نے یہ بات برا مان کے کہی تھی۔ مَیں سمجھ نہیں سکا کہ وہ اس پر اتنا خفا کیوں ہے۔ مَیں نے پوچھا، ''کوئی باہر کا آدمی ہمارے کام کیوں کرے؟ ادھر کے کام کرنے والے ہم جو ہیں۔''

اُس نے انکار میں سر ہلایا، ''بچہ! یہ کوئی گھر کا کام نہیں ہے۔ یہ... یہ تو وہ ہوئی نا، بے غیرتی۔''

پھر جلدی سے بولا، ''چل چھوڑ نہیں سمجھے گا؛ بچہ ہے ابھی۔ آ تجھے لسی پلاؤں۔''

بچے والی بات بھی خوب کہی تھی اس نے۔ کوٹھے پہ پلنے والا پندرہ سولہ برس کا آدمی بچہ نہیں ہوتا۔ برسوں پہلے ہی سبھی کچھ اُسکی نظروں کے سامنے گزر چکا ہوتا ہے۔ مگر یہ الٰہ بخش اپنے ہی حساب سے چیزوں کو دیکھتا تھا۔

اُس نے ٹیکسی پکڑی اور مجھے شہر کی سب سے شان دار لسی شاپ پہ لے گیا۔ لسی شاپ کے مالک سے لے کر مستقل گاہکوں اور نوکروں تک سے الٰہ بخش کی سلام دعا تھی۔ دکان میں جانے سے پہلے اس نے میرے ہاتھ سے شراب کا ادھا لے کر اپنی پتلون کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ وہ مزے سے اپنے کالے مضبوط پنجے میں میری

گدّی پکڑے ہوئے، مجھے آگے آگے چلاتا شیشے لگی لسی شاپ میں داخل ہوا اور لوگوں کے سلام لیتا سیدھا کاؤنٹر پر پہنچا۔

الٰہ بخش کو دیکھ کر دکان کا مالک سلام کر کے کاؤنٹر سے باہر آگیا۔ اُسنے اُن سے ہاتھ ملایا۔ ہمیں ایک اسپیشل کیبن کی طرف لے کے چلا، میرا پوچھا،"یہ کون ہے؟"

الٰہ بخش نے اُسی روانی میں اونچی آواز سے میرا تعارف کرایا،"یہ اپنا جاوید ہے بئی۔ ہمارا بڑا بھائی کا بیٹا۔"

مَیں نے الٰہ بخش کو دیکھا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے وہ مسکرائے جا رہا تھا۔

ہم کیبن میں بلور کی قیمتی میز کے اِدھر اُدھر بیٹھ گئے۔ مالک چلا گیا تو مینے پوچھا،"الٰہ بخش آپ نے یہ کائے کو بولا کہ مَیں آپ کے بڑے بھائی کا بیٹا ہوں؟"

وہ ہنسا،"دوس جاویدَ! تیرا ابا بھی تیرے جیسا دلیر، شیر کا بچہ ہوئیں گا۔ ابھی ایسا ہی ہم ہے۔ اس حساب وہ ہمارا ابھی بڑا بھائی ہوا کہ نئیں؟ کیا بولا؟" مَیں ہنسنے لگا تو الٰہ بخش نے کہا،"بڑا شہر جنگل کا جیسا ہوتا ہے۔ وری ہم لوگ شیر ہے، ہم نے مار دھاڑ کر کے ادھر جنگل میں اپنا ٹرّی بنا کے رکھا ہے۔ کیا سمجھا؟ دہشت سیٹ کر دی ہے اپنی۔ پیسا کوڑی اپنے پاس ٹکتا نہیں ہے۔ تو نے جو مہربانی کی تھی جاویدَ بھائی! اس کا بدلہ ہو نہیں سکتا۔ یہی ہے بس، ادھر تیرا ٹرّی مرّی سیٹ کرا کے ہم آگے نکل جاؤں گا۔ تو اپنے مزے کاٹنا۔ جبھی ادھر سے تو گزرے، فری کا لسی پینا۔ بیس تیس روپیا کیش، ٹیکسی رکشے کا کرایہ، سیٹھ کی پاکٹ سے دلوانا۔ بس یہ ہی کر کے تیرے کو بھائی کا بیٹا بتایا ہے۔"

وہ پہلی بار ملا تھا۔ مجھے پوچھنا اچھا نہیں لگا مگر پھر بھی مَیں نے پوچھ لیا،"الٰہ بخش! وہاں اُس روز کس چکر میں آئے تھے؟"

میرا سوال سن کے الٰہ بخش سنجیدہ ہو گیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا،"جاویدَ! میرا دھندا کس حساب کا ہوتا ئے تیرے کو اس کا پتا ہے۔ اس روز ہم لوگ اکیلا وہی سب کرنے پہنچا تھا۔ شمشی کے فلیٹ میں اس ٹیم پہ بڑی آسامی ٹکی ہوئی تھی۔ ابھی اس کو ہلانے جلانے کا تھا۔ وہ خرنصیب، شمشی کا آدمین دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ ہم لوگ کا سب سیٹنگ گڑبڑ ہو گیا۔"

"کیسا سیٹنگ؟" مَیں نے الجھ کے پوچھا،"کیا دھندا ہے تمہارا؟"

الٰہ بخش کو حیرت ہوئی، وہ بولا،"تجھے نہیں پتا ہم کیا کام کرتا ہوں؟"

مَیں نے کہا،"مجھے کون بتاتا۔ تم نے بتایا نہیں۔ پھر کائے کو پتا ہوئے گا؟"

الٰہ بخش نے کچھ سوچ کے پوچھا،"تیرے کو خبر نئیں ہم کون ہوں؟"

مَیں نے کہا،"الٰہ بخش ہو اور کون ہو؟"

"شہر میں تو کب سے ہے؟"

مَیں نے بتایا کہ میں چھ سات سال کا تھا جب یہاں آیا تھا۔

الٰہ بخش نے "چچ!" کر کے انکار میں سر ہلایا۔ جھنجھلا کے بولا "اڑے دوس! ہم بھی چڑیا ہوں۔ بیکار کا بات کرتاؤں۔ یہ بول تو نے کبھی کالا شیر کا نام سنا ہے؟"

"کبھی کیا مطلب؟ مَیں اور شبو مہینے میں کتنی بار کالا شیر کی باتیں کرتے تھے۔ اس کے قصے بنتے تھے۔"

اس نے پوچھا "کالا شیر کا قصہ کون سناتا تھا تم لوگ کو؟"

"سبھی۔" میں نے کہا "گل بدن، چمپا، راجا بھائی، سبھی۔"

"ایسا بھی کیا... وہ کالا بُرا آدمی ہے، بَی۔" الٰہ بخش آہستہ سے بڑبڑایا۔

مَیں نے کہا "پتا نہیں، بُرا ہے، اچھا ہے۔ اُس کے قصّے تو مزے کے ہوتے ہیں۔"

الٰہ بخش بولا "قصّے کہانی میں کچھ نہیں رکھا بچہ! کالا ِاسی آدمی نہیں ہے۔"

اس کا لہجہ مجھے اچھا نہیں لگا۔ مَیں نے کہا "بلا وجہ! کیوں کہہ رہے ہو! تمھارے کو ایسے ہی بے کار کی خار بازی ہوئیگی۔ جانتے ہو بھی کالا شیر کو... یا ایسے ہی؟"

الٰہ بخش نے میرے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھ دیا "جاوے! بچہ! ہم خوب جانتاؤں اُس کو۔ میرے سے جاستی کون جانے گا۔ اڑے ہم ہی کالا شیر ہوں، الٰہ بخش کالا شیر۔ سمجھا تم؟"

میرا دل سَن سے ہو گیا۔ چہرے کا رنگ بدلا ہوگا تو الٰہ بخش نے نرمی سے میرا شانہ تھپتھپایا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے، گلابی ڈوروں کے ہوتے بھی؛ ایک بادل ٹھنڈک اور مروّت کا گزر گیا۔

"ابھی تم ڈرتا ہے میرے سے؟ ہاں جاوے! تم کائے کو ڈرتا ہے؟"

مجھے نہیں معلوم تھا مَیں کالا شیر سے کیوں ڈر گیا تھا۔ ایک منٹ پہلے تو مَیں نے اسکی حمایت میں اتنی باتیں کہی تھیں؛ حجت کر رہا تھا کہ وہ برا آدمی نہیں ہے۔

مجھے اس طرح دیکھ کے الٰہ بخش کالا اپنے گھٹنے پہ ہاتھ مار کے کھل کے ہنسنے لگا "چڑیا ہے دوس تم بھی۔ میرے سے ڈرنا نئیں ہے۔ وری میں تیرا چاچا ہے۔ سنا نئیں، ابھی لسی والے کو کیا بولا ہے؟ بولا ہوں؛ تو میرا بڑا بھائی کا بیٹا ہے۔ خلاص! ابھی ایسا ہی چلیں گا؛ سارا زندگانی۔ سمجھا؟"

بیرا لسی کے ساتھ پتہ لگے پیڑے اور آلو کی بھُجیا کے تر تراتے گرم سنبوسے بھی لایا تھا۔ میرے تو مزے آ گئے۔ کھا پی کے ہم دونوں لسی شاپ سے چلنے کو ہوئے تو مالک نے دَخل سے پچاس روپے کا ایک نوٹ نکال، میری قمیص کی جیب میں ڈال دیا۔

میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ مَینے دو چار بار نہیں نہیں کہا ہوگا تو کالا شیر کہنے لگا "اڑے بچہ رکھ لو۔ سیٹھ اپنا خاص آدمی ہے۔ خرچی کو دیتا ہے تو نئیں نئیں بولو۔ ہا؟"

لسی شاپ سے نکل کے الٰہ بخش نے پھر ایک ٹیکسی پکڑی اور ہماری والی بلڈنگ کے سامنے مجھے اتار دیا۔ بیلا بائی صاحب کی دوائی والی شیشی میرے حوالے کی، اور ہاتھ ہلاتا روانہ ہو گیا۔

لسی والے دن کے بعد سے میں کتنے ہی دن یہ سوچ سوچ کے مگن رہا کہ یار وُشیدی، الٰہ بخش، کالا شیر، جس

سے مَیں دہشت بھی کھاتا تھا اور جو مجھے بہت اچھا بھی لگتا تھا؛ واقعی میرا دوست بن گیا ہے۔
یہ خیال ہی بہت زبردست تھا کہ الف لیلہ جیسی کسی اسٹوری سے نکل کے ایک ڈینجر آدمی میرے ساتھ لسی شاپ میں گیا تھا اور سب کو ہنس ہنس کے بتا رہا تھا کہ میں... جاوے اس کے بھائی کا بیٹا ہوں۔
مگر مَیں اپنے پاڑے والوں کو یا اپنی بلڈنگ، اپنے فلیٹ والوں کو الف لیلہ جیسے اس قصّے میں شریک نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بات اپنے دوست ملباری کو بھی نہیں بتا سکتا تھا۔
پھر سب کچھ میرے اندر دھیما پڑ گیا۔ باہر اور ہی کوئی ہلچل شروع ہوگئی، اس لیے کہ آشک بھا جو سال، سوا سال پیچھے ایک گندے بیوپار کے چکّر میں کہیں سے آیا کرتا تھا، ہفتے بھر کے لیے شہر میں آ گیا تھا۔
سارا کچھ اُتھل پتھل ہوگیا۔ اسلیے کہ وہ آتا تھا تو علاقے کی ڈیرے دارنیاں، پولیس اور خفیہ پولیس والے، بڑے بڑے دلال اور علاقے کے نقلی پہلوان؛ سبھی مصروف ہو جاتے تھے۔
اس کے شہر سے جانے تک مَیں نہ اپنی مرضی سے کہیں جا سکتا تھا نہ کچھ کر سکتا تھا۔ مَیں کیا، فلیٹ کی لڑکیاں وڑکیاں بھی کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔
آشک بھا، بیلا بائی صاحب کے سوا کسی ڈیرے دارنی سے خود ملنے نہیں جاتا تھا۔ بس اس کے آدمی، بغیر میٹر کی پرائیویٹ ٹیکسیوں میں ملاقاتی عورتوں مردوں کے ساتھ برابر کہیں آتے جاتے رہتے تھے۔ وہ خود چوتھے پانچویں دن ہمارے فلیٹ پر آتا تھا۔
پہلے اس کا آدمی شہد کی چھ آٹھ بوتلیں، خشک میوے کی تھیلیاں اور چاندی کی ڈبیوں میں معجونیں لے کر آتا تھا اور آ کے کہتا تھا کہ لو بائی صاب! آشک بھا نے آپ کو سلام بھیجا ہے۔ جواب میں بیلا بائی صاحب آشک بھا کو دعا پہنچاتی تھیں اور اُسے پچاس کا ایک نوٹ پکڑا دیتی تھیں کہ لو رے تم لوگ فلم دیکھ لینا۔ وہ انھیں سلام کرتا تھا اور آشک بھا کے لیے ٹائم لے کر چلا جاتا تھا۔
پھر سویرے ہی کوئی مجھے بتا دیتا تھا کہ آج اتنے بجے آشک بھا آئے گا اور مجھے فلاں کام سے اتنے بجے نکل جانا اور پھر اتنے بجے آنا ہے۔ لڑکیوں کو بھی معلوم ہو جاتا تھا کہ انھیں اتنے بجے، سامنے کی تانی بائی کا کمرا کھلوا کے اتنی دیر اُدھر بیٹھنا ہے۔ لڑکیاں سب کچھ جانتی تھیں لیکن مجھے اس قصّے سے دور رکھا گیا تھا۔ پھر بھی میں نے ادھر اُدھر سے سن رکھا تھا کہ یہ آشک، کمینہ، کس چکّر میں ہے۔
لوگ جانتے تھے کہ یہ کہیں سے چھوٹی عمر کی لڑکیاں لا لا کے بیچتا ہے؛ جبھی تو اس کے جاتے ہی بلڈنگوں میں نئی نئی صورتیں نظر آنے لگتی ہیں اور پولیس والے اور دلال اس حرام خور کے آگے پیچھے منڈلاتے اور بھنبھناتے رہتے ہیں۔
اس کے شہر میں ہوتے بیلا بائی اور تانی بائی فلیٹ کی لڑکیوں کے ساتھ، کسی رانے صاحب کی موٹر بوٹ میں سمندر کی سیر کو جاتی تھیں۔ پر بائی صاحب مجھے کبھی ساتھ نہیں لے جاتی تھیں؛ شکایت کرتا تھا تو پیسے پکڑا دیتی تھیں کہ عورتوں، لڑکیوں کے ساتھ جا کے کیا کرے گا؟ لے، بھورے جابر کے ساتھ چلا جا۔
اس بار سمندر کی سیر سے لوٹیں تو بیلا بائی صاحب بہت خوش تھیں۔ میرے لیے ہوٹل سے کچھ کھانے کو بھی

لائی تھیں۔ خیر، کھا پی کے میں کوئی ساڑھے دس گیارہ بجے اپنی لینڈنگ پہ سونے چلا گیا۔
کوئی ایک بجا ہوگا کہ مجھے کسی کے سسکیاں لے کے رونے کی آواز آئی۔ کہیں کوئی لڑکی یا لڑکا رو رہا تھا۔ آواز تانی بائی کے فلیٹ سے آئی تھی؛ تو مَیں دروازے سے کان لگا کے سننے لگا۔ یہ کون آیا ہے تانی بائی کے گھر؟ مَیں کچھ دیر بیٹھا رہا۔ سسکیاں اور رونا بند ہو چکا تھا۔
مَیں پھر سو گیا۔
سو کر اٹھا تو صبح ہی سے مجھے سامنے کے فلیٹ کی ٹوہ لگ گئی۔ سوچتا رہا کہ کوئی چکر چلا کے تانی بائی کے فلیٹ میں گھسنا چاہیے۔
سارے دن اسی ادھیڑ بن میں رہا اگر بغیر کسی وجہ کے تانی بائی کا دروازہ کھٹکھٹاتا تو خود تانی بائی جھک جھک کرتی۔ بیلا بائی صاحب کو خبر ہوتی تو وہ الگ فضیحتا کرتیں۔
لیکن شام سے پہلے ایک موقع مل ہی گیا:
تیز تیز سیڑھیاں چڑھتا مَیں نیچے سے چلا آرہا تھا؛ تانی بائی، بھاری بدن کی عورت، کاغذ کی تھیلی میں کچھ لیے ہوئے مجھ سے پہلے لینڈنگ پر پہنچ گئی تھی کہ اچانک سودے کی تھیلی پھٹ گئی۔ تانی بائی نے "اوئے!" کہہ کے چیخ سی ماری۔ مَیں نے دیکھا پکے پکے بیروں کا چھوٹا سا آبشار سیڑھیوں پر اچھلتا ہوا میری طرف چلا آرہا ہے۔
تانی بائی بولی، "سنبھالنا پتر!"
مَیں نے مستعدی سے بیٹھ کے لڑھکتے ہوئے بیر روکنا شروع کیے، ساتھ ہی دماغ میں ایک منصوبہ بن گیا۔ گھر میں گھسنے کا یہی موقع ہے، اور مَیں تیزی سے بیر سمیٹنے لگا۔
تانی بائی کھسیانی بطخ کی طرح ہنستی ہوئی آگے بڑھی۔ اس نے اپنا دروازہ بجایا اور جب دروازہ کھل گیا تو مجھے سارے ہی بیر اکٹھا کرنے کا کہہ کر وہ اندر چلی گئی کہ، "ٹھہر جا پتر! میں کوئی برتن شرتن لاتی ہوں۔"
مجھے برتن کا انتظار نہیں کرنا تھا۔ جلدی جلدی جتنے بھی بیر اپنی قمیص کے دامن میں بھر سکا، بھر کے، مَیں اٹھا، اور تانی بائی کے پیچھے پیچھے فلیٹ میں داخل ہو گیا؛ اور باورچی خانے تک چلا گیا "لو بائی، یہ سنبھالو۔ ابھی اور لاتا ہوں۔"
سب کچھ اتنا فطری تھا کہ تانی بائی نے "ہاں رے، ہاں رے" کرتے ہوئے مجھے باورچی خانے میں بلا لیا۔ وہ برتن لینے بڑھی: مَیں نے تیزی سے فلیٹ کے لاؤنج میں نظر ڈالی۔ بالکنی کی طرف دیکھا۔ کمروں کے دروازے بند تھے۔ لاؤنج میں تانی کی شاگرد؛ جس نے دروازہ کھولا تھا، کھڑی ہوئی کنگھی کر رہی تھی، اور بالکنی میں دس گیارہ برس کی ایک لڑکی لٹھے کی شلوار قمیص پہنے ڈری ہوئی سی کھڑی باورچی خانے کی طرف دیکھ رہی تھی۔
تانی کی شاگرد کو، ذرا دیر سے ہی، مگر احساس ہو گیا تھا کہ لڑکی کو میرے سامنے نہیں آنا چاہیے۔ وہ کنگھی چھوڑ کر بالکنی کی طرف ہاتھوں، آنکھوں سے اشارے کرتی ہوئی بڑھی۔ وہ اس طرح چلی تھی کہ میرے اور بالکنی

کے بیچ اس کے بدن کی آڑ ہو گئی تھی۔
مگر میں نے اپنا اگلا قدم سوچ لیا تھا۔ میں نے تانی بائی سے بڑی چٹک مٹک چونچال آواز میں پوچھا،
''ارے واہ! یہ کون ہے؟ ہاں تانی بائی! یہ لڑکی مہمان آئی ہے؟''
''آں؟'' تانی گھبرا کر مڑی مگر اس نے اس گھبراہٹ کو خوش مزاجی کی چہکار میں بدل دیا،''مہمان کیسی بیٹا! میری بھین کی بچی ہے۔ ماں گزر گئی ہے اس کی، تو اب ادھر ہی...''
پھر اس نے اپنی شاگرد سے کہا،''او مینا! جا، چوٹی باندھ دے اس کی، اندر لے جا۔ کب سے کہہ رہی ہے بچی، پر تجھے اپنی پڑی رہتی ہے۔''
شاگرد نے کھردرے پن سے چھوٹی لڑکی کو کندھا پکڑ کے کھینچا اور اپنی اوٹ میں لیے ہوئے کمرے کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ مجھے یا لینڈنگ پر آنے والے کسی کو بھی لڑکی پوری طرح نظر نہ آئے۔
مگر میں نے لڑکی کا چہرہ اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ اس کی ٹھوڑی پر دائیں طرف ایک چھوٹا سا تل تھا۔ وہ اپنی بڑی بڑی خوف زدہ آنکھوں سے برابر مجھے دیکھے جا رہی تھی۔
جلدی جلدی تانی بائی کے بیرسمیٹ کے میں اپنے فلیٹ میں آ گیا۔
میں نے سوچ لیا تھا، لڑکی والے قصے کو تانی بائی کے فلیٹ تک نہیں رہنے دوں گا؛ ادھر بھی سب کو بتا دوں گا کہ مجھے سب پتا ہے۔ اب ایسا بھی کیا!
فلیٹ میں آتے ہی میں نے بڑی تفصیل سے تھیلی پھٹنے اور تانی بائی کے خجل خوار ہونے کا قصہ سنایا۔ بتا دیا کہ کس طرح میں سیڑھیوں پر سے بیرسمیٹ کے تانی بائی کے فلیٹ میں پہنچا تا رہا،''اور ہاں اے شبو! خبر ہے، تانی کی بہن کی بیٹی مہمان آئی ہوئی ہے۔ مجھے تو پینڈو لگی، مگر خوب صورت ہے۔''
شبو تو خیر کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی، بائی صاحب نے میری بات سنکے ناجو کی طرف گھبرا کے دیکھا۔ دور کھڑی چمپا نے بھی انھیں دیکھا اور ناجو کو اشارہ کیا۔
تھوڑی دیر بعد بائی صاحب نے مجھے پھر کام سے بھیج دیا۔ مجھے معلوم تھا وہ کام سے بھیجیں گی اور پورا قصہ سننے کو تانی کو بلائیں گی۔ اس لیے میں نے دوڑ کر اس کے فلیٹ پر ملباری کو جاسوسی پہ لگا دیا۔ وہ میرے چھوٹے موٹے کام کر دیا کرتا تھا، دوست جو تھا۔
بعد میں ملباری نے بتایا کہ میرے جاتے ہی ناجو، تانی کو ہماری طرف بلا لے گئی۔ وہ بہت چنٹ لڑکا تھا؛ ایک منٹ بعد ہی ہمارے فلیٹ میں یہ کہتا ہوا گھستا چلا گیا کہ اس کی سوڈے کی دو بوتلیں نہیں مل رہیں۔
ملباری نے بتایا کہ بائی بہت گرم ہو رہی تھی؛ شاید تانی کو 'موچڑا' دے رہی ہونگی۔ تانی بائی منہہ لٹکائے کھڑی تھی۔
خیر، دو روز تک کچھ نہ ہوا۔ سب نے جیسے چپکی داب لی۔
آخر تیسرے روز مجھے تانی بائی کی 'بھانجی' کا قصہ نیا کرنے کا موقع مل گیا۔
رات کے نو بجے جب ہماری سڑک کے چوراہے پر ڈاکٹر گستاد کا کلینک بند ہونے والا تھا، میں نے تانی

بائی کی شاگرد مینا کو گھر کے کپڑوں میں اوپر سے چادر لیے کلینک میں داخل ہوتے دیکھا۔ میں سڑک کی دوسری طرف بیکری میں کھڑا تھا۔ مینا کو جاتا دیکھ کر میں خود بھی اس کے پیچھے پیچھے مطب میں گھس گیا۔

وہ اندر کمپاؤنڈر کی کھڑکی میں منہہ ڈالے اس سے بات کر رہی تھی۔ میں نے دبے پاؤں جا کر سننے کی کوشش کی۔ کھڑکی کے پاس پارٹیشن لگا تھا اور بینچ پڑی تھی۔ میں وہیں اوٹ میں بیٹھ گیا۔

کمپاؤنڈر کہہ رہا تھا،"ابھی ڈاکٹر صاحب اٹھنے والے ہیں۔ میں بول دیتا ہوں، تم اسے لے آؤ، وہ دیکھ لیں گے، دوا دے دیں گے۔"

مینا کہنے لگی،"ابھی نہیں لا سکتے، تم دوائی دے دو۔"

کمپاؤنڈر بولا،"باؤلی تو نہیں ہوئی ہو؟ ایسے کوئی دوا دیتے ہیں؟"

"دے دو نا- بخار کی دوائی دے دو۔ سویرے ہم لوگ ڈاکٹر کو دکھا دیں گے۔"

"لڑکے کی عمر کتنی ہے؟" کمپاؤنڈر نے پوچھا۔

مینا نے بتایا،"دس بارہ سال۔"

لڑکا؟ میں نے سوچا، دس بارہ سال کا تو کوئی لڑکا تانی بائی کے فلیٹ میں، بلکہ پورے زینے پر نہیں ہے۔ یہ کیا چالاکی ہے؟ وہی لڑکی ہوگی، تل والی۔ ایں؟ کیا وہ بیمار ہوگئی؟

میں نے سنا، کمپاؤنڈر نے رُوکھے پن سے کہا تھا،"دس برس کے بچے کے لیے ایسے دوا نہیں دوں گا مینا! ابھی دکھا دو، یا سویرے لے آنا۔"

مینا نے اس کی خوشامد شروع کر دی۔ کبھی وہ اٹھلا اٹھلا کے اسے رضامند کرنے کی کوشش کرتی، کبھی خفا ہوتی مگر کمپاؤنڈر سختی سے جواب دے رہا تھا۔

میں خاموشی سے کھسک آیا اور بیکری میں ایک طرف کھڑا ہو کے انتظار کرنے لگا۔ وہ نکلی تو چال سے لگ رہا تھا کہ کام نہیں بنا۔ دو منٹ بعد ہی میں بیکری سے اپنے فلیٹ میں آگیا اور لاؤنج میں بیٹھ گیا۔

بیٹھک میں مجرا چل رہا تھا۔ سبھی وہاں تھیں۔ بائی صاحب بھی وہیں تھیں۔ کسی کام سے شاید سر درد کی گولی کھانے، گل بدن اندر آئی تو میں نے شوشہ چھوڑ دیا۔

اس نے ویسے ہی پوچھ لیا تھا کہ ایسے کیوں بیٹھا ہے، مخنچو کی طرح؟ تو میں نے کہا،" پتا ہے؟ گڑبڑ ہوگئی!"

"کیا گڑبڑ؟" گل بدن کو جلدی تھی، وہ پانی پینے لگی۔

میں نے کہا،"ابھی ڈاکٹر گستاد کا کمپوڈر ملا تھا، بیکری میں۔ بولتا تھا، تانی کی بھانجی کی بہت حالت خراب ہے۔ بخار، اور وہ کیا کہتے ہیں، سرسام کی حالت ہے! ابھی ابھی مینا پہنچی تھی اس کے پاس۔"

"ارے!" گل بدن کو واقعی فکر ہوگئی تھی۔ میں نے کہا،"ہاں! سنو تو- مینا کمپوڈر سے کہہ رہی تھی ہم سویرے اسے ڈاکٹر کو دکھا دیں گے۔ ابھی تو تم ایسے ہی دوا دے دو۔"

"پھر؟"

"پھر کیا، کمپوڈر بولتا ہے، میں نے منع کر دیا۔ بچی کو مارنا نہیں ہے بھائی۔ ایسے ہی بغیر دیکھے دوا نہیں

دوں گا۔ کچھ الٹا سلٹا ہو جائے تو پولیس کیس بنے گا، بلا وجے۔"

گل بدن گلاس رکھ کے تیر کی طرح بیٹھک کی طرف چلی گئی۔

مجرا چل رہا ہو تو محفل چھوڑ کے ایک دم کوئی نہیں اٹھتا۔ جن کی بیٹھک ہو، جن کی شاگرد سنا رہی ہو، وہ تو اونچی آواز میں سانس بھی نہیں لیتے؛ مگر میری چھوڑی ہوئی ہوائی ایسی نہیں تھی کہ بائی صاحب آنے والوں کو اسی طرح بیٹھی پان سگریٹ پیش کرتی رہتیں۔ دو منٹ میں وہ اندر چلی آئیں۔

بیلا بائی صاحب اپنی پریشانی میں سیدھی میرے پاس آئی تھیں۔ مَیں اگر کمپاؤنڈر کا راز دار تھا تو اب یہ قصہ مجھ سے نہیں چھپایا جا سکتا تھا۔ مَیں دھیرے دھیرے تانی بائی کے راز میں داخل ہو رہا تھا۔

انھوں نے آتے ہی پوچھا، "کمپوڈر کیا کہہ رہا تھا رے؟"

مَیں نے وہی بات دُہرا دی جو گل بدن کو سنائی تھی؛ اور بائی صاحب کے لیے ایک فقرہ نیا بھی بڑھا دیا۔ مَیں نے شکایتاً کہا، "بائی صاحب! یہ کمپوڈر دوسروں کے پھڈے میں ہم لوگ کو کیوں الجھاتا ہے۔ مَیں نے تو کہہ دیا، بھائی ہم بیلا بائی صاحب والے ہیں۔ تانی بائی کی مینا کیا کر رہی ہے، کیا نہیں کر رہی، یہ ہمیں کیوں سنا رہے ہو۔"

بیلا بائی نے مجھے گھور کے دیکھا۔ میرا چہرہ انھیں ایک دم سادہ لگا ہوگا۔ اس لیے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ جلدی جلدی سمجھانے لگیں کہ، "پتر! ہم سے تو کچھ نہیں، پر پڑوس کا معاملہ ہے، کمپوڈر نے اس خیال سے کہہ دیا ہوگا۔"

لڑکیاں محفل میں تھیں۔ مَیں اب تانی بائی کی بھانجی کے قصے میں پوری طرح اتر چکا تھا۔ بائی صاحب نے کہا، "جا بیٹا جھپٹ کے تانی کو تو بلا لا۔"

وہ مارا! مَیں نے دل میں کہا اور تیزی سے باہر نکل، تانی بائی کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ دستک پہ مینا ہی آئی۔ اس نے مجھے دیکھ کر آدھا پٹ کھولا، دروازے میں آڑی کھڑی رہی بولی، "کیا بات ہے؟" مَیں نے آرام سے ہاتھ بڑھا کر مینا کو پیچھے ہٹایا۔ "ارے ارے! کیا کر رہا ہے۔ کہاں گھسا آتا ہے؟"

"چل ہٹ!" مجھے اب موقع ملا تھا۔ مینا کمزور سی لڑکی تھی۔ ناجو کی طرح کھائی پی نہیں تھی۔ وہ اماں اماں کر کے پکارتی رہی مگر میں اسے ٹھیل کر ہٹاتا فلیٹ میں گھستا چلا گیا۔ مَیں سمجھ رہا تھا کہ چھوٹی لڑکی کو تانی نے اپنے کمرے میں لٹایا ہوگا۔

میرا خیال صحیح تھا، لڑکی کو تانی نے اپنے بستر پر لٹایا ہوا تھا؛ وہ کراہ رہی تھی۔

تانی نے دروازے پر یہ سب گڑبڑ ہوتے سنی تو وہ جھپٹ کر کمرے سے چلنے کو ہوئی۔ مجھے اس طرح زور آزمائی سے آتے دیکھ کر بھتے سے اکھڑ گئی، بولی، "کیا بات ہے اوئے... فلانے۔" اس نے گالی دی تھی۔

مَیں نے روکھے پن سے کہا، "تانی بائی! گالی نہیں دینا دوبارہ... ہاں؟ کام سے آیا ہوں، بائی صاحب نے بلایا ہے۔ چلو ابھی۔"

اس نے غصے سے کہا، "مت آیا کر تو ادھر۔ دادا گیری کرتا ہے۔ ٹانگ برابر چھوکرا۔"

"میں کائے کو آؤں گا۔ بائی صاحب نے کہا ہے اس لیے آیا ہوں۔ جب سے کمپوڈر نے بتایا ہے، پریشان ہو رہی ہیں۔"

"ایں؟... کمپوڈر نے... کیا بتایا ہے؟"

"بولتا ہے مینا گئی تھی اس کے پاس۔ یہ! پاگل نہیں تو!"

تانی بائی کے لیے پریشانی پر پریشانی چلی آرہی تھی۔ اس نے مینا کو دیکھا پھر مجھے دیکھا، جھنجھلا کے بولی، "تو کدھر سے بیچ میں ٹپک پڑا۔ جا کام کر اپنا۔ آتی ہوں۔"

میں نے تانی کے کمرے کی طرف دو قدم بڑھائے۔ تشویش سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بستر پر پڑی کراہتی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھا، چچ چچ کر کے کہا، "اوہو! بے چاری۔"

"چل چل، ادھر آ۔" تانی کھردرے پن سے مجھے بازو سے کھینچتی ہوئی اپنے فلیٹ سے نکال لائی۔

جیت کی خوشی ایک لہر کی طرح میرے اندر سے گزر گئی۔ سب لڑکیوں کی طرح مجھے بھی اس قصے میں شریک مان لیا گیا تھا۔

بائی صاحب کے فلیٹ میں تانی بائی اور میں ایک ساتھ داخل ہوئے تھے؛ تو اب مجھ سے کچھ بھی چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تانی سے پوچھنے لگیں، "کب سے ہے بخار؟ اور آپ ہی آپ تو نے اس لتّی مینا کو کمپوڈر کے پاس کیوں بھیج دیا؟ ہمیں کیوں نہیں بتایا؟"

"میں نے سوچا کوئی گولی مکسر دے دے گا۔ بخار ہی تو ہے، اتر جائے گا۔ اب یہ کون پتا تھا وہ رحامی انکار کر دے گا۔" تانی نے میرے حصے کا غصہ کمپاؤنڈر پر نکالنا شروع کر دیا۔

"کتنا بخار ہے؟"

"یہ تو پتا نہیں جی، بہت تپ رہا ہے پنڈا۔"

میں نے مستعدی سے یاد دلایا، "بائی صاحب! کمپوڈر بولتا ہے سرسام جیسی حالت ہے۔"

بائی نے پریشانی سے میری طرف دیکھا، سر ہلایا، تانی سے بولیں، "ایسا کر ابھی اسپتال لے جا۔"

"اسپتال؟" تانی نے اسپتال ایسے کہا جیسے گاؤں والے پریشان ہو کے کہتے ہیں۔

"ٹیکسی منگالے، رشیدے کو ساتھ لے لینا۔ سمجھی؟"

"اچھا جی، بائی جی صاب۔" تانی نے یہ بات ملازماؤں جیسی فرماں برداری سے کہی تھی۔

مجھے جس بات کا شک تھا، اب اس کا یقین ہو گیا۔ میں سمجھ گیا، تانی نے تل والی لڑکی کو بائی کی طرف سے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ بھانجی وانجی وہ کسی کی نہیں ہے۔ بائی صاحب نے اسے آشک بھائی کی اسی کھیپ میں سے خریدا ہے۔ مجھے رات میں اس کا سکیاں لے لے کر رونا یاد آگیا۔

صبح بالکنی میں کھڑی وہ میری طرف کیسے دیکھ رہی تھی؛ جیسے بندھی ہوئی بکری ہوتی ہے۔ میں اس بے چاری کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟... تو بس، میں نے ابھی تو ان سب لوگوں کا ہاتھ بٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے کہا، "بائی صاحب! نیچے جا کے ٹیکسی پکڑ لوں؟ آں؟"

"ہاں بیٹا، جا- اور دیکھ نیچے رشید ہو تو بھیجنا ادھر۔"

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے فیصلہ کر لیا میں نے کہ رشیدا پہلوان یا اس کا پٹھا، بھورے جابر بالکل نہیں جائیں گے؛ لڑکی کے اور تانی کے ساتھ میں جاؤں گا۔

تو بس میں نے سول اسپتال کیلیے ٹیکسی روکی۔ دور دکان کے تھڑے پے بھورے جابر پڑا تھا، اسنے سر اٹھا کے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا، "کیا بات ہے؟" میں نے ہاتھ ہلا دیا؛ "کوئی بات نہیں۔" بھورے جابر دکان کے تختے پر پھر لمبا لمبا لیٹ گیا۔ اور کیا؛ وہ نشے میں ہوگا اور وہ اس کا استاد رشیدے بدمعاش؛ چھوٹے بزار کی کوٹھری میں پڑا اپنی لڑکیوں میں سے کسی سے سر مالش کرا رہا ہوگا۔

میں نے اوپر آ کر بائی کو بتا دیا کہ "ٹیکسی آ گئی ہے بائی صاحب! اور ہاں! کوئی بولتا ہے رشیدے استاد اور بھورے جابر سینما کی طرف دِکھے تھے۔"

آخری شو کے ٹکٹوں کی بلیک کا وقت چل رہا تھا۔

انھوں نے "لعنت" کہہ کر منھ بنایا۔ میں نے فوراً اپنی خدمات پیش کر دیں، "بائی صاحب! آپ بولو تو میں چلا جاؤں؟ تانی بائی اکیلی کیا جائیں گی- میں ٹیکسی کو روکے رکھوں گا۔"

انھیں معلوم تھا، واپسی کے لیے ٹیکسی ملنے میں مشکل ہوگی، بولیں، "ہاں رے ہاں، چلا جا میرے بچے۔"

میں نے گلے میں ریشمی مفلر ڈالا اور تانی بائی کے دروازے پر دستک دی۔ "چلو چلو کیا سو گئیں؟"

اُسے میرے ساتھ جانے کا معلوم ہوا تو یہ بات اُسے پسند نہ آئی؛ میں نے بتایا، یہ بائی کا آڈر ہے، اس لیے چپ رہی۔

مینا، چھوٹی لڑکی کو گرم شال اُڑھا کے ٹیکسی تک لائی۔ لڑکی کانپ رہی تھی اور آہستہ آہستہ کچھ بولے جا رہی تھی۔ میں نے بٹھانے میں مینا کی مدد کی۔ تل والی لڑکی نے آنکھیں کھول کر ایک بار مجھے دیکھا، اور دھیرے سے کہا، "پانی!"

میں نے مینا سے لڑکی کے لیے پانی لانے کو کہا تو وہ بولی، "بیٹھا رہ! بکواس ناں کر!" تانی نے بھی مجھے گھور کے دیکھا تھا، لیکن ٹیکسی والے کو بہت تڑی کے ساتھ تو میں بلا کے لایا تھا۔ میں نے اسے رکنے کو کہا اور اوپر جا کر ایک گلاس پانی لے آیا۔

لڑکی نے تھوڑا سا پانی پیا اور بولی، "بس۔" اسنے پانی پیتے ہوئے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے دیکھا تھا۔ بخار کی شدت سے اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھی۔

اسپتال کے ایمرجنسی والے دروازے پر دو آدمی موجود تھے۔ وہ آرام سے لڑکی کو اسٹریچر پر اٹھا لے گئے۔ تانی "ہاں میرا بچہ۔ بس میرا بچہ۔ خیر میرا بچہ!" کہتی ہوئی اسٹریچر کے ساتھ ڈگمگاتی چلی گئی۔ ظاہر کر رہی تھی جیسے وہ لڑکی کی بہت محبت کرنے والی رشتے دار ہے۔ منحوس!

آدھے گھنٹے بعد اسٹریچر والے اور تانی، لڑکی کو واپس لے آئے۔ تانی جم کے لڑکی کے پاس بیٹھ گئی؛ مجھ سے کہنے لگی، "یہ پرچی لے جا، دوا بنوا لے۔"

وہ مجھے لڑکی کے پاس اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

دوا بنواتے ہوئے میں ترکیبیں سوچ رہا تھا۔ تانی کو کسی طرح دو چار منٹ کے لیے یہاں دواؤں والی کھڑکی پہ الجھا دوں تو کام بن جائیگا۔ وہ ٹیکسی میں تو لڑکی کو اکیلا نہیں چھوڑے گی، مجھے ہی اس کے پاس بٹھا کے آئے گی۔ مَیں لڑکی سے بات کرنا چاہتا تھا۔ آخر پتا تو چلے کہ کون ہے، کہاں سے آئی ہے۔

دوائیں بن گئی تھیں۔ کمپاؤنڈر نے کہا، ''ہاں بھئی یہ کون ہے؟ مینا کس کا نام ہے؟''

اچھا! تانی نے لڑکی کا نام مینا لکھوایا تھا؟ مَیں نے کہا، ''ہاں ادھر، مینا کی پرچی مَیں نے دی ہے۔''

کمپاؤنڈر نے شیشی اور پڑیاں میری طرف بڑھا دیں، ''لے بھئی یہ سنبھال۔ تین وقت یہ کیپسول دینا ہیں، چھ چھ گھنٹے سے: یہ مکسچر ہے اور اگر بخار نہیں اترے تو...'' خبر نہیں وہ اور کیا کیا کہتا رہا۔ مَیں نے کم زور دماغ بونگے لڑکے کی طرح کبھی انکار میں، کبھی 'ہاں' میں سر ہلا ہلا کے سب گڑبڑ کر دیا کچھ ایسا کہنا شروع کر دیا کہ اچھا؛ تین تین گھنٹے سے گولیاں اور کیپس ول؟

کمپاؤنڈر نے کیپسول اور گولیوں کی تھیلی میرے ہاتھ سے جھپٹ لی، ''چل بے! کسی بڑے کو بلا کے لا۔ پاگل سالا!''

مَینے تیزی سے ٹیکسی کے پاس آ کر کہا، ''وہ دوا مجھے نہیں دے رہے۔ کہہ رہے ہیں تیز کیپسول ہیں، اماں کو بلا کے لا، انھیں ہی سمجھاؤں گا۔ بھگا دیا مجھے۔''

تانی گالی نکالتی ہوئی بہت مشکل سے ٹیکسی سے اتری، مجھ سے غرا کے بولی، ''لے تو ادھر ہی رہنا، اس کے پاس۔'' اور بطخ کی طرح ہلتی ہوئی چلی گئی۔ لڑکی نے میری آواز سن کے اپنی آنکھیں کھولی اور بند کی تھیں۔

مَیں نے آہستہ سے پوچھا، ''نام کیا ہے تیرا؟''

''دانی!'' لڑکی نے پھر آنکھیں کھولی تھیں۔

مَیں نے جلدی جلدی پوچھنا چاہا، ''اماں زندہ ہے تیری؟ ایں؟ اماں کا نام کیا ہے؟ ہیں دانی؟ وہ زندہ ہیں؟''

اس نے گھبرا کے اِدھر اُدھر دیکھا، آہستہ سے بولی، ''پتا نئیں۔''

مَیں نے ہولے سے اس کے تپتے ہوئے سر اور پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا، ''اماں تیری گاؤں میں ہیں؟ وہ زندہ ہیں نا؟''

لڑکی نے بہت ڈر کے ٹیکسی والے کی طرف دیکھا۔ ٹیکسی والے کا دھیان کہیں اور تھا۔ لڑکی نے ہولے سے 'ہاں' میں سر ہلایا اور پھر وہ بے آواز رونے لگی۔

مَیں نے سر تھپکنے کو ہاتھ بڑھایا، وہ سمجھی مارنے کو ہاتھ بڑھاتا ہوں؛ تو ڈر کے وہ ایک دم چپ ہوگئی، کانپنے لگی۔ اوہو؛ وہ لوگ مار پیٹ کرتے ہوں گے۔

''نہیں، ڈرو نہیں۔ مَیں دوست ہوں تمھارا۔ رات کو تم رو رہی تھیں؟ رونا مت اب۔ مَیں زینے پر ہی سوتا ہوں۔ دروازے کے بالکل باہر۔ ہاں، کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ مَیں اِدھر ہی ہوتا ہوں، آئی سمجھ میں؟ جا دے

نام ہے میرا۔ جاوے۔ دوست ہوں"

لڑکی نے ہاں میں سر ہلایا۔ میری باتوں سے شاید اس کا ڈر ہلکا ہوا تھا۔

میں نے دیکھا: گیٹ کی پیلی روشنی میں تانی بائی بلتی جلتی آہستہ آہستہ ادھر ہی آرہی تھی۔ اس نے ابھی تک مجھے ٹیکسی میں بیٹھے نہیں دیکھا ہوگا۔ میں آہستہ سے سیٹ چھوڑ کر باہر آگیا۔ ٹیکسی والے کو اپنی طرف متوجہ کر کے اسے گاڑی اسٹارٹ کرنے کا مشورہ دینے لگا۔ تانی نے آتے ہی شیر کی طرح مجھے اور پھر لڑکی کو دیکھا۔ میں تو جیسے بالکل بے تعلق کھڑا ڈرائیور سے گپ مار رہا تھا۔

"چل بھئی چل۔" تانی جیسے تیسے گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔

بلڈنگ پہ پہنچے تو ٹیکسی رکتے رکتے، مینا اپنے فلیٹ سے اتر کر سیڑھیوں تک آگئی تھی۔ ایکطرف سے تانی، دوسری طرف سے میں؛ لڑکی کو سہارا دیکر اسکا شال سنبھالتے ہوئے سیڑھیاں چڑھا رہے تھے کہ مینا نے بڑھکے میرا ہاتھ جھٹک دیا، "چل ہٹ! یہ لے... جا پیسے دے ٹیکسی والے کو۔"

بیلا بائی صاحب اس روز "محفل" میں زیادہ دیر نہ بیٹھیں۔ واپس فلیٹ میں پہنچا تو میں نے انھیں بالکنی میں کھڑے دیکھا۔ پریشان تھیں۔ انھوں نے لڑکی کا حال پوچھا اور خلافِ معمول تانی بائی کی طرف چلی گئیں۔

پچھلی رات میں نے دانی کے رونے کی آواز سنی تھی۔ آج آدھی رات ہوئے تک میں نہ صرف اس کا نام جان گیا تھا بلکہ مینے یہ بھی معلوم کرلیا تھا کہ اسکی ماں زندہ ہے۔ وہ کسی گاؤں کی رہنے والی ہے اور یہ لوگ اس کو مارتے پیٹتے ہیں۔

پچھلے دس گیارہ گھنٹوں میں سب سے بڑی بات یہ ہوئی تھی کہ میں نے خود کو بیلا بائی اور تانی کے اس چکر میں شریک کرلیا تھا۔

اس رات میں سکون سے سویا۔ یہ عورتیں اور مینا میرا کیا بگاڑ سکتی ہیں؟ وہ تو خود اس بڑے پھڈے میں الجھی ہوئی ہیں۔ کوٹھے پہ عمر بسر کرتے مینے سیکھ لیا تھا کہ جس کسی کی کمزوریاں پتا چل جائیں، دل سے اس کا ڈر نکل جاتا ہے۔

آگے چل کر مجھے یہ بھی سیکھنا تھا کہ اس علم کو نکیل بنا کر کسطرح زور آوروں کو اپنی مرضی سے چلایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی مجھے اور بہت کچھ سیکھنا باقی تھا۔

مگر اگلے دن مجھے دانی کے قصے سے باہر کر دیا گیا۔ سامنے والے فلیٹ میں میرا جانا منع ہو گیا۔

لاجی نے کہا، "سن رے! مینا سے اور تانی سے بہت منہ ماری کرنے لگا ہے، اب نہ دیکھوں تجھے تانی کی طرف جاتے۔ ٹانگیں توڑ دوں گی، رحامی!"

اگلا پورا دن نکل گیا۔ میں دانی کو نہ دیکھ سکا؛ نہ ہی کسی سے اس کا حال معلوم ہوا۔

تیسرے دن شبو سے بہت ترکیب سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ اب ٹھیک ہے، بخار نہیں ہے۔

میں نے سوچا کوئی ترکیب ایسی لڑانی چاہیے کہ بیلا بائی صاحب، تانی کیطرف جانے کی خود سے اجازت دے دیں۔ میں جیسے پہلے چلا گیا تھا، ویسا کچھ ہو جائے۔

صبح دکانیں کھلیں، تو خوب سوچ سمجھ کے مَیں نے بازار سے دو آنے کی کالی ریشمی ڈوری خریدی۔ اچھی بٹی ہوئی انگلش ڈوری۔ اُس کا ایک ٹکڑا کاٹ کے مَیں نے سات گرہیں لگائیں۔ بالکل پہلوانوں کی گردنوں میں پڑے نظر کے گنڈے کی سی شکل بنالی۔ اس گنڈے کو تہہ کر کے پتنگ کے سرخ کاغذ میں لپیٹ کے، بہت احتیاط سے بائی صاحب کے پاس لے گیا۔ وہ تعویذ، گنڈے، جھاڑ پھونک کو بہت مانتی تھیں۔ مَیں نے سوچا: ایسی ترکیب لڑائی ہے مَیں نے کہ سولہ آنے چکر میں آجائیں گی۔

وہ اپنی چائے ختم کر کے بیٹھی تھیں۔ مَیں سر پہ رومال ڈال کے جیب میں لال پڑیا رکھے، آہستہ سے جا کے سامنے بیٹھ گیا۔ بولیں، ''کیا ہے رے؟ بڑی شرافت سے آکے بیٹھا ہے؟ پیسے چاہئیں؟''

مَیں نے کہا، ''نہیں بائی جی صاحب! پیسے نہیں۔ ایسا کام کر کے آیا ہوں کہ آپ اور تانی ایک دم خوش ہو جاؤ گی۔''

''مَیں اور کون؟ کیا بک ریا ئے پاگل؟ کیسا کام بھلا؟ بول!''

مَیں نے جیب سے لال پڑیا نکالی، ''یہ نظر کا گنڈا لایا ہوں، سنگل بابا سے۔''

پڑیا کھول کے مَیں نے بہت ادب سے وہ 'گنڈا' بائی صاحب کو پیش کیا۔

''کاہے کو لایا ہے؟''

''وہ ہے نا، کیا نام سے؟ دانی، بھانجی اُسکی... بخار بہت آتا ہے اُسے، یہ گنڈا قسم سے... ایسا ہے...''

بیلا بائی کی تیوریاں چڑھ گئیں تھیں۔ انھوں نے انگلی اٹھائی، میری بات ادھوری رہ گئی۔ ایک دم بگڑ کر بولیں، ''کیسی بھانجی؟ کس کی بھانجی؟ او تو باپ لگا ہے سبکا؟ لے رَحامی! ایک دفعے ٹیکسی پکڑ دی تانی کو تو اُسکے گھر ہی میں گھسا جا رہا ہے۔'' لاجی نے مردوں والی ایک گالی نکالی۔ پھر ہاتھ میں پکڑے ہوئے گنڈے کو انھوں نے ایسے دیکھا جیسے کینچوا ہو اور وہ اُسے پھینکنے والی ہوں؛ مگر ہمیشہ کا خوف غالب آگیا۔

گنڈے کو پھینکا تو نہیں جا سکتا؛ انھوں نے احتیاط سے اُسے سامنے میز پر رکھ دیا۔ اسی طرح تیوریوں پر بل ڈال کر پوچھا، ''کہاں سے لایا ہے یہ؟''

مَیں نے جو سوچ رکھا تھا، کہہ دیا، ''سنگل بابا سے۔''

''کیسا بابا؟ کدھر رہتا ہے؟''

''ادھر ہی برابر میں۔'' آگے مَیں نے جو سوچا تھا، بیلا بائی کے غصے میں وہ سب غائب ہوتا جا رہا تھا۔

وہ ہزار طرح کے اندیشوں میں اٹھ کے کھڑی ہو گئیں۔ ''برابر میں کدھر؟ بول! رَحامی!''

ان کو اس طرح چیختے مَیں برسوں بعد سن رہا تھا، ''کون بابا ہے؟ تُو کیسے جانتا ہے؟ بتا او تیری تو...'' لاجی کی آواز سے پورا فلیٹ گونج رہا تھا۔ انھوں نے بڑھ کے میری قمیص کا کالر پکڑ لیا تھا۔

لڑکیاں کچی نیند میں آنکھیں ملتی، کمروں سے نکل آئی تھیں۔ یہ نئی بات تھی۔ دوسرے فلیٹوں، کوٹھوں، کوٹھریوں میں ایسی چیخم دھاڑ ہوتی ہی رہتی تھی۔ کوئی پروا نہیں کرتا تھا؛ مگر ہمارے فلیٹ کے لیے یہ بالکل نئی چیز تھی۔

"بتا کیسے جانتا ہے اُس بابے مادر... کو؟"

انھوں نے ایک ہاتھ، اور پھر دوسرا ایسا گھمایا جو میرے کان اور کنپٹی کو سُن کر گیا۔ کوئی اور ہوتا تو گر جاتا۔ مَیں بس لہرا کے رہ گیا؛ مگر میرا سر چکرا رہا تھا۔

ناجو میرے برابر میں کھڑی ہوئی تھی، اس نے روکنے کو ہاتھ بڑھایا؛ مگر پھر خود رک گئی۔ ایک لفظ بھی کسی نے نہ کہا۔ بائی صاحب غصے میں جو کہہ رہی تھیں وہ خود اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہوگا۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ مَیں گھر کی باتیں کہیں جا جا کے سناتا ہوں اور دیکھنا میری وجہ سے سب کو ایک دن ہتھکڑی لگ جانی ہے۔

لاجی نے کالر سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے مجھے کمرے میں بند کر دیا اور کسی کو بھیج دیا کہ جاؤ اُس رشیدے حرام خور کو بلا کے لاؤ۔

رشیدا پہلوان، بائی صاحب کی طرف سے مار پیٹ اور دھونس دھڑی کے کام کرتا تھا۔

مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ مَیں نے حماقت میں خود اپنی موت کو بلا لیا ہے۔ رشیدا کے ہاتھ سے مَیں بہت پٹا تھا۔ سزا دینے والوں میں وہ ایک نمبر کا جلاد تھا.... بہت ہی کمینہ جیسا جلاد! اب میری کھال ادھیڑ دی جائے گی۔

کمرے میں بند تھا اور آگے کی سوچ رہا تھا۔ پہلے مَیں رونے لگتا تھا؛ اور گالیاں نکالتا تھا، پر اب جو بھی ہوگا؛ مَیں نے سوچا، بھگت لوں گا ان بدمعاشوں کو۔ اس رشیدے اور بھورے کو اور اس کمینی تانی بائی کو موقع نہیں دوں گا کہ وہ مجھے کمزور لڑکوں کی طرح روتا بسورتا دیکھیں۔

دانی کو ہمت دلائی تھی تو اب خود بے ہمتی کی بات کیسے کر سکتا تھا۔

آ جائے سالا نقلی پہلوان، نشئی، بدمعاش! آ جائے؛ مارے جتنا مارتا ہے مجھے۔ اُسکی تو...

ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ مجھے کمرے میں بند رکھا گیا۔ رشیدا پہلوان آیا ہوگا۔ اس کی نشئی آواز کی گھوں گھوں فلیٹ میں کچھ دیر گونجی تھی؛ پھر وہ کہیں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر آن مرا؛ مگر اب جو آیا تو اس نے گھوں گھوں کے ساتھ ایک قہقہہ بھی لگایا تھا۔

پھر کسی نے کنڈی کھولی اور مجھے آواز دی۔ یہ ناجو کی آواز تھی۔ کمرے میں بھاری پردوں کی وجہ سے اندھیرا تھا۔ اندر کی لائٹ مَیں نے نہیں جلائی تھی۔ کوئی اندر آیا اور لائٹ جلا دی۔ مَیں نے دیکھا لائٹ شبو نے جلائی تھی۔ وہ اور ناجو مسکراتی ہوئی کمرے میں آئی تھیں۔ ناجو نے ہاتھ میں ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ ٹرے پر ڈھکی ہوئی دو پلیٹیں اور کچھ پھل رکھے تھے۔ دونوں آ کر بیٹھ گئیں؛ نیچے دری پر ٹرے رکھ دی۔

ناجو اور شبو کو مسکراتا دیکھ کر مجھے غصہ آ گیا۔ ایسا کیا تماشا ہو رہا ہے جو یہ مسکرا رہی ہیں۔ مَیں نے دل ہی دل میں انھیں برا بھلا کہا، پاگل، سالی۔

ناجو نے ہاتھ بڑھا کے میرے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنا چاہی۔ مَیں نے سر جھٹک دیا۔ اس نے بڑھ کے میری گردن اپنے بازو کے گھیرے میں لے لی۔

"چھوڑو۔ مت تنگ کرو۔"

ناجو نے گردن کے گرد اپنا شکنجہ کس دیا، بولی، ''ارے واہ رے عاشق۔ عاشق دلگیر... سا آ لے گھونچو!''
اس کے باسی عطر کی تیز خوش بو سے جی گھبرانے لگا؛ مگر اس نے مجھے چھوڑا نہیں پھر وہ اور شبو ہنسی میں پھوٹ پڑیں۔ کمرے کے باہر سے بھی کوئی ہنسا تھا۔ گل بدن ہو گی۔
میرا خیال تھا کہ یا تو اس وقت بائی صاحب فلیٹ میں نہیں ہیں، یا انھوں نے میرا قصور معاف کر دیا ہے اور یہ دونوں مجھے منانے آئی ہیں۔ جو بھی ہو، میں ان سب کو ابھی چکر دوں گا۔ مجھے آخر سمجھ کیا رکھا ہے؟
ناجو نے مجھے دانی کا نام لے لے کے چھیڑنا شروع کیا۔ اس کا نام اُسنے دانی نہیں لیا تھا۔ تانی کی بھانجی کہہ کے مجھے ستا رہی تھی۔
''کیوں بے؟ دو دن میں جوان ہو گیا؟ ایک دم عاشق ہو گیا بھانجی پہ۔ لو سالا۔ نقلی تعویذ گنڈے بنا بنا کے پٹا رہا ہے لونڈیا کو۔ واہ بیٹا!''
یہ ناجو نے کیا کہا؟ نقلی تعویذ گنڈے؟ ان سب کو کیا معلوم؟ ایسے ہی کہہ دیا ہو گا؛ مگر شبو کے ہاتھ میں سیاہ ریشمی ڈوری کا پورا لچھا تھا جس میں سے میںنے نقلی گنڈے کے لیے ٹکڑا کاٹا تھا۔ وہ اسے میری آنکھوں کے سامنے نچا رہی تھی۔
ناجو نے ہنس ہنس کے پوری بات بتائی۔ بائی صاحب نے غصے میں دو ہاتھ مار کے مجھے کمرے میں بند کر دیا تھا؛ مگر انھیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں باہر کسی کو یہ سارا کچھ، یا کوئی بھی بات جا سناؤں گا۔ لاجی کو معلوم تھا کہ میں فلیٹ کی باتیں باہر کسی سے نہیں کہتا۔ رشید اتو چاہتا تھا میری پٹائی لگائے، کہتا تھا، ''آپ ہاں بول دو بائی صاحب! ساری بات ابھی قبلوالوں گا، سالے سے۔'' مگر بائی نے اسے صرف دھمکی دینے کو بلوایا تھا۔
اور پھر ذرا سی دیر میں سامان کی الٹ پلٹ کرتے ہوئے شبو کو سیاہ ڈوری کا لچھا اور پتنگ کا کاغذ مل گیا۔ بائی نے ڈوری دیکھ کر تحقیقات کرنے رشیدے کو بازار بھیج دیا۔ بلڈنگوں کے پاس بساطی کی ایک ہی دکان تھی۔ اس نے بتایا کہ ہاں دو آنے کی کالی ڈوری، جاوے سویرے سویرے لے گیا تھا۔ رشیدے نے بائی صاحب کا موڈ دیکھتے ہوئے قہقہہ مار کے یہی بات بتائی تھی۔
وہ میری پٹائی کرنے پر، مجھے بند کرنے پر کچھ شرمندہ ہوئی ہوں گی؛ جبھی لڑکیوں کو میری طرف بھیج کے خود تانی کے فلیٹ میں جا بیٹھی تھیں۔
شام تک انھوں نے مجھے پیسے دے کے اور بیٹا، برخوردار، پتر کہہ کے منا لیا۔
مگر شام سے پہلے ہی دانی کو سامنے کے فلیٹ سے کہیں اور بھیج دیا گیا۔
لو جی، سب قصہ ہی ختم ہو گیا! میں رات دیر تک جاگتا رہا۔ میں تو بالکل ہی بے بس تھا۔
ملباری سے... جو برابر میرے لیے چھوٹی موٹی جاسوسی کر رہا تھا، بات ہوئی... تو اس نے، بتایا کہ شام سے پہلے بھورے جابر ٹیکسی لایا تھا اور وہ اور رشید ابد معاش، تانی اور دانی کو بٹھا کے لے گئے تھے۔
دانی کا، ملباری نے یہ بتایا کہ اُسے اُن لوگوں نے خوب شال میں لپیٹ رکھا تھا۔ بھورے جابر کے ہاتھ میں دواؤں کی شیشیاں تھیں اور تانی سب کو سنا کے ٹیکسی والے سے کہہ رہی تھی کہ مریض ساتھ ہے، اسپتال لے

جانا ہے؛ آرام آرام سے گاڑی چلا۔ لیکن مَلباری کو پورا یقین تھا کہ وہ اسے اسپتال نہیں لے گئے ہوں گے۔ اس نے دیکھا تھا ٹیکسی میں مینا نے سب سے پہلے کپڑوں کا ایک بکس اور ایک کمبل لا کے رکھا تھا۔

ٹھیک ہے؛ وہ تانی کی بھانجی کو اب ادھر نہیں لائیں گے۔

مَلباری اور مَیں دو دن ٹوہ لیتے رہے۔ یہی لگا کہ دانی کو کہیں اور پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ اسے واپس فلیٹ میں نہیں لائیں گے۔

چھوٹی عمر میں اتنی مایوسی کی باتیں کوئی نہیں سوچتا؛ ایک امید سی ہر حال میں لگی رہتی ہے۔ مگر مَینے دو تین روز دن اور رات میں ایسی ایسی ڈراؤنی اور مایوس کرنے والی باتیں سوچیں کہ اب جو یاد کرتا ہوں تو بھی پریشانی ہوتی ہے۔ مجھے بائی صاحب کی صورت بری لگ رہی تھی۔ جی چاہتا تھا فلیٹ چھوڑ کے چل دوں۔

مَلباری اور مَیں روز ڈیڑھ دو دو گھنٹے باتیں کرتے، سوچتے رہتے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔ گھوم پھر کے ایک بھورے جابر پہ نظر پڑتی تھی۔

مگر وہ کیوں بتائے گا کہ لڑکی کو کہاں لے گئے ہیں۔ وہ اپنے استاد رشید سے بھی زیادہ کمینہ تھا۔

مَلباری نے مشورہ دیا، بھورے جابر کو پیسے دو، شاید بتا دے۔ بیکار بات تھی: اس کے پاس پہلے ہی بہت پیسے آتے تھے۔ اور مَیں کیا پیسے دیتا؟ بائی صاحب نے اسکا، اسکے استاد کا پوتا تر کر کے رکھا تھا۔

تیسرے دن مَلباری دوپہر میں مجھے ڈھونڈھتا ہوا آیا، کہنے لگا، ''تم آج رات گیارہ اور بارہ کے بیچ بلڈنگ کے زینے پہ ہی رہنا۔''

مَیں نے بہت پوچھا کہ آخر کیا بات ہے؟ تو بولا، ''بس ہوشیار رہنا؛ اگر کوئی چھوٹا ہتھیار، چاقو، چھری جیسا نیفے میں لگانے لائق تیرے پاس ہو، تو وہ بھی لگا کے رکھنا۔''

وہ تو یہ کہکے چلا گیا؛ مَیں سارے دن الجھن میں رہا۔ ہتھیار، چھری، چاقو میرے پاس کہاں سے آتا؟ کیا کرنا ہے ہتھیار کا؟ شام کو مَینے ہوٹل جا کے مَلباری کو بتا دیا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے؛ وہ بولا، ''خیر، کچھ کرلوں گا۔'' رات گیارہ اور بارہ بجے کے بیچ مَلباری دو مرتبہ آیا؛ مگر وہ بلڈنگ والوں کا آرڈر لے کے آیا تھا۔ دونوں مرتبہ مجھے اشارہ دے گیا کہ ٹھیک ہے، انتظار کرو، ابھی ٹائم صحیح نہیں ہے۔ اس رات مَلباری نے پھر کوئی چکر نہیں لگایا۔ مَیں سو گیا۔

وہ صبح مجھے ناشتے کے وقت مل گیا۔ کہنے لگا، ''کل ٹائم نہیں تھا؛ آج ہوشیار رہنا، جیسے ہی اشارہ دوں میرے پیچھے چلے آنا۔''

ایک بار تو مجھے خیال ہوا کہ مَلباری بہت فلمیں دیکھتا ہے؛ خواہ مخواہ کی کوئی سنسنی، سسپنس بنا رہا ہوگا۔ پھر مَینے دل کو تسلی دی۔ رات ساڑھے گیارہ کے بعد جب لینڈنگ پہ اپنا گدا کھینچ کے لا رہا تھا، مَلباری نے نیچے سے ٹارچ جلا کے مجھے اشارہ دیا کہ آجاؤ۔ مَیں نے کریپ سول والے جوتے اور گہرے رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے؛ خاموشی کے ساتھ بلڈنگ سے نکل آیا۔ مَلباری اور مَیں ٹائر ٹیوب جوڑنے والے کے ویران ٹھیے کے پاس سے اندر گلیوں میں مڑ گئے۔ اس طرف پولیس والے نہیں آتے تھے۔ ویسے ابھی بازار کا ٹائم باقی تھا۔

سستی بیسواؤں کے غریب چاہنے والے آجا رہے تھے۔ ایک اجاڑ سی گلی کے منہہ پر گنے کے رس کی پکار گاڑی کھڑی رہتی تھی۔ گاڑی والی گلی میں مڑو تو آگے ایک کھنڈر ملتا تھا؛ خبر نہیں انگریزوں کے زمانے کا ہو گا یا اور بھی پہلے کا۔

ملباری نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کے خبردار کیا اور مجھے لیے ہوئے وہ کھنڈر میں داخل ہو گیا۔ چیتے کی طرح بے آواز چلتا، ملباری، کھنڈر کے بے چھت کمروں میں بھٹکتا بھٹکاتا، ایک چوڑے سے زینے کے نیچے جا پہنچا تھا۔

زینے کے نیچے کچھ تھا؛ ہمیں آواز بھی سنائی دی۔ ملباری نے کان کے پاس منہہ لے جا کر کہا، "آواز ہلکی رکھنا، چلنے میں شور نہیں کرنا۔" اور یہ کہہ کے وہ بڑھا اور اس نے زینے کی طرف، جہاں مجھے کچھ نظر آیا تھا، ٹارچ کا منہہ کر کے ایک دم روشنی کر دی۔

اس بازار میں رہنے والوں کیلیے یہ باتیں کوئی نئی تو ہوتی نہیں؛ لیکن ملباری کی ٹارچ کی روشنی میں جو نظر آیا، وہ میرے لیے بالکل نیا تھا؛ کیوں کہ اس میں شریک ایک آدمی بھورے جابر تھا...

اور دوسرا اسی پاڑے کا صفائی والا۔

بات انوکھی اسلیے تھی کہ لوگ اس چکر میں تو یہاں نہیں آتے؛ وہ تو ادھر اپنے حساب مردانگی دکھانے آتے ہیں۔ یہ جو کچھ ہو رہا تھا، بالکل غلط جگہ ہو رہا تھا۔

زبردست بھورے جابر، جو دن اور رات کے بڑے حصے میں، ان گلیوں میں، زبردست بنا پھرتا تھا اور خود کو رشیدے بدمعاش کا پٹھا کہلواتا تھا؛ اس وقت تالی پھٹکارنے والے کھسروں کی طرح زیردست تھا۔ اس کے گالوں پے سرخی اور ہونٹوں پے چوکلیٹی لپ اسٹک لگی تھی۔

اس کی طرف ایک بار ہی دیکھ کے میرا جی متلانے لگا۔

ملباری نے اپنی انٹی سے کچھ نکال کر بھورے جابر اور اس کے چاہنے والے کی طرف سیدھا کیا اور کہا، "گولی مار دوں گا، اگر ذرا بھی ہلا تو۔" مگر بھورے جابر نے اور اس کے 'دوست' نے خوشامد کرتے، گھگھیاتے ہوئے، بہرحال اپنے کپڑے درست کیے۔ بھورے جابر نشے میں ہو گا؛ مگر اب اس کا نشہ ٹوٹ چکا تھا۔ اس نے آستین سے جتنا صاف کر سکتا تھا، اپنا چہرہ صاف کیا؛ جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور ملباری کی طرف بڑھا دی۔

ملباری نے زیادہ بات نہیں کی؛ بھورے جابر سے بولا "یہ پیسے ہٹا۔ جاوے سے بات کر۔"

پھر وہ اپنے پستول کے زور پہ پاڑے کے صفائی والے کو وہاں سے ہٹا کر دور لے گیا۔

بھورے جابر خوشامد سے بولا "جاوے بھائی! ابھی یہ لے لے، اور دوں گا... یہ نو سو روپے ہیں۔"

میں نے بھی ملباری کی طرح سیدھی صاف بات کی، "پیسے نہیں چاہئیں؛ تانی کی بھانجی کو کہاں رکھا ہے ان لوگ نے۔ مجھے لے جا کے وہ جگہ دکھا دے۔ بس!"

"تت تانی؟" بھورے جابر کی کھوپڑی میں ایک دم سے کوئی بات نہیں آئی تھی۔

مَیں نے بات دہرائی۔ وہ گڑگڑانے لگا بولا،"رشیدا استاد قتل کردے گا مجھے۔"
"کوئی قتل نہیں کرتا۔ اُسے پتا بھی نہیں چلے گا۔"
بھورے جابر کہنے لگا،"جاوے! او وہ بہت کمینہ ہے، بڑی پاور رکھتا ہے: اسے پتا چل جائے گا۔"
مَیں بولا،"اب کہہ جو دیا؛ کچھ نہیں ہوگا۔ تانی کی بھانجی کو بھی کچھ نہیں ہوگا۔ بس ایک بار اسے دیکھ کے آجاؤں گا۔ اور جو تو نہیں مانتا تو تیری مرضی۔ پھر تیرے اُس رامی استاد کو اور پوری سڑک کو، گلیوں والوں تک کو؛ یہ سب پتا چل جائے گا۔ سمجھا؟ پھر تیرا اور تیرے چاہنے والے کا جلوس نکالیں گے، بیٹا!"
بھورے جابر نے بے بسی میں گالی نکالی اور پھر خوشامد کرنے لگا۔
ہم جیت چکے تھے۔ آخر یہ طے ہوا کہ سویرے آٹھ بجے سے پہلے بھورے جابر، ملباری کے ہوٹل پہ ٹیکسی لے کر آئے گا اور ملباری کو اور مجھے لے جا کے وہ جگہ دکھائے گا۔
ملباری نے اسے پکا کرنے کو اپنی مری ہوئی ماں کی قسم کھائی کہ اگر بھورے جابر نے تانی کی بھانجی کا پتا ٹھکانا ہمیں دکھا دیا تو ہم کبھی کسی کو یہ والی بات نہیں بتائیں گے۔
میری کوئی ماں نہیں تھی تو مَیں نے خدا کی قسم کھائی کہ وعدہ پورا کروں گا؛ یہ سمجھ لے، تیرے جیتے جی کسی کو نہیں بتاؤں گا۔
اس کے بعد ملباری نے بھورے جابر کو پستول دکھا کے کہا کہ بیٹا! ہم فائٹر لوگ نہیں ہیں، لیکن دغالی (وہ غداری یا دغا کو یہی کچھ کہتا تھا) کرنے والے کو پار لگا دیتے ہیں۔ یہ سمجھ لے۔"
پھر ہم اُن دونوں حرام خوروں کو اسی کھنڈر میں چھوڑ کر آگئے۔
آتے ہوئے بڑی سڑک کی روشنی میں ملباری نے مجھے اپنا پستول دکھایا۔ ہنس کے بتانے لگا،"یہ میٹرو تھیٹر والوں کا ہے۔ دو دن کے لیے مانگ لیا تھا سالوں سے... ہی ہی۔"
مارے خوشی کے مجھے بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ مَیں سوچتا رہا؛ ملباری اچھا دوست بھی ہے اور اچھا جاسوس بھی ہے۔ کیسا کام کیا ہے اس نے۔ واہ واہ!
صبح آٹھ بجے سے پہلے بھورے جابر نے ٹیکسی بھیج دی۔ مزے کی بات یہ کہ ٹیکسی وہی صفائی والا لے کے آیا۔ ہم ہوٹل سے نکل کے ٹیکسی کی طرف آئے تو بھورے جابر کا یہ منظورِ نظر، گاڑی چھوڑ کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ بولا، "بھورے جابر ادھر کورٹ والی سڑک پہ ملے گا۔"
بھورے جابر، شرمندہ شرمندہ سا، کورٹ روڈ پر ایک درخت کے نیچے کھڑا مل گیا۔ ڈرائیور کے برابر بیٹھ کے وہ اسے راستہ بتانے لگا۔ ہم دونوں خاموش تھے۔
شہر میں کچھ دیر گاڑی گھمانے کے بعد بھورے جابر نے سرکٹ روڈ پر ہمیں اشارہ کیا کہ اب اترنے والے ہیں، خاموش رہنا۔ ہم اتر گئے۔ بھورے جابر نے ٹیکسی والے کو پیسے دیے؛ پھر جیسے ہی وہ مڑا، بھورے نے ہاتھ دے کے دوسری ٹیکسی روک لی۔ پھر اس نے ہمیں اشارہ کیا کہ سب ٹھیک ہے، آؤ بیٹھو۔ یہ ٹیکسی بھورے نے نئی بستیوں کی طرف مڑوالی۔

آجکل جہاں نارتھ ٹاؤن شپ کی گنجان آبادیاں ہیں؛ اس زمانے میں وہاں میدان تھا، دھول اڑا کرتی تھی۔ وہاں خانہ بدوشوں کا ایک بہت بڑا بھاری ٹھکانا "بنجارا اسٹاپ" کہلاتا تھا۔ کوئی گھنٹے گھنٹے بعد اُدھر بس آتی تھی اور دس پندرہ منٹ کھڑی رہتی تھی۔ یہاں خیمے اور جھونپڑیاں تھیں؛ اور بنجاروں کی عورتیں، لڑکیاں لہنگے پھڑکاتی پھرتی تھیں۔

بھورے جابر نے بس کے اڈے پر ٹیکسی چھوڑ دی۔ کہنے لگا، ایسا کرو ہم لوگ ابھی آگے چلیں گے؛ تم کوئی رومال چادر مفلر سے منہہ ڈھک کے چلنا۔ یہ چرس گانجے نشے مشے کا علاقہ ہے۔

ویسے تو کوئی پروا نہیں کرے گا۔ جدھر جدھر بھتّا پہنچنے کا ہوتا ہے، پہنچتا رہتا ہے۔ بس خیال رکھنا، ادھر کے موالی ہم لوگ کو نہیں پہچانیں؛ باقی سب خیر ہے۔"

مَیں اپنا ریشمی مفلر ساتھ لایا تھا۔ ملباری کے پاس حاجیوں والا پیلا رومال رہتا تھا۔ خود بھورے جابر کی گردن میں شال کا ٹکڑا پڑا تھا۔ ہم تینوں ہی چرسیوں، موالیوں کی طرح منہہ ڈھکے آہستہ آہستہ رُلتے ہوئے خیموں جھونپڑیوں کی اس سپر بستی میں داخل ہو گئے۔

یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہاں سوا بنجاروں کے اپنے طریقوں ضابطوں کے، کوئی قانون ہی نہیں ہے۔ ہماری طرح کے اَور بھی مفلر پوش، یا چادروں سے اپنی ٹھوڑیاں پیشانیاں چھپائے، یا کالے چشمے پہنے اور بھانت بھانت کی ٹوپیاں رومال اوڑھے؛ خیموں، جھونپڑیوں کے درمیان چل پھر رہے تھے۔ کوئی اندر چارپائیوں، دریوں پر بیٹھے تھے۔ ادھر بیٹری والے ریڈیو یا چابیوں والے گراموفون بج رہے تھے۔ گودنے گدی ہوئی، سونا چڑھے دانتوں والی، لہنگا پوش عورتیں، بے خوفی سے مردوں کے بیچ ٹھٹھے لگا رہی تھیں؛ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی سگریٹیں پی رہی تھیں۔ بہت حد تک ہمارے پڑوس کی گلیوں جیسی فضا تھی؛ مگر وہاں سے کچھ زیادہ آزاد اور ڈراؤنی۔

بھورے جابر سر جھکائے، منہ چھپائے چلتے چلتے ایک دُہرے خیمے کے پیچھے جا کھڑا ہوا؛ آہستہ سے مجھ سے کہنے لگا، "یہ راول کا ڈیرا ہے۔ وہ لڑکی یہیں ہے۔ راول کھلے عام چرس بیچتا ہے۔ اس سے چرس خریدو۔ منہ مانگے دام مت دینا۔ جھک جھک نہیں کرو گے تو وہ شک میں پڑ جائے گا۔ لڑکی یہیں کہیں عورتوں میں گھری بیٹھی ہوگی؛ مَیں جا رہا ہوں۔" یہ کہکے بھورے اسی طرح سر جھکائے مڑا اور ایک طرف چلا گیا۔

ہم جیسے ہی خیمے کے سامنے پہنچے، ایک ادھیڑ عمر کی خانہ بدوش عورت، فحش طریقے سے ہاتھ ہلاتی سامنے آگئی... بلکہ ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ کہنے لگی، "اے چھوکرا! ادھر اپنی ماں کو دیکھنے آیا ہے؟ آں؟"

ملباری نے کہا، "ماں تو مل گئی؛ یہ سامنے کھڑی ہے۔ ماں نہیں چیے۔ دَم لگانے کو چیے۔"

عورت نے ہنس کے گالی دی۔ اسکا سونے کا دانت چمک مارتا تھا، بولی، "راول کا مال ہے، مہنگا ملے گا۔"

ملباری بولا، "ہم مہنگا خریدنے والا نہیں ہے۔ وہ پاگل لوگ ابھی ادھر شہر سے ہی نہیں نکلا ہے جو مہنگا خریدتا ہے۔ سمجھی؟ تم صحیح پیسا بولو، بھلے راول ہووے، چاول ہووے، خریدے گا، رستہ ناپے گا۔"

تیل چپڑے ہوئے لمبے لمبے بالوں والا ایک جوان آدمی کروشے کی بنیان اور ملیشیا شلوار میں اپنی سفید

پلاسٹک چپل گھسیٹتا، ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا، بولا،"بالشٹر ہے تملوگ؟ بک بک نہیں کرو، سمجھا؟ مال لینا ہے، مال لو۔ نئیں چلتے نجر آؤ۔"

ملباری اس عورت سے کہنے لگا،"تم اسی کا بولتی ہو؟ یہ راول ہے؟! مجھے تو چاول لگتا ہے، سالا جوشی چاول! بڑا جلدی جوش مارتا ہے۔ لے بھلا، بولتا ہے، چلتے نجر آؤ۔"

عورت نے ہنس کے کچھ کہا، پھر راول کچھ بولا، ملباری نے جواب دیا، مگر میں ان کی باتیں نہیں سنتا تھا۔ نہ ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

سامنے خیمے میں، اونچے پلنگ پر تین خانہ بدوش عورتوں کے بیچ میں، چادر اوڑھے دائی بیٹھی تھی۔

عجیب بات یہ کہ ان تین عورتوں کی طرح دائی بھی ہماری طرف دیکھتی تھی۔

میری اسکی آنکھیں ملی تھیں۔ اس کے چہرے پر الجھن تھی۔ وہ شاید پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو گی۔

میں نے ادھر دیکھتے ہوئے 'ہاں' میں سر ہلایا اور ملباری سے پکار کے کہا،"ہاں جاوے۔!.. او یار جاوے! بس ختم بھی کر بک بک۔"

دائی نے میری آواز، میرا نام سنا۔ اس کے چہرے سے الجھن دور ہو گئی۔ میرا خیال ہے اس نے بھی 'ہاں' میں سر ہلایا تھا؛ یا شاید میرا وہم ہو گا۔ میں نے اسے دیکھا تھا اور میرے بعد ملباری نے بھی اسے دیکھ لیا۔ وہ خانہ بدوشوں کے سے کپڑے پہنے تھی۔ بہت نڈھال نظر آ رہی تھی؛ مگر بیمار اور اتنی ڈری ہوئی نہیں تھی۔

ملباری نے اس وقت تک مال کا بھاؤ کافی کم کرا لیا ہو گا۔ ہم دونوں بہت تھوڑی سی چرس لے کے خیمے سے ہٹے تو راول نے زمین پر تھوک دیا، بولا،"بڑا بھاری سودا کیا ہے! بھینی یا۔۔"

ملباری نے چہک کر کہا،"مال اچھا نہیں ہوا تو بیٹا، واپس کر جاؤں گا۔ ہاں۔"

راول شلوار کا گھیر ٹھیک کرتا ہوا اٹھا ہو گا، کہ ادھیڑ عمر عورت نے ہنستے ہوئے اسے روک دیا۔ ہم بس میں آ بیٹھے۔

دس گیارہ بجے تک ہم واپس اپنے علاقے میں آ گئے تھے۔ اتنا بڑا کام ہو گیا تھا.. مگر آگے کیا؟

لوٹتے ہوئے ہم بس میں دھیرے دھیرے 'مسکوٹ' کرتے آئے تھے۔ میں ملباری کو پتا تا آیا تھا کہ تیرے ہوٹل کا سیٹھ تیرا رشتے دار بھی ہے: وہ اگر ہم دونوں کے ساتھ پولیس کے کسی بڑے افسر سے جا کے ملے تو راول کے ڈیرے پر چھاپا پڑ سکتا ہے۔

"کیا خیال ہے؟ پولیس لڑکی کو وہاں سے برآمد کرے گی پھر اس کے گھر والوں کا پتا لگا کر گھر بھیج دے گی۔ کیا خیال ہے؟"

ملباری کہتا تھا؛ بے کار بات ہے۔ پہلی مسٹیک اس میں یہ ہے کہ میرے ہوٹل کا سیٹھ میرا سگے والا ہے، مگر اسے ادھر ہوٹل بھی چلانے کا ہے۔ وہ اگر ایسے دو چار نیکی کے کام کرے گا تو اسے واپس مالا بار جانا پڑے گا۔ بہت سا پاگل ابھی اُدھر ہی ہے... مالا بار میں۔ اس لیے میرا سیٹھ اُدھر نہیں جانا چاہتا۔ سمجھے؟ دوسری مسٹیک یہ ہے کہ کسی نے اگر بڑے افسر کے پاس جا کے شکایت ماری تو وہ چھوٹے افسر کو آرڈر کرے گا۔

چھوٹا اس سے چھوٹے کو بولے گا اور وہ چھاپے سے بیس منٹ پہلے اُدھر جا کے راؤل کو بول دے گا۔ لے بھئی! پھر ادھر نہ کوئی لڑکی ملے گی نہ آدھا تولا چرس۔ سمجھے؟

باقی کا میرا سارا دن سوچتے ہوئے گزرا۔ مغرب کے بعد ملباری آیا تو کہنے لگا، ''یہ بتا کوئی ڈینجر لوگ، پارٹی باز دادے، بستہ بے کے بدمعاش سے کہیں، جان پہچان ہے تیری؟ ایسا ہی لوگ مدد کر سکتے ہیں۔'' پھر خود ہی اپنی بات پر ہنس کے کہنے لگا، ''یار! میں بھی بے فضول کی بات کرتا ہوں۔''

مگر یہ بات 'بے فضول' کی بالکل نہیں تھی۔

مَیں اسے ایک طرف لے گیا۔ مَیں نے پوچھا، ''تو الٰہ بخش کالا شیر کو جانتا ہے؟''

ملباری ہنسنے لگا، ''او بھائی! اسے کون نہیں جانتا؟''

مَیں نے کہا، ''کالا شیر میرا دوست ہے۔''

ملباری نے اب کے پیٹ پکڑ لیا اور ہنسنے لگا؛ بڑی مشکل سے بولا، ''تو پاگل تو پہلے بھی تھا؛ اب آشق بھی ہو گیا ہے، سالے! نئی نئی لے کے آتا ہے۔ بولتا ہے کالا شیر دوست ہے! ہی ہی ہی!''

بہت مشکل سے، جب مَیں نے خدا کی قسم کھا کے اسے تھوڑا کچھ بتایا کہ الٰہ بخش کالا شیر کس طرح میرا دوست بنا تھا؛ اور لسی والے سیٹھ کی پچاس روپے والی بات اُسے سنائی، تب اُسے یقین آیا۔ رعب بھی بہت پڑا اس پے۔

ہاتھ پہ ہاتھ مار کے وہ کہنے لگا، ''کام بن گیا بیٹا! کالا بھائی سے زیادہ ڈینجر آدمی تو کوئی بھی نہیں ہے۔ چل ابھی چلتے ہیں۔''

''مگر کہاں؟ مجھے تو الٰہ بخش بھائی کا ٹھکانا نہیں معلوم؟''

ملباری نے کہا، ''یہ تو کوئی بات ہی نہیں۔ تو بیٹھ! مَیں کوئی پوچھ گچھ کر کے پتا کرتا ہوں۔''

رات پونے نو تک مَیں نے فلیٹ کے سب کام نمٹا دیے۔ بائی صاحب سے کہا کہ مَیں بھورے جابر کے ساتھ فلم دیکھنے جا رہا ہوں۔ مجھے معلوم تھا، وہ آخری شو سے پہلے پاڑے میں واپس نہیں آئے گا۔ یہ سب انتظام کر کے مَیں نے ملباری کا انتظار شروع کر دیا۔

ملباری پھول دار بش شرٹ پتلون میں بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ آیا، بولا ''چل''!

سائیکل رکشے میں ہم لائٹ ہاؤس پہنچے تو سینما والوں نے خبروں کی ریل اور ٹریلر دکھانا شروع کر دیے تھے۔ فلم دیکھنے والے خوش نصیب اندر جا چکے تھے؛ باقی کچھ لوگ بلیک کے آسرے میں منڈلا رہے تھے۔ گیٹ پر دو شیدی بھائی کھڑے تھے۔ ملباری نے ایک کو اشارے سے بلا کے کہا، ''اوپر جا کے بولو، الٰہ بخش صاحب کے مہمان آئے ہیں۔''

شیدی نے سر سے پیر تک دونوں کو دیکھا، وہ اس طرح کی ترکیبوں سے نمٹنا جانتا تھا۔ اس نے پہلے حقارت سے دیکھ کر ہمیں شکل گم کرنے کا مشورہ دیا پھر اور کچھ تیز بات کہی۔ آخر کار ملباری نے اسے قائل کر لیا کہ میرا دوست الٰہ بخش کے بھائی کا بیٹا ہے، تب کہیں وہ اوپر گیا۔ واپس آیا تو بالکل ہی بدلا ہوا آدمی تھا۔ پوچھنے لگا، ''تم

لوگ میں جاوے کون ہے؟" مجھے اس بات کی خوشی ہوئی۔ الٰہ بخش کالا ٹھیک کہتا تھا؛ وہ دوستوں کو بھولتا نہیں۔
ہم اوپر مالک کے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں پہنچے تو الٰہ بخش، سیٹھ کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر خوش ہوا بولا،
"واڑے دا۔ آؤ جاوے آؤ بچہ۔ یہ کون ہے؟ ہا، ابھی بولو کیا سینما دیکھنے کا ہے؟"
مَیں نے ملباری کا بتا دیا کہ دوست ہے اور بہت سوکھے سے منہہ سے کہا کہ بہت ضروری کام ہے، ہم لوگ فلم دیکھنے نہیں آئے؛ تو الٰہ بخش اٹھ کے کھڑا ہو گیا، بولا،" آؤ! میرا ساتھ" سیٹھ کہنے لگا،" آپ لوگ بیٹھو، مجھے ذرا فون کرنے کا ہے۔" وہ ہمیں تنہا چھوڑنا چاہتا تھا، ورنہ فون تو اس کمرے میں بھی تھے۔
مَیں نے کم سے کم لفظوں میں دائی کا قصہ شروع سے آخر تک سنا دیا۔
الٰہ بخش سب کچھ سن چکا تو ایسے ہنس پڑا جیسے مَیں نے کوئی لطیفہ سنایا ہو۔ کہنے لگا،"چریا ہے تم جاوے! یہ کس پھڈے میں پھنس گیا ہے جوان؟ ابھی تم ٹانگ برو بر کا بھی نہیں ہے۔ عاشقی ماشقی تو نہیں ہو گیا؟" مگر جب میں روہانسا ہونے لگا؛ تو خود بھی خاموش ہو گیا۔ اٹھ کے ٹہلنے لگا۔
تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ قریب آ کر ہم دونوں سے کچھ پوچھتا؛ ہمارا جواب سن کے ہوں اور ہاں یا ایسا ہی کچھ کہہ کے پھر ٹہلنے لگتا۔ ایک بار آیا، میرے برابر بیٹھ گیا، بولا،" ہم لوگ جبھی کوئی کیس کرتا اوں نہیں، تو سمجھو اپنا پرائیویٹ دھندا کرتا ہوں۔ جیسا، ایک کا دھندے میں دوسرا کوئی نہیں بولتا، ٹانگ نہیں اڑاتا؛ ویسا ایک کا واردات میں دوسرا ٹانگ نہیں اڑاتا سمجھا؟ تم لوگ نے دوسرے ہی نمونے میں ڈال دیا ہے۔ لیکن بچہ! ابھی سمجھو یہ تو کرنے کا ہی ہے۔ خیر ہے۔"
اس روز پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ الٰہ بخش کالا بھائی کیسے باضابطہ طریقے سے اپنا" کیس" کیا کرتا تھا۔ اس نے لڑکی کا حلیہ، راول کے ڈیرے کی پوری تفصیل، راول کا حلیہ، وہاں کتنی عورتیں تھیں؟ کس کس عمر کی تھیں: یہ سب پوچھا۔ کہنے لگا،" ہم لڑکی کے، حال فی الحال رہنے کا سیٹنگ کل شام تک کریں گا۔ میرا چچا کا بیٹا حافظ قرآن ہے اور مسجد میں ملاں ہے۔ تین بچوں کا باپ ہے وہ۔ لڑکی اس کے کوئی نہیں: وہ تیری دائی کو برابر رکھ لیں گا۔ مگر"... وہ بولا" پہلے اسے منانا پڑیں گا۔ مجھ سے بہت ناراض ہے؛ میری حرکتوں کی وجہ سے۔ کہتا ہے تم 'غلط کار' ہے۔ نہیں مکرانی ہے تم نہیں بلوچستانی ہے۔ 'غلط کار' ہے تم۔ خیر، اللہ مالک ہے۔ پرسوں..." الٰہ بخش نے کہا،" پرسوں سویرے تُو جا کے لڑکی کو دیکھ لینا، ہمارا بھائی ملاں رسول بخش شیدی کے گھر میں تُو اس کو مل لینا، سمجھا؟ خلاص! یہ میرا تیرے سے وعدہ ہے۔ رسول بخش کا گھر ہم تیرے کو سمجھا دوں گا۔"
ہم لوگ الٰہ بخش کالا کے پاس سے چلے تو بڑی بڑی سڑکوں پر ٹہلتے رہے۔ کہیں دوسرا شو ختم ہوتے وقت اپنے اپنے ٹھکانوں پہ پہنچے۔
اگلا دن ایک دم بے چینی کا دن تھا۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا۔ ایک بار جی چاہا راول کے ڈیرے کی خبر لیں۔ چوری سے جا کے دیکھیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ مگر الٰہ بخش کالا نے آخری بات یہی کہی تھی کہ بچہ ادھر اپنی شکل نہیں دکھانا۔ ابھی یہ کیس کالا شیر کا ہے۔
ہم اس کو اپنے نمونے سے ختم کروں گا۔

دوسرے دن شام کو کالا بھائی نے ملاں رسول بخش شیدی کے گھر جانے کو کہا تھا۔ ملباری کام میں پھنسا ہوا تھا۔ میں موٹر رکشا لے کے کالا بھائی کے بتائے ہوئے پتے پر وقت سے پہلے پہنچ گیا۔ آخر پانچ بجے کنڈی بجائی تو اُجلے کپڑے پہنے ایک مولوی صاحب باہر آئے۔ پوچھنے لگے، "کیابات ہے؟"

میں نے کہہ دیا، "بھائی الٰہ بخش نے مجھے ادھر آنے کو بولا تھا۔ آگیا ہوں۔"

مولوی صاحب نے مجھے گھور کے دیکھا، پھر پوچھنے لگے، "تمھارا نام کیا ہے؟"

میں نے نام بتایا تو بولے، "ادھر ہی ٹھہرو۔"

پانچ چھ منٹ بعد اندر لے گئے۔ کمرے میں صاف بستر پر اجلے سفید کپڑوں میں دائی بیٹھی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر سلام کیا۔

مولوی صاحب بھی وہیں ایک طرف کرسی پر بیٹھ گئے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دائی سے کیابات کروں؟ اس کا حال پوچھا، کہنے لگی، "اچھی ہوں۔"

آخر میں نے ہمت کر کے مولوی صاحب سے پوچھ لیا، "مولوی صاحب! کسی کسی چھٹی کے دن میں ادھر آجایا کروں؟"

وہ مجھے گھور کے دیکھنے لگے، بولے، "اچھا، چھٹی کا دن آجایا کرو۔ کل سے ہم اسکی پڑھائی شروع کرنے والا ہوں... اسے کچھ بھی نہیں آتا۔"

پھر مولوی صاحب نے اندر سے مجھے گلاس بھر چائے لاکے دی۔ چائے پیتے ہی میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا؛ میں نے دائی سے کہا، "سنو، ادھر دل لگا کے پڑھنا۔ مولوی صاحب ہمارے اپنے آدمی ہیں۔ ان کا کہنا ماننا۔ اللہ خیر کرے گا۔"

ملاں رسول بخش بھی اٹھ کھڑے ہوئے؛ وہ میری بات سن کر مسکرائے تھے۔

مجھ سے بولے، "ٹھیک ہے، ابھی تم جاؤ۔ چھٹی کا دن آنا"۔

میں وہاں سے لوٹ کر آرہا تھا تو دائی کے لیے، بہت خوش تھا۔

میں نے یاد کیا کہ جس کمرے میں مجھے دائی سے ملوایا گیا تھا، اُدھر کھونٹی پر حافظ صاحب کا حاجیوں والا پیلا رومال اور بلوچ گڈریوں کی چھوٹی کلھاڑی ٹنگی تھی۔

میں نے خود سے کہا، "جاوے! یہ لڑکی دائی ابھی غیرت مندوں کے سائے میں آگئی ہے؛ شکر ہے مالک کا!" ■■
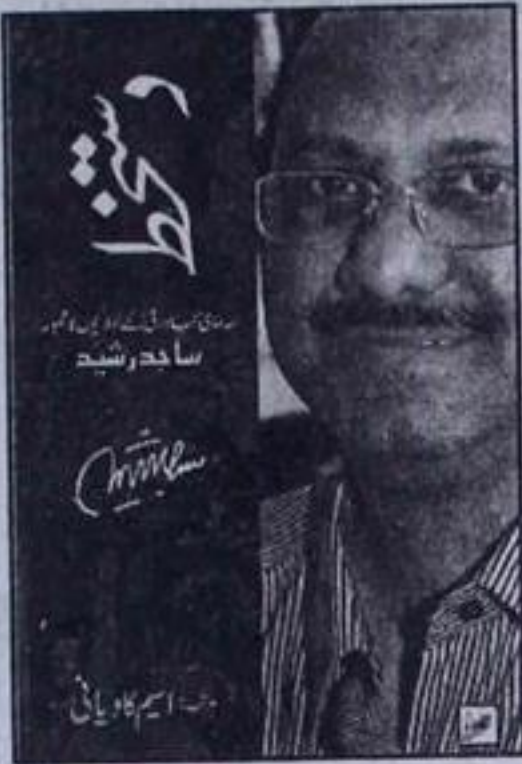
اسد محمد خاں

مَلنگنی کا قصّہ

جے پور شہر کے حویلی نام کے گیسٹ ہاؤس میں، جسے کوئی این جی او چلا رہی تھی: لینڈ اسکیپ مصور عون محمدؔ کی بیوہ، زینب نقوی ٹھہری ہوئی تھیں۔ یہ خود بھی نامور مصور تھیں۔

پچھلے دس برسوں میں زینب نقوی نے، پہلے تو اپنی بے مثل پورٹریٹ پینٹنگ کے سبب اور پھر اپنے شوہر کی المناک موت کی وجہ سے مصوری اور میڈیا میں نام کمایا تھا۔

بعض جینوئن لوگوں کو اپنے کمالِ فن کے طفیل صحیح وقت پر، یا کبھی بعد میں، میڈیا کے کسی خاص پہلو پر توجہ دینے کی وجہ سے، اچانک زبردست شہرت ملنی شروع ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایم ایف ایچ کو، ان کے کام کی وجہ سے دنیا نے سراہا، پھر میڈیا نے بھی شور مچا دیا کہ ارے، دیکھو دیکھو، یہ مصور تو دنیا کی اعلاترین جگہوں اور پانچ

دنیا کی اعلاترین جگہوں پر بھی ننگے پاؤں...

اسی طرح آپا زینب تقوی کی بے مثال پینٹنگز جب سامنے آئیں تو میڈیا نے یہ بتانا ضروری سمجھا کہ ان کے میاں عون محمد کو بے وجہ مار دیا گیا تھا اور یہ شاید ٹارگیٹیڈ کلنگ تھی؛ جو شاید اُن کے کسی خاص کومینٹ کی وجہ سے یا ان کے اپنے مسلک کی وجہ سے، کٹر پنتھی لوگوں کی طرف سے لازمی سمجھی گئی تھی۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔ بہ ہر حال، جو بھی ہو، اُس پر عام آدمی نے غیر معمولی توجہ دی اور ننگے پاؤں گھومنے والے ایم ایف ایچ کے بعد زینب آپا کو عون محمد کی بیوہ کہتے ہوئے ایک 'ذیلی شہرت' کا حق دار سمجھنا شروع کر دیا....

زبانِ خلق کا تو ایسا ہی معاملہ ہے۔ خیر، جیسا بھی ہو، اصل میں، زینب آپا بہت ہی زبردست پورٹریٹ پینٹر تھیں۔

انھوں نے اب جے پور ہی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا؛ کہتی تھیں: 'عجب پیارا شہر ہے، یہاں رہنے کو ایک جنم تو میاں! ناکافی ہوگا'۔ بہرحال، سبھی شہر... ان فیکٹ یہ دنیا ہی ایک جنم رہنے کو ناکافی ہے؛ بہ شرطے کہ کسی مقصدِ عین، کسی 'دِل' کے ساتھ عمر بسر کی جائے۔ عون محمد ایک 'دِل' ایک مقصدِ عین کے ساتھ یہاں اٹھارہ برس رہا تھا؛ جے پور میں۔ اس نے یہاں کوئی سوا دو سو لینڈ اسکیپ پینٹنگز بنائی تھیں؛ صرف اس شہر میں سوا دو سو! اس لیے اگر دس برس کی بیوگی کے بعد آپا نے جے پور میں مستقل رہنے کا منصوبہ بنا لیا تھا تو کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔

این جی او گیسٹ ہاؤس 'حویلی' والوں نے ایک کفایتی پیکیج کے تحت آپا کو ایک الگ تھلگ روشن کمرہ؛ مناسب سروس اور مرضی کے سادہ کھانے کے ساتھ فراہم کر دیا تھا اور گیسٹ ری لیشن افسر، بلی رام چوریہ نے ہنس کے کہا تھا کہ آپاں! تم ادھر بھلے ہی اٹھاراں برس ٹھیرو، کی تیس برس ٹھیرو، کوئی واندہ نئیں۔ یہ بلی رام آپ کی کھدمت کو حاجر رہیں گا۔ ہاہاہا!

تو بس، آپا نے تصویر سازی میں کام آنے والی چیزوں کا ایک خاصا بڑا آرڈر، جے پور کے خاصے بڑے آرٹ اسٹور 'چترا کاز' کو دے دیا؛ ساٹھ پینسٹھ ہزار کا سامان فون پر لکھوا کے آپا سکون سے انتظار کرنے بیٹھ گئیں۔

سیلز مین نے بہت اچھی طرح آرڈر لیا تھا، بہت تمیز سے پوچھا تھا کہ میڈم آپ پے مینٹ کس طرح کریں گی؟ کیش، کریڈٹ کارڈ سے، یا چیک سے؟ آپا نے بتا دیا، کیش دیں گے۔

سیلز مین نے پوچھا تھا کہ سامان آپ کو کیا اسی ایڈریس پر پہنچایا جائے؟ مطلب، 'حویلی' سے فون کر رہی ہو، تو سامان آپ کو اُدھر ہی بھیجا جائے؟

آپا زینب نے پریشان ہو کے سوال کیا، 'آپ کو کیسے معلوم کہ ہم کہاں سے فون کر رہے ہیں؟'

انھوں نے سوال اتنی سادگی سے کیا تھا کہ سیلز مین نے بہت ادب سے، ہلکی ہنسی کے ساتھ کہا تھا، 'میڈم! نمبر تو یہ لکھا ہوا آ گیا ہے، اور ہم لوگوں کو 'حویلی' کے سبھی نمبر زبانی یاد ہیں۔ یہ 'حویلی' کے چیف، بلی رام جی کے فیملی فرینڈ اگروال صاحب کا اسٹور ہے نا... مطلب، بلی رام جی کا اپنا ہی اسٹور ہے۔'

آپا بہت خوش ہوئیں۔ انھوں نے کہا، 'ٹھیک ہے ہم 'حویلی' میں ہی انتظار کر رہے ہیں، لے آؤ۔'

سیلز مین کا آخری سوال تھا کہ کس شُبھ نام سے کیش میمو بناؤں؟ آپا نے اسی روانی میں کہا،'مسز عون محمد!'
سیلز مین نے جیسے ایک خوش گوار شاک میں آہستہ سے کہا،'او وئی گاااا آڈ! آپ زینب نقوی میڈم بات کر رہی ہو!'
آپا زینب نے مزے سے کہا،'او مئی گاڈ، لڑکے! تم کتنی بہت سی باتیں جانتے ہو! ہاں میاں! میں زینب نقوی ہوں۔'
وہ خوشی بھری آواز میں بولا،'میں آرہا ہوں میڈم! تھینکس میڈم!' اور فون رکھ کے وہ بھاگا بھاگا اسٹور کے مالک اگروال کے پاس پہنچا اور اسے بہت پرجوش آواز میں بتانے لگا کہ وہ فوری طور پر 'حویلی' جارہا ہے۔ سامان پہنچانا ہے؛ اور یہ کہ سامان کوئی دوسرا نہیں وہ خود پہنچائے گا؛ اس لیے کہ وہاں زینب نقوی ٹھہری ہوئی ہیں... مطلب، لینڈ اسکیپ پینٹر، ہورگ باشی عون محمد والی زینب نقوی۔
یہ ایسی کوئی انوکھی بات نہیں ہوئی تھی کہ ایک مشہور لینڈ اسکیپ پینٹر کی مشہور مصور بیوی کے بارے میں آرٹ اسٹور کا سیلز مین اتنی معلومات رکھتا ہو اور سُنتے ہی سمجھ جائے کہ سامان کا آرڈر دینے والی لیڈی کون ہے۔
اس سیلز مین کے ساتھ تو ایک خاص بات یہ تھی کہ یہ خود بھی لینڈ اسکیپ پینٹر تھا اور اسے، اپنی ریسرچ ڈگری کے لیے راجستھان کے قدرتی مناظر پر ایک خاص تعداد میں اور خاص موضوعات کے تحت پینٹنگز تیار کر کے اپنے تحقیقی مواد کے ساتھ جے پور یونیورسٹی آف فائن آرٹ میں اپنے نگراں کو پیش کرنی تھیں۔ آرٹ اسٹور 'چترا کار' کے مالک نے رہائش کا بندوبست کرنے کے ساتھ اسے پارٹ ٹائم نوکری بھی دے دی تھی۔
یہ سیلز مین فون پر آپا زینب سے بات کر کے بہت خوش ہوا تھا اور اسٹور کی گاڑی میں آپا کا منگایا ہوا سامان تیزی سے لاد کر، 'حویلی' جا کر ان سے ملنا، باتیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کی بدنصیبی کہ اسٹور کے بیس مینٹ میں اُسے ناوقت 'دھیان' کرتی امریکن لڑکی اغما یعنی ارماسلا مانکا، نظر آگئی اور اس اغمار ارما نے اس کا آدھا گھنٹا برباد کر دیا۔
لیکن پہلے آپ کو ارماسلا مانکا کے بارے میں جانکاری دینی ضروری ہے:
زندگی میں آپ نے کتنے ہی مست ملنگ دیکھے ہوں گے؛ اپنے حال مست، سب سے بے نیاز، بس اپنی ہی کیفیت کے اسیر۔ کچھ ایسے 'ملامتی' قسم کے ملنگ بھی آپ کو ملے ہوں گے؛ جو کسی بھی آدمی، جانور، پودے، بادل کے ٹکڑے، برستی بارش یا کھلتی دھوپ؛ غرض کچھ بھی آتا جاتا یا ہوتا دیکھ کے، بے نیازی سے مُنہ پھیر لیتے یا مُنہ بھر بھر کے گالیاں دیتے ہوں گے۔
(یہاں دکھاوا کرتے، مال کھینچتے، نقلی بناوٹی ملنگوں کا ذکر نہیں ہو رہا؛ انھیں چھوڑیے، جھوٹے ملنگ کچھ نہیں ہوتے، چوروں سے بدتر سمجھیے انھیں۔ یہ اصل کی بات ہو رہی ہے)۔
تو ایسے اصل ملنگوں میں کی ایک بے نیاز ملنگنی: یہ بی بی اغما، یا ارماسلا مانکا بھی تھی۔
اغمار ارما کی زندگی کا احوال کچھ یوں تھا کہ وہ لڑکپن ہی میں بے حساب دولت رکھنے والے ماں باپ کے گھر کو لات مار کے: ایک تھیلے میں دو پرانی جینز، تین ٹی شرٹس اور اس سے بھی کم کچھ اور کپڑے لتے، ایک

گٹار اور ٹوتھ برش لے کے نکل پڑی تھی۔
اپنے جیسے نامطمئن لڑکے لڑکیوں کا ایک چھوٹا جتھا، ضروری منشیات کے ساتھ، اسے دیہات کے رستے میں ملا تو جتھے سے جڑ جانے اور طرح طرح کے ملامتیہ نوجوانوں کی سنگت میں وقت گزارنے کے بعد، پھر بعض چالاک 'گرولوگوں' کے آشرموں میں ہرے کرشنا، ہرے راما' گا بجا کر، کچھ اور نامطمئن ہو کر، یہ بی بی گھر لوٹ گئی۔
پھر چھ آٹھ دن گھر میں گزار کے اس نے اپنے سفری کاغذات سنبھالے اور خاندانی بینک سے ایسا کچھ انتظام کر کے، کہ کہیں بھی جائے اُسے اپنی ضرورت کے لیے رقمیں ملتی رہیں... اغمابی بی ہندوستان روانہ ہوگئی۔
وہاں کی بہت سی زیارتوں، مٹھوں، آشرموں اور بابا لوگ کے ٹھیوں ٹھکانوں، گپھاؤں میں تھوڑا تھوڑا وقت گزار کے؛ اور 'مال کھسوٹیوں' سے پیچھا چھڑا لینے کے بعد... بالآخر ایک سچے سادھو کے کہے پر، یہ ماؤنٹ آبو کی زیارت کو چل پڑی۔ یہاں اغمابی بی کا دل لگ گیا۔
ماؤنٹ آبو میں اس نے مہینے بھر سے زیادہ قیام کیا۔ وہاں اُسے دو نوجوان ہندوستانی لڑکے ملے جو آبو کے قدرتی مناظر کی مصوری کرتے پھر رہے تھے۔ ان دو میں کا ایک، یہ مصور سیلز مین تھا۔
اس وقت یہ آپا زینب کی ضرورت کا سامان اکٹھا کر کے جلد سے جلد اسٹور سے نکل جانا چاہتا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اغمابی بی، وقتی بے زاری دور کرنے کو وہیں مراقبے میں بیٹھی تھی۔ سیلز مین کو ضرور شک ہوا ہوگا کہ وہ یہاں ہو سکتی ہے؛ پر مشکل یہ تھی کہ 'حویلی' کے لیے جو کچھ اُسے اُٹھانا تھا، یہیں تہ خانے میں رکھا تھا، اس لیے مجبوراً اُسے یہاں آنا پڑا۔ بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ارمابی بی، گیان دھیان مراقبے میں اکثر اپنے لباس کی طرف سے لاپروا ہو جاتی تھی؛ اس لیے سیلز مین کو آتے ہوئے زور زور سے کھنکھارنا پڑتا تھا۔ اس وقت بھی یہ شور کرنا بہت اچھا رہا۔ کیوں کہ اغما، اس وقت بھی بے پروائی کی حالت میں تھی۔ تاہم اس نے آواز سن کے گیروا کفنی کا پلو کھینچ کے اپنا اوپری بدن ٹھیک سے ڈھک لیا۔
اصل میں اغمابی بی نے ہندوستان آ کر یہاں کی آدی واسی، یعنی قدیم باشندہ عورتوں کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے؛ تین کی جگہ بس دو کپڑوں میں گزارہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ، پیٹی کوٹ (یا گھاگھرے) اور ساڑھی... کُل دو کپڑوں میں خود کو ملفوف کرتی تھی۔ کسی بلاؤز وغیرہ کو غیر ضروری سمجھتی تھی۔
خیر، اس نے اپنی گیروے رنگ کی کفنی کا پلو کھینچ کے اپنا اوپری بدن ٹھیک سے ڈھک لیا اور پہنچی ہوئی ملنگنیوں کی طرح آواز لگائی کہ ہرے ہرے ہرے راما!
سیلز مین نے جھپٹ کے اُس ریک میں، جہاں مطلوبہ چیز رکھی تھی، خود کو آدھا داخل کر دیا، وہ چیز اُٹھائی اور نکل کے ترنت روانہ ہی ہوا تھا کہ بی بی اغما نے خود کو مراقبے سے واپس لا کر آنکھیں کھول دیں اور دیکھنا چاہا کہ آخر یہ کون ہے جو زور زور سے کھنکھارتا ہوا آیا ہے؟ پھر اس نے سیلز مین کو پہچان کر اپنے گاتے گنگناتے لہجے میں اسے پکارا: 'کیا تم ہو؟ اوی ناش! میرے بچے!'
سیلز مین اوی ناش نے مختصراً کہا، 'ہاں' اور نکلنے کا رستہ پکڑا۔ اغما اس سے کہیں زیادہ پھرتیلی تھی، اور کیوں کہ دھیان کر کے اُٹھی تھی اور بہ قول علامہ رحمتہ اللہ علیہ 'تازہ نفس' تھی؛ اُس نے سیلز مین کو جا پکڑا؛ ہاتھ بڑھا کے مدد

کرتے ہوئے ایک دو چیزیں اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیں اور بولی، 'چلو کہاں چلنا ہے!'

اویناش عجب مخمصے میں پڑگیا: اُسے اپنے ساتھ 'حویلی' لے جاتا ہے تو میڈم زینب نقوی سے کوئی کام کی بات نہیں ہو سکے گی۔ ممکن ہے، اس حلیے بشرے کی ملنگنی کو دیکھ کر خود آپا زینب بھی اس سے ترک آسائش دنیا اور امریکی جاز موسیقی پر اور بھگوان رجنیش کے آشرم پر مکالمہ شروع کر دیں اور جواباً اغما 'بلاڈی شٹ' سے شروع کر کے وہ سب سنانے بیٹھ جائے جو اویناش پہلے ہی کتنی بار سن چکا ہے۔

اس نے اغما کے ہاتھ سے سامان لینے کی ناکام کوشش کی اور منمنایا کہ نانا بی! رہنے دے، شکریہ۔ میں سب سنبھال لوں گا۔

وہ کہنے لگی، 'اوی ناش! تم ایسے فائن آرٹس میں ڈوبے طالب علم کی چھوٹی موٹی سہایتا کرنا میرا دھرم ہے۔ اور ویسے تو مجھے کسی بھی پُرش کی، یا استری کی مدد کرنے میں بڑی پرسنتا ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ...'

'او کے او کے! میری ماں، تقریر مت کرو۔ آؤ میرے ساتھ۔' اوی ناش نے اس کی بات کاٹ دی اور اس کے آگے آگے چلنا شروع کر دیا۔

اغما مزے سے ہنسی اور پیچھے آتے ہوئے اس سے پوچھتی چلی کہ تمہارا کیا خیال ہے؟ میں نے تمہاری زبان بہت جلد پک اپ کر لی ہے نا؛ کیا ہندوستان کے لوگ مجھے اندرا گاندھی کی اٹالین بہو کی طرح... کیا نام ہے اس کا؟ سونیا... کی طرح قبول کر لیں گے؟'

اوی ناش پوچھنا چاہتا تھا کہ قبول کرنے سے تمہاری کیا مُراد ہے؟ کیا اس شہر کے لوگوں نے تمہیں برداشت نہیں کر لیا؟ جو مرضی ہے کرتی ہو۔ جیسا من کرتا ہے پہنتی... یا نہیں پہنتی ہو۔ جہاں جی چاہتا ہے گھستی چلی جاتی ہو۔ کبھی منع کیا کسی نے تمہیں؟

مگر وہ بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا؛ اسے ویسے ہی دیر ہوگئی تھی۔

اس نے 'حویلی' لے جانیوالا سامان احتیاط سے اپنی ہائی روف کی پچھلی سیٹوں پر رکھا اور اغما سے، جو گاڑی کے انجن کے آگے ہاتھ باندھے، سر جھکائے، احتراماً کھڑی تھی... شاید اُسے بلیس کر رہی تھی؛ اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ اغما دعا پڑھنی چھوڑ کر سر سے پلو سرکاتی ہوئی، ساڑھی کو پھر ایک بار اوپری بدن سے اچھی طرح لپیٹ کر اگلی سیٹ پر جا بیٹھی۔ پلو سرکایا تو اس کا تازہ منڈا ہوا سر، جسے وہ ہر صبح الیکٹرک ریزر سے چمکا لیتی تھی، شام کی دھیمی روشنی میں اچھے اسٹیل کی طرح لشکنے لگا۔ اس کے کانوں میں پڑے راجستھانی گنڈل آسائش میں جھوم رہے تھے۔

اس نے آنکھیں بند کیے کیے اویناش سے پوچھا کہ کیا خیال ہے تمہارا؟ اگر راجستھان میں اُستوائی علاقوں کی بارشیں شروع ہو جائیں تو کیا یہ سارا ریگزار؛ کشمیر کے خطّے جیسا ہرا بھرا نہیں ہو جائے گا؟... ایں اویناش؟ بڑے بھائی!

اوی ناش نے کہا کہ ہاں ہرا ہو جائے گا اور ہر طرف جونکیں ہی جونکیں ہو جائیں گی۔

وہ دھیرے سے بولی 'ستیہ ہے نام پربھو، پرمیشور کا!... ہاں، جونکیں تو بے شک ہو جائیں گی۔'

اُوی نے دل میں کہا 'ہاں نا، جونکیں ہو جائیں گی؛ پھر مَیں روز رات میں چھ آٹھ جونکیں تمھارے تکیے کے نیچے چھوڑ آیا کروں گا؛ تاکہ تمھاری کھوپڑی میں جو ضرورت سے زیادہ عقل کی باتیں لہریں لیتی رہتی ہیں، وہ جونکیں انھیں چوس لیں۔ تھوڑی سی تو ریلیف ملے!'

باقی رستہ خاموشی سے کٹا؛ کیوں کہ اِغما نے اپنی کلائی میں پہنے ہوئے الیکٹرونک کیلکولیٹر سے، جو ایک راجستھانی حاجی صاحب، کنور انور علی خاں اجمیری نے پیش کیا تھا، اپنا جاپ شروع کر دیا تھا۔

آپا زینب 'حویلی' کے شیشوں ڈھکے دالان میں آرٹ کے سامان کا انتظار کر رہی تھیں۔ 'حویلی' کے ایک اٹنڈینٹ اور ملنگنی کے ساتھ، سامان اُٹھائے اوِیناش دالان میں پہنچا تو آپا زینب اور وہاں موجود بچوں کا انتظار حیرت میں بدل گیا؛ جو آپا کو پینٹ کرتے دیکھنے آیا کرتے ہوں گے؛ اور جو معمول کے مطابق خاموش بیٹھے تھے۔ وہ اب مُنہہ کھولے اِغما کو دیکھنے لگے۔

گیروے رنگ کی ساڑھی پہنے؛ ننگے پیر، ننگے سر۔ کانوں میں لوہے یا اسٹیل کے کُنڈل ڈالے، گھوٹم گھوٹ سر کے ساتھ کھڑی مسکراتی، اور کبھی ہاتھ باندھ کے تعظیم دیتی یا ہاتھ اُٹھا کے بابرکت کرتی، آشیرواد دیتی، اِس بائیس تیئیس برس کی سادھو ماں کو دیکھ کر؛ آپا سمیت سبھی نے ایک عجیب طرح کی دریافت کی خوشی اور جھٹکا محسوس کیا تھا۔

اوِیناش نے تعارف کرایا کہ یہ اِرما ہیں... میری مُنہہ بولی ماں، جو لُطف روحانی کے حصول کے لیے ماؤنٹ آبو تک آئی تھیں؛ اب ہمارے پروپرائٹر اگروال صاحب کی مہمان ہیں۔

آپا زینب نے تو ماشاء اللہ کہا؛ بچوں میں کا ایک کھلکھلا کے ہنسا، بہت اونچی آواز میں بولا 'ارے واہ! یہ اتنی چھوٹی اور اتنی عجیب سی ماں!'

خود اِغما، بچے کے اس ریمارک پہ ہنسنے لگی۔

اوِی ناش نے پہلی بار اِغما کو اس طرح کھلکھلا کے ہنستے سنا اور دیکھا تھا۔ آپا کچھ لینے دوسرے کمرے میں چلی گئی تھیں تو اس نے ایکبار بے اعتباری میں سر جھٹکا اور آہستہ سے جھک کر اِغما سے کہا 'خدا جانتا ہے؛ مَیں نے ایسی زندہ اور متحرک کرنے والی ہنسی آج سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ بی بی اِرما! چاہے جو کہتی اور کرتی رہو، تم زندگی سے جڑی ہوئی ہو... واہ واہ! ستیہ ہے نام پرمیشور کا!... جیسا کہ ابھی تم رستے میں کہہ رہی تھیں۔'

اِغما نے سنجیدگی سے اُسے دیکھا اور کہا 'یہ خوشی سے بھری ہنسی؛ اس بچے کی کہی ہوئی بات میں چمک مارتے خداوند کے کارن تھی؛ کہ جو کبھی کبھی میرے لیے ظہور کرتا ہے؛ اور جسے اوی ناش! تم ابھی تک نہیں مانتے تھے... صرف ابھی ابھی تم نے اُسے یاد کیا ہے اور 'ستیہ' کہہ کے بلایا ہے۔ خوش رہو تم بھی اور خوش رہے یہ بچہ بھی۔ یہ کہا اور اس نے جھک کر بچے کے پیر چھو لیے... اور رونے لگی۔ بچہ چمک کے پیچھے ہٹ گیا۔

آپا زینب آئیں تو اوِیناش نے جلدی جلدی سامان حوالے کیا؛ سبھی کچھ آپا کی مرضی کا تھا اس لیے سامان انھوں نے کمرے پر پہنچوا دیا؛ رقم اوِیناش سیلز مین کے حوالے کی۔

اسکے ساتھ ہی آپا اور دونوں بچے، سامان اور سیلز مین کو بھول گئے۔ بس اس کی طرف پیالی بڑھاتے ہوئے آپا زینب نے ایک جملہ یہ کہا کہ چائے میں میٹھا کم ہو تو اور ڈال لینا۔ میٹھا زیادہ تھا لیکن اوی نے منہ سے ایک لفظ نہ نکالا، ہاتھ اُٹھا کے آپا کو آداب کیا اور ذرا بے کیفی سے آپا زینب اور بچوں کو اغما کی تواضع کرتے دیکھنے لگا۔

وہ چاروں خوب مزے میں باتیں کر رہے تھے۔ بچے، اغما کو چائے کے ساتھ لائی گئی بہت سی چیزیں باری باری کھلاتے رہے اور اس کے ساتھ کھیلتے رہے۔ انھوں نے اویناش کی پلیٹ میں بھی کچھ چیزیں رکھی تھیں؛ جو نہ معلوم میٹھی تھیں یا نمکین۔ اوی نے خاموشی سے دونوں چیزیں باری باری اُٹھا کے کھالیں۔

پھر بچے اور اغما باہر حویلی کے لان پر کھیلنے یا اغما کا ہندوستانی ناچ دیکھنے چلے گئے۔

آپا زینب اتنی دیر میں اپنے کمرے سے جا کر اپنی ایک منی ایچر پینٹنگ لے آئی تھیں۔ یہ انھوں نے اویناش کی طرف بڑھائی اور کہا، 'لڑکی نے بتایا ہے کہ تم آرٹ اسٹوڈنٹ ہو اور راجستھان کے قدرتی مناظر پہ کچھ کام کر رہے ہو... لو یہ رکھ لو۔ اچھا کیا آگئے اور اس لڑکی کو بھی لے آئے۔' یہ کہتی ہوئی زینب آپا، باہر کی طرف چلیں۔ اوی نے احتراماً کھڑے ہو کر ان سے پینٹنگ وصول کی تھی، اُسے ماتھے سے لگایا تھا اور آپا کا شکریہ ادا کیا تھا۔ وہ اس تحفے کی عطا سے کھلا پڑتا تھا اور چاہتا تھا کہ آپا کے پیر چھو کر بھی شکریہ ادا کرے۔ مگر آپا، اس کے شکریے کے جواب میں مسکراتی اور ہاں میں سر ہلاتی تقریباً گھوم چکی تھیں۔ پھر جاتے جاتے انھوں نے ایک جملہ کہا اور چلی گئیں، کہنے لگیں، 'روی! تم بھی آؤ نا'۔

اویناش کو ایک لمحے کے لیے اس بات نے دکھ سا پہنچایا کہ آپا زینب نے اس کا نام ٹھیک سے نہیں سنا تھا؛ وہ اُسے اوی یا اویناش نہیں.. 'روی شنکر' یا کچھ سمجھ رہی تھیں۔ مگر پھر زینب نقوی کی پینٹنگ کو دیکھ دیکھ کر اُس کا خون سیروں کے حساب سے بڑھنے لگا۔ اپنی عمر کے کسی بھی نوجوان کی طرح اس نے فوری طور پر طے کرلیا کہ مَیں جب کبھی بھی یہاں آؤں گا، اس اِرما چڑیل کو ساتھ نہیں لاؤں گا۔

مگر سیلز مین اوی کو اندازہ نہیں تھا کہ اُس دن کے بعد سے اغما ملنگنی، آپا زینب کے دنوں اور راتوں میں کچھ اس طرح سے نافذ ہونے والی تھی کہ خود اغما کے بھی خواب و خیال میں نہ ہوگا۔

دوسرے دن آپا زینب نے بلی رام چوریہ سے کہہ کے اِرما سلاما نکا کو 'حویلی' میں بلوالیا اور شیشہ ڈھکے دالان میں بٹھا کے اس کی تصویر بنانی شروع کردی۔

مہینہ بھر میں آپا نے اِرما کو سامنے بٹھا کے آٹھ نو پینٹنگز بنائیں۔

انھوں نے ملنگنی کو طرح طرح اٹھا بٹھا کے: اپنی طرف مُنہ کرا کے، سر جھکائے، پیٹھ موڑے، چہرہ اٹھائے، مالک سے استدعا کرتے، اپنی آنکھیں موندے، ایک بلندی اور عُلاء کی کیفیت میں سر اُٹھائے؛ کبھی ڈھکی اور کبھی کھلی ڈُلی... ہر طرح، پینٹ کیا۔

سبھی نے کہا کہ ہم نے اس بے ڈھب لڑکی کو کبھی اتنی سنجیدگی سے نہیں لیا تھا؛ آپ نے تو اسے ایک پہچان دے دی۔ اوی کہنے لگا، 'مَیں نے تو اپنی جان چھڑانے کو اِسے ماں کہا تھا؛ میڈم! آپ نے اس ماں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔'

پھر آرٹ اسٹور والے اگروال اور این جی او 'حویلی' کی انتظامیہ نے ان تازہ پینٹنگز کی نمائش کا بہت اچھا بندوبست کر دیا۔

تو اخبار اور ٹیلی وژن والے آ گئے۔

سو اس کے بعد ملنگنی اور آپا زینب کے لیے... اور دوسرے بہت سے لوگوں کے لیے، جیسے یہ دنیا ہی بدل کے رہ گئی۔

اگلے دن ایک اخبار والے نے لکھا کہ بھگوا رنگ کی کفنی میں لپٹی بیٹھی، اور کبھی کھلی ڈلی بھی، ایک سادھوی کو 'وستر ہین'، یعنی بے لباس دکھا کر اس چترکار مہیلا نے ہماری سبھیتا (گویا تہذیب) کی ہنسی اڑائی ہے اور چتر کے نیچے... اردو لپی میں، ہیکڑی کے ساتھ اپنا (مسلم) نام بھی لکھا ہے۔ بھلا یہ سب کرنے کی کیا جرورت تھی؟

اردو کے ایک اخبار نے لکھا کہ مصور عورت نے فحاشی اور برہنگی کی تشہیر (یا تبلیغ) کی ہے؛ اور ان منحوس تصاویر پر، عربی رسم الخط میں، بہت ہی محترم اور پاکیزہ ایک نام لکھا ہے۔ یہ حرکت ناقابل برداشت ہے۔

پھر ایک کٹر پارٹی نے بیان دیا؛ اور ٹی وی نیٹ ورک نے تصویروں کے گرد سرخ دائرے بناتے ہوئے بتایا کہ یہ کوئی بہت بھیانک، غیر ملکی سازش ہے جس کا مقصد دھرموں اور ادیان کی توہین کرتے ہوئے، دیش میں افراتفری پھیلانا اور گند اچھالنا ہے۔

رات میں کسی وقت زینب آپا، ملنگنی اور بلی رام چورسیہ کے پاس ٹیلی فون آئے کہ 'حویلی' کے اس کمرے کو جہاں تصویروں کی نمائش ہو رہی ہے، تین طرف سے دھماکے کر کے اڑا دیا جائے گا۔

نمائش بند کر دی گئی۔

خیر، ابھی تک دھماکوں کا وعدہ تو پورا نہیں ہوا؛ مگر کیا لگے... وہ تو کبھی، کسی وقت بھی ہو سکتے ہیں۔

■■

نظمیں

ستیہ پال آنند

جسم کے یہ آٹھ روزن

تو کبھی بدلے گا بھی اس جسمؔ سے باہر نکل کر؟
ایک پنجرے میں مقید
جسم کے ان آٹھ کشکولوں میں
اپنی کم بقا محرومیوں کی دکھشنا بھرتا ہوا
تُو آج بھی یہ چاہتا ہے
سارے کشکولوں کو بھر کر
گیروا چولا پہن کر کان پھڑوائے
کہ یہ آدیش تھا سب جوگیوں کو!

آٹھ سوراخوں کی ساری تشنگی مٹ جائے تو پھر
اک نئے تشنہ بدن میں
سابقون و اولون و التمش سے آگے بڑھ کر
دخل درامکان کی صورت میں تو پھر مرتسم ہو!

ہو چکا کافی! بہت کچھ ہو چکا!
ان گنت جسموں کے ایمائی تشخص در تشخص
کی تجھے اب کیا ضرورت ہے، بتا!
کیا ضرورت ہے تجھے
آواگون کے چکروں کے پھیر میں
پڑنے کی اب پھر؟
کیا ضرورت ہے کسی آبی کنوئیں کے
تشنہ لوٹے کی طرح جنموں کا چرخہ؟
قرنہا سے رَہٹ پر گرداں قدم کوشی کی تجھ کو؟
جبکہ تُو یہ جانتا ہے
تشنگی، سیری فقط دو نام ہی ہیں
واپسی، ارجاع، نصفا نصف چکر کے
فقط آدھے، ادھورے!

اس سے کیا اچھا نہیں ہے
بھول جا خودزائی اپنی!
اپنےؔ دانےؔ کو مٹا دے!
خاک میں دانہ ملے گا، تو یقیناً
تُو نئے گلزار کی صورت اُبھر کر فاش ہوگا!

■■

ندا فاضلی

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

غالب کے انسان سے
کہدو
دیوانِ غالب سے باہر
اب مت نکلے
شہر کا موسم ٹھیک نہیں ہے
اپنے دور کا چغہ پہن کر
سر پر ٹوپی اور چہرہ پر
ترشی ہوئی داڑھی کو سجا کر
جب بھی وہ باہر آئے گا
مولویوں سے فتووں کے پتھر کھائے گا
اپنی روشن فکر کی خاطر
بے چارا مارا جائے گا
عرشی ہیں نہ بجنوری ہیں
اس کی لغت کو
جاننے والے
لفظوں کی اصلی صورت
پہچاننے والے
اب سب مٹی میں مٹی ہیں
خدا کے گھر میں
کسی کے خاطر
اب نہ درِ کعبہ وا ہو گا

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں
مرے ایک ہم عمر رستے نے
اک دن
مجھے یوں ہی گم سم
بھٹکتے جو دیکھا
مرے پاس آ کر
کہا مسکرا کر
مرے دوست دنیا سے واقف نہیں تم
یہ دنیا ہے
تبدیلیوں کا تماشہ
تماشے سے آنکھیں گزرتی رہیں تو
نگاہوں میں منظر
کھٹکتے نہیں ہیں
شناسائی میں
اپنی بینائی کھو کر
تمھاری طرح سے بھٹکتے نہیں ہیں

نجمہ عثمان

محبت روشنی ہے

محبت کے لیے قید زماں بے کار ہوتی ہے
کسی لمحے کسی پل سے محبت ہو ہی جاتی ہے
کسی کی یاد کا انمول لمحہ
کسی کے ساتھ میں گزرا ہوا اک پل
اسی لمحے کی خواہش سے نسبت۔
فقط اس ایک پل کو پھر اک بار
پانے کی تمناؤں میں جی لینا
تمنا اور اس ننھی سی خواہش کو
کسی امید کے آنچل میں کس کے باندھ کر رکھنا
پھر اس آنچل کے سارے شوخ رنگوں کو
اداس آنکھوں میں بھر لینا
کسی کی یاد کا انمول لمحہ
ساتھ میں گزرا ہوا وہ پل
چھلکتی آنکھ میں موتی بنا یوں جگمگاتا ہے
دیا امید کا پھر سے جلاتا ہے
محبت روشنی ہے
اجالوں سے محبت ہو ہی جاتی ہے

■■

رفعت شمیم

سرابِ آرزو

رات خوشبو تھی اس کے عارض کی
زیرِ بالیں کوئی گلاب نہ تھا
جسم کے کچھ نقوش روشن تھے
وہ تو بستر پہ تھو خواب نہ تھا
صبح ہوتے ہی وصل و ہجراں کا
دل میں وہ لطفِ اضطراب نہ تھا
ریگ ہستی تھے آبلہ پا تھے
اور کوئی چشمۂ خوش آب نہ تھا

■■

احمد سوزؔ

وہ

وہ اتنی عظیم الشان
کائنات کا خالق
اور میں
اس عظیم الشان
خالق کی
تخلیق
اس کا شاہکار
اشرف المخلوق
اور
میرا یہ حال

چھلاوا

میں تمھیں اچھا لگوں
تو
تم مجھے اچھی لگیں
ہم اسے پیار کہتے ہیں
مگر یہ سچ نہیں ہے
بدن
رنگ
روپ
رہن سہن
چھلاوا بھی ہو سکتا ہے
آنکھیں دھوکہ بھی
کھا سکتی ہیں
ظاہر و باطن
ہمیشہ
ایک نہیں ہوتے

■■

اسلم مرزا

پانی پر لکھی تحریریں

تیز ہوا کے ساتھ مچلتی
طوفانی برسات
کمرے کی کھڑکی کی کانچ پہ
بوندیں اور لکیریں
چند لمحوں کی بات
ہم سب پانی پر لکھی تحریریں ہیں
بوند بوند بہہ جانے والی

بے موسم برسات کا ایک دن

تیس دسمبر
سرمئی صبح نے
ڈرتے ڈرتے اپنی بھیگی آنکھیں کھولیں
کہر میں ڈوبے شہر کو دیکھا
اس کے لبوں سے
السائی مسکان پھسل کر
وقت کے چہرے پر
انگڑائی بن کر ابھری

میں اپنے بستر میں دبکا
بیداری کی آہیں بھرتا
تنہائی کی
سانسیں گنتا رہتا ہوں
کمرے کی کھڑکی سے باہر
باغیچے میں
شوخ پرندوں کی چہکاریں سنتا ہوں

صداقت

آئینہ
خواب
کھلی آنکھوں کا
زندہ رہنے کے لیے
یہ بھی ضروری ہے
مگر...

یادوں کے دھنک رنگ

سوچ فلک پر لہراتی ہے
کتنی باتیں، کتنے قصے
دہراتی ہے

کیسے کیسے
ہنستے، روتے، گاتے، چہرے
دوڑتے، گرتے، اٹھتے، چلتے
دھنک رنگ شطرنجی مہرے

ماضی کی تاریک گپھا میں
یادوں کے اوراق پلٹتی
سرخ، زرد
اک کٹی پتنگ
پیڑ کی سب سے اونچی شاخ پہ
جھول رہی ہے مست ہوا میں
کیا کیا یاد دلاتی ہے

مہلت

مری سوچ کی سرمئی دھند میں
یہ اڑتی ہوئی تتلیاں
دانہ چگتی ہوئی ایک ننھی سی چڑیا
گھاس پر خوش پھدکنے میں مصروف ٹڈے
سرسراتی ہوا، جھومتی فصل
شاخیں، شجر
دھوپ، پرچھائیاں، ڈولتے ابر پارے

اس سے پہلے کہ یہ سارے الفاظ
معدوم ہوں
معانی کی خوش رنگ اڑھاؤں قبائیں انھیں

اس سے پہلے کہ ناز و ادا سے
قیامت کو دامن میں اپنے سمیٹے
تمھیں بام پر آتا دیکھوں
مری نظم
تکمیل کی منزلوں سے گزر جائے
بس
اتنی مہلت ملے

■■

نثار احمد نثار

سکوتِ بیکراں

اپنی مرضی سے
جھوٹ کیا
سچ بھی تو بول پاتا نہیں
چاہ کر بھی یہ لب، کھول پاتا نہیں
بارہا، چاہتا ہوں مگر
اس عمل سے گزرنے میں قاصر ہوں میں
میرے اندر ہے
ایک لمبی خموشی
سمندر کی گہرائی جیسی نہاں
جو تحفۂ عصر ہے

کبھی صوت بن کر کے بھی جو
ابھرتی تو ہے
پر، ٹھہری نہیں

■■

عطا الرحمٰن طارق

(۱)

جنگل میں گھوما کرتی ہے
گولر کی بھاری گندھ جہاں
دو پتھر ہیں کچھ پاس پاس
کچھ راکھ ہے اُجلی مٹیالی
کچھ دور ندی کا پانی ہے
کچھ کند مُول، کچھ پات پھول
کچھ بیلیں ہیں
کچھ دھوپ چھاؤں سا منظر ہے
اک میٹھی چپ کا جادو ہے
اک نامحسوس حرارت ہے

کیا بھید ہے، جو آسودہ ہے
بولو تو کہا؟
جنگل میں گھوما کرتی ہے
گولر کی بھاری گندھ جہاں

(۲)

ساون کو سموئے رہتے ہیں
اپنے اندر.....
پتہ پتہ پیڑ گھنے
چپ چاپ کھڑے جو آئیں نظر

رنگوں میں سنائے لمحوں کو
پی لیتے ہیں قطرہ قطرہ
اپنی نمناک نسیجوں میں

پھر دھوپ کو تھوڑا بہلا کر
پھر ہوا کو تھوڑا پھسلا کر
مستی میں اچانک، لہرا کر
رچ لیتے ہیں اپنا موسم
کچھ ادھر اُدھر
پتہ پتہ پیڑ گھنے
چپ چاپ کھڑے جو آئیں نظر
ساون کو سموئے رہتے ہیں
اپنے اندر!

■■

منیر سیفی

بدبو

چلو کمرے کو ہی اچھی طرح سے بند کرلیں
اور سوچیں!
کہ یہ بدبو کہاں سے آرہی ہے
کہیں انسان کوئی
ہمارے اندر مر کے سڑ گیا ہے
یا
ہواؤں کے بریدہ بازوؤں میں
تعفن خیز کیڑے پڑ گئے ہیں

تازہ ہوا

بہت ہی گھٹن ہے
کواڑوں کو یونہی کھلا چھوڑ دو
کہ تازہ
سبک رو
ہوا آسکے

گھر آجانا

اس موسم میں!
جانا ہے تو جاؤ لیکن
کچے باداموں کی خوشبو
اور نیلے آکاش کا جادو
جب آوازیں دیں
گھر واپس آجانا

■■

مسعود جعفری

۱۵/اگست-صبحِ آزادی

سجی ہیں لال فصیلیں ہوئی ہیں رشک جہاں
ہرا بھرا سا ہے شاداب سا ہے موسم بھی
سحر کے ساتھ برسنے لگی ہے شبنم بھی
یہ صبح صبح بہاراں ہے فخر عالم بھی
نہ ہوگا چاک گریباں نہ ہوگا ماتم بھی
ہمارے ملک کا قائد کرے گا ہم سے خطاب
دکھائی جائے گی تصویر پھر گلستاں کی
کرے گا بات وہ مہتابی درخشاں کی
حوالہ دے گا وہ انصاف کا عدالت کا
ثبوت پیش کرے گا نئی قیادت کا
سبھوں کے واسطے سوغات اور وعدے بھی
محبتوں کے حسیں فیصلے ارادے بھی
مگر صفوں میں ابھی ہیں حرام زادے بھی

■■

غزلیں

مظفر حنفی

◆

شہرِ سیاہ کار میں یہ جو ذرا سا نور ہے
اس کا ہماری ذات سے رابطہ کچھ ضرور ہے

چار دنوں میں حوصلہ بڑھ گیا آسمان کا
جتنا زیادہ پاس تھا اتنا زیادہ دور ہے

ہاں یہی شکل تھی کبھی قلب و نظر کی روشنی
چہرہ داغ داغ ہے آئینہ چور چور ہے

جس نے خلیج ڈال دی آدمی آدمی کے بیچ
علم نہیں وہ جہل ہے فہم نہیں فتور ہے

آگ تھی جو سرشت میں جی نہ لگا بہشت میں
وہ بھی مرا قصور تھا یہ بھی مرا قصور ہے

مظفر حنفی

◆

جھکے ہوئے سر سے پھوٹ نکلا ابل ابل کر خدائی سا کچھ
خبر ہے تجھ کو کہ جم رہا تھا تری عبادت پہ کائی سا کچھ

خوشامری بے نیاز فطرت کو دھولیا خاکساریوں سے
لپٹ گیا تھا مرے قدم سے غبارِ فرمانروائی سا کچھ

شکستہ ہو کر بھی پوری سچائی اس نے مجھ پر نہ منکشف کی
عجیب چہرہ تھا آئینے میں، غنیم تھوڑا سا بھائی سا کچھ

نہیں رہا تم سے کچھ تعلق کہ ایک مدت سے غیر ہوں میں
مگر یہ لذت فراق کی سی، مگر یہ رنگ آشنائی سا کچھ

مصحف اقبال توصیفی

◆

ذرا دیکھو تو آ کر کچھ نہیں ہے
مرے اندر نہ باہر کچھ نہیں ہے

ابھی سب کچھ یہیں تھا اور ابھی سب
نہ وہ گلیاں، نہ وہ گھر کچھ نہیں ہے

تمھیں جاتے ہوئے دیکھا ہے اس نے
اب اس کھڑکی کے باہر کچھ نہیں ہے

سنو، اس راکھ کو اب کیوں کریدو
میاں! اب اس کے اندر کچھ نہیں ہے

اگر تم سے ملیں اب ہم، نہ خود سے
مری جاں اس سے بہتر کچھ نہیں ہے

فضا میں تیرتی ہے آنکھ اکیلی
تماشا یہ ہے منظر کچھ نہیں ہے

مصحف اقبال توصیفی

◆

کہاں ہوں، کیوں ہوں، کچھ اپنا پتہ نہیں ملتا
یہ کیسی ڈور ہے جس کا سرا نہیں ملتا

کہاں گئے یہ مرے خال و خد، خدا جانے
یہیں تو تھا وہ مرا آئینہ نہیں ملتا

وہ طفل، ہم نے سنا کب کے ہو گئے بوڑھے
گلی کے موڑ پر اک پیڑ تھا۔ نہیں ملتا

دعا کے آگے وہی ایک اینٹ کی دیوار
اسے بھی اور کوئی راستہ نہیں ملتا

خدا یہیں ہے، اگر ہے بتوں نے سمجھایا
تو دیکھ آئے حرم میں خدا نہیں ملتا

یہ پیاسی دید کی آنکھیں کہو کہاں لے جائیں
پیالہ ملتا ہے لیکن بھرا نہیں ملتا

میں چاہتا ہوں بہت اس کو لیکن آخر کیوں؟
اُسے بھی اور کوئی دوسرا نہیں ملتا

حامدی کاشمیری

پاس آکے حجاب میں رہنا
ایک آشفتہ خواب میں رہنا

شام کو ترکِ موانست کرنا
رات بھر پیچ و تاب میں رہنا

کیسے ممکن ہے موجِ نکہت کو
نوابیدہ گلاب میں رہنا

سیلِ ظلمت زمیں بہالے گی
حجلۂ ماہتاب میں رہنا

کس کی خاطر قبول ہے مجھ کو
زندگی بھر عذاب میں رہنا

وادیوں میں قیام کرلینا
موسموں کے عتاب میں رہنا

حامدی کاشمیری

گھر سے نکلے راز ہو کے رہ گئے
دشت کی آواز ہو کے رہ گئے

یہ خبر موجِ صبا ہی لائی تھی
جتنے در تھے باز ہو کے رہ گئے

تھا نہ مخزن کا کہیں نام و نشاں
لوگ حرص و آز ہو کے رہ گئے

آئے تھے ہر سمت سے خنجر بکف
کیوں مرے دم ساز ہو کے رہ گئے

پار کرنے چل دیے آفاق کو
نقطۂ آغاز ہو کے رہ گئے

برف زاروں کی کوئی حد ہی نہ تھی
شعلۂ پرواز ہو کر رہ گئے

رؤف خیر

◆

زباں پہ حرف تو انکار میں نہیں آتا
یہ مرحلہ ہی کبھی پیار میں نہیں آتا

کھلے گا ان پہ جو بین السطور پڑھتے ہیں
وہ حرف حرف جو اخبار میں نہیں آتا

سمجھنے والے یقیناً سمجھ ہی لیتے ہیں
ہمارا درد جو اظہار میں نہیں آتا

یہ خاندان ہمارا بکھر گیا جب سے
مزہ ہمیں کسی تہوار میں نہیں آتا

ہمارے حق میں تو وہ چاند اور سورج ہے
بہت دنوں سے جو دیدار میں نہیں آتا

کمال یہ ہے کہ ہم خواب دیکھتے ہی نہیں
کہ خواب دیدۂ بیدار میں نہیں آتا

ہمارا شعر سمجھنے کی کچھ تو کوشش کر
یہ کیا نوشتۂ دیوار میں نہیں آتا

قلم کی کاٹ تو تلوار سے بھی بڑھ کر ہے
مگر شمار یہ ہتھیار میں نہیں آتا

وہ اپنے ذوق بڑھائیں، اگر مزہ ان کو
رؤف خیر کے اشعار میں نہیں آتا

رؤف خیر

◆

کوئی بھی زور خریدار پر نہیں چلتا
کہ کاروبار تو اخبار پر نہیں چلتا

ہم آپ اپنا گریبان چاک کرتے ہیں
ہمارا بس ہی تو سرکار پر نہیں چلتا

کچھ اور چاہیے تسکین جسم و جاں کے لیے
ہمارا کام تو دیدار پر نہیں چلتا

میں جانتا ہوں مجھے کس کا ساتھ دینا ہے
میں بلّی بن کے تو دیوار پر نہیں چلتا

اصول جتنے ہیں لاگو ہمیں پہ ہوتے ہیں
اور ایک یارِ طرحدار پر نہیں چلتا

انھیں لحاظ نہیں ہے جو میری مرضی کا
تو میں بھی مرضیِ اغیار پر نہیں چلتا

نہ جانے کب تمھیں اوقات اپنی دکھلا دے
اب اتنا ظلم بھی نادار پر نہیں چلتا

مرے سخن کا بہانہ ہیں قافیہ و ردیف
میں شعر کہتا ہوں کچھ تار پر نہیں چلتا

رؤف خیر پہنچتا وہیں ہے ہر پھر کر
کہ اختیار دلِ زار پر نہیں چلتا

حنیف ساحل

◆

عشقِ خانہ خراب میں رہنا
عمر بھر اضطراب میں رہنا

اس کی محفل میں خندہ رو پھرنا
اندروں اضطراب میں رہنا

مسکراہٹ کا قرض ادا کر کے
آنسوؤں کے حساب میں رہنا

رات بھر دیکھنا سنہرے خواب
دن کو تعبیرِ خواب میں رہنا

زندگی کا یہی ہے سرمایہ
زلف کے پیچ و تاب میں رہنا

زیست بھی بوجھ بن گئی ساحلؔ
یوں مسلسل عذاب میں رہنا

حنیف ساحل

◆

گردشِ تقدیر دیکھی
پاؤں میں زنجیر دیکھی

عشق کا دیکھا تحیر
حسن کی تسخیر دیکھی

وصل کی خواہش جو کی تھی
ہجر کی تعزیر دیکھی

رات کو جو خواب دیکھا
صبح کو تعبیر دیکھی

دل کے آئینے میں میں نے
تیری ہی تصویر دیکھی

شہر میں اس کی ہی شہرت
اپنی تو تشہیر دیکھی

غم کی پرچھائیں ہی ساحلؔ
اپنی دامن گیر دیکھی

احمد سوزؔ

◆

میں اُسے جان بھی نہ پاؤں گا
اور یہ زندگی گنواؤں گا

میں سنواروں گا شکل صورت بھی
اپنا حلیہ میں خود بناؤں گا

لمس میں اُس کے ہے توانائی
اُسے چھولوں تو جگمگاؤں گا

پہلے تو دیر تک ستاؤں اُسے
جب وہ رونے لگے ہنساؤں گا

کوئی پرساں نظر نہیں آتا
زخم اپنے جسے دکھاؤں گا

اُس سے سارا حساب مانگنا ہے
اپنا ایک ایک دکھ بتاؤں گا

میری تصویر پر چڑھاؤ پھول
سوزؔ جب میں نظر نہ آؤں گا

منیر سیفی

◆

ڈوبتے سورج کا منظر دیکھنا
رنگ دل رنگ گل تر دیکھنا

جان سے جاتے ہیں کیسے جاں نثار
زندگی دو پل ٹھہر کر دیکھنا

موت کے قطرے مرے ماتھے پہ ہیں
رکھ کے تم پتھر پہ پتھر دیکھنا

آج تک دل میں ترازو تیر ہے
جاتے جاتے اس کا مڑ کر دیکھنا

اس سفر میں آئیں گے رخنے کئی
کوہسار و دشت و ساگر دیکھنا

ہے یہی تعبیر میرے خواب کی
بے خطا لاکھوں کو بے گھر دیکھنا

آ رہی ہے خون میں لت پت ہوا
کرگسوں کا بھی ہے لشکر دیکھنا

غالبؔ خستہ کی خواہش تھی منیرؔ
بے در و دیوار کا گھر دیکھنا

خالد عبادی

◆

ہوا وہ جو ہونا ہی تھا دوستو
ہمیں خون رونا ہی تھا دوستو

کسی کو تو ہوتا بکھرنے کا غم
مرا دل کھلونا ہی تھا دوستو

سفینے میں پھر کیوں بٹھایا ہمیں
کہو جب، ڈبونا ہی تھا دوستو

اگر ڈھونڈتے وہاں تو پاتے ہمیں
بیاباں کا کونا ہی تھا دوستو

تمھارے مقدر میں ہے بندگی
تمھیں بوجھ ڈھونا ہی تھا دوستو

اگر ہیں یہ آنکھیں ہماری تو پھر
گہر بار ہونا ہی تھا دوستو

مجھے قبر میں جو میسر ہوا
زمیں کا بچھونا ہی تھا دوستو

کسی نے کسی کو دعا تک نہ دی
یہ اک روز ہونا ہی تھا دوستو

کسی کے جگانے سے کیا فائدہ
اگر چھپ کے سونا ہی تھا دوستو

خالد عبادی

◆

شکایت نہیں ہے کسی کو کسی سے
کہیں مر نہ جائیں یہ سن کر خوشی سے

مرا نام لیتے ہیں بغداد والے
ملا مرتبہ مجھ کو یہ ابھی بے

ترا حال مجھ سے چھپا تو نہیں ہے
زباں خشک ہونے لگی ہے ابھی سے

کہاں تک کسی کی تمنا نہ کیجے
تکا کیجیے خود کو بے چارگی سے

سر دشت بارش کی نابود حسرت
مجھے دیکھتی ہے. بہت عاجزی سے

جو دیکھا اِدھر تم چلے آرہے ہو
ملاقات ہونی تھی اک آدمی سے

یہ ننھے دیے یہ تنک تاب جگنو
ڈراتے نہیں ہیں ہمیں روشنی سے

نہ منزل کی جانب نظر تم کروگے
اگر کوئی رشتہ ہے بے منزلی سے

عبادی یہ خوفِ خدا ہی وہ شے ہے
بچاتی ہے بندوں کو جو گمرہی سے

محسن اخترؔ محسنؔ

◆

عجیب طرز کا موسم مرے وطن میں رہا
میں سایہ دار درختوں کے اجڑے بن میں رہا

بہارِ نو کے مناظر تو ہر طرف تھے مگر!
میں شہرِ ذات کی خوشبو کے بانکپن میں رہا

شبِ حیات میں حائل تھے جگنوؤں کے فریب
میں شعلہ بن کے چراغوں کی انجمن میں رہا

کسی مکان میں گھٹ گھٹ کے کھو گئی جو صدا
میں گونگے شور کی مانند اسی دہن میں رہا

جنونِ دل کی زمیں پر اتر گیا سورج
میں تیز دھوپ کو اوڑھے کرن کرن میں رہا

محسن اخترؔ محسنؔ

◆

یاد مانگے ہے کبھی اور کبھی سر مانگے
دلِ خستہ بھی مری جاں سے رفوگر مانگے

میرے اوصاف کی بولی جو لگی خوب لگی
شہرِ سفّاک بھی مجھ سا ہی قلندر مانگے

دھوپ کے کھیت کے گوشوں سے اٹھی موجِ بلا
میرے معصوم پرندوں کا وہ شہپر مانگے

کچھ فقیہانِ وطن کا بھی تقاضا ہے عجب
وہ تو دل مانگتے ہیں دل کوئی دلبر مانگے

چارہ سازی کے تماشوں میں الجھنا ہی پڑا
دلِ ناداں میرا ہر پل کوئی محشر مانگے

دشت گشتی کو بلاخیز تھی محسنؔ کی مگر
آبلہ پائی تو مجنوں کا مقدر مانگے

ساجد حمید

◆

بدن پہ زخم نہیں پھر لہو کہاں کا ہے
یہ وقت سوچنے کا ہے نہیں اذاں کا ہے

یہی میں سوچ کے خود سے گریز کرتا ہوں
معاملہ غمِ دل خوابِ نیم جاں کا ہے

قصور اس میں نہ شیشے کا اور نہ چہرے کا
فساد ذہن میں پھیلے ہوئے دھواں کا ہے

یہ خواب جو مری تحریر میں ہے تابندہ
نہ بادلیر، نہ گوئٹے نہ برگساں کا ہے

جو لکھ رہا ہوں پڑھے گا زمانہ رک رک کر
کہ یہ زمین کا قصہ نہ آسماں کا ہے

اسی گمان میں ساجد حمید عمر کٹی
اگر یہ دوش فلاں کا نہیں فلاں کا ہے

ساجد حمید

◆

وہ بستی جس کی نِندا ہو رہی ہے
بہت دلکش تھی، صحرا ہو رہی ہے

مرے احساس میں اک نرم خوشبو
جو مخفی تھی ہویدا ہو رہی ہے

نہ وہ آئے نہ ان کی یاد آئی
مری تنہائی رسوا ہو رہی ہے

مناظر سب جھلتے جا رہے ہیں
ہوا کی دھن شکستہ ہو رہی ہے

سنا ہے چاندنی مایوس ہو کر
گزشتہ سے کنارا ہو رہی ہے

کوئی سائکل بجے شیشہ ہی چٹخے
خموشی جان لیوا ہو رہی ہے

فسردہ ہو گئی ہے دل کی دھڑکن
کہ جامد ہر تمنا ہو رہی ہے

جسے میں نے رکھا ہے قید ساجدؔ
وہ ساعت دل گرفتہ ہو رہی ہے

جاوید صدیقی

یہ تو گلزار ہیں

گلزار جیسی شخصیت کے بارے میں قلم اٹھنے سے پہلے دیر تک سوچتا ہے کہ شروعات کہاں سے کی جائے؟ سات دروازوں میں سے پہلے کسے کھولا جائے اور کس کونے میں کھڑے ہو کر دیکھا جائے کہ اس بلند و بالا عمارت کے بہت سے پہلو ایک ساتھ نظر آجائیں۔ ہم جیسے کم مایہ ادیب جن کا صریر خامہ نوائے سروش نہیں ہوتا اور جن کے خیال میں غیب سے مضامین نہیں آتے اچھی طرح جانتے ہیں کہ قطرے میں دجلہ دکھانے کا فن غالبؔ اور حافظؔ کے ساتھ جا چکا ہے، مگر چلیے کوشش کرتے ہیں "دھل" ہو یا نہ ہو۔ گلزار نے میری کتاب "روشن دان" کا اجرا کرتے وقت کہا تھا:

"جاوید صاحب نے اپنے خاکوں میں ریپن روڈ اور بمبئی سینٹرل کے جن فٹ پاتھوں کا ذکر کیا ہے ان پر تو میں بھی گزرتا رہا ہوں، میں الیکزنڈرا سینما کے پاس ایک گیریج میں کام کیا کرتا تھا۔ حیرت ہے کہ ہم دونوں ایک ہی علاقے میں تھے مگر کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔"

مگر میرا خیال ہے کہ میری فٹ پاتھ نوردی سے بہت پہلے گلزار صاحب کی کہانی شروع ہوتی ہے۔

بچپن بہت تکلیف میں گزرا۔ گزرنا ہی چاہیے تھا کیوں کہ سونا پگھلانے کی یہ کٹھالی ہر بڑے آدمی کی قسمت میں لکھی جاتی ہے۔ جس میں اسے پگھلایا اور ڈھالا جاتا ہے۔ سوتیلی ماں گھر میں سونے کی اجازت نہیں دیتی تھی تو دوکان میں جا کر راتیں کاٹتے تھے اور راتوں کو کاٹنے کا سب سے تیز ہتھیار ہے کتابیں اور کتابیں تو آپ جانتے ہی ہیں غضب کی استاد ہوتی ہیں۔ چند دنوں میں وہ سب کچھ سکھا دیتی ہیں جسے وقت بھی سکھاتا ہے، مگر برسوں لگا دیتا ہے۔ کم عمری ہی میں تقسیم کی قیامت دیکھی، اعمال اچھے تھے اس لیے بچ کر بمبئی آگئے اور...

آپ کو لگ رہا ہوگا کہ میں گلزار صاحب کی ساری کہانی سنہ اور تاریخ کے ساتھ سنانے والا ہوں۔ جی نہیں!

میں ان کی سوانح عمری تھوڑی لکھ رہا ہوں میں تو بس اپنے تاثرات قلم کے حوالے کر رہا ہوں اور میری رائے میں خاکہ وہی مزیدار ہوتا ہے جس میں ''صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں'' والا مضمون ہو۔ اس لیے کہ تفصیل میں جائیے تو سوانح حیات بننے کا خطرہ اور کنایوں سے کام لیجیے تو دھندلی تصویر کون پہچانے۔ اس لیے شرافت یہی ہے کہ جو دیکھا ہے، جو محسوس کیا ہے وہی لکھوں اور باقی یاران نکتہ داں پر چھوڑ دوں کہ اشاروں کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔

گلزار صاحب کو جب بھی دیکھو بڑے دُھلے دُھلائے، نکھرے نکھرے نظر آتے ہیں۔ بالکل ایسا لگتا ہے جیسے ابھی ابھی نہا کے، کپڑے بدل کے، کنگھا کر کے آرہے ہوں۔ کپڑے سفید اور سادہ Chinese کالر کا کرتا جو گھٹنوں تک نہیں پہونچتا مگر بہت اکڑا ہوا ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کلف سے یا گلزار کے جسم پر ہونے کے غرور میں۔ سیدھا پاجامہ، جس کی موہری نہ علی گڑھ والوں کی طرح چھوٹی ہوتی ہے نہ لکھنؤ والوں کی طرح پھیلی ہوئی۔ پاؤں میں سنہری کام کی پنجابی جوتیاں جنھیں ''کھسے'' کہا جاتا ہے۔ سنہری فریم سے جھانکتی ہوئی آنکھیں اور ہونٹوں کے اوپر ایک شفیق مسکراہٹ جس کے نشان چہرے کے دونوں طرف جم گئے ہیں۔ کھچڑی بال جن میں اب چاول زیادہ دال کم دکھائی دیتی ہے اور ہاں وہ نہایت سفید مونچھیں، جن کے بغیر گلزار کا سراپا مکمل نہیں ہوتا۔ منہ میں دانت بھی ہیں جو خاص خاص موقعوں پر نظر آتے ہیں۔

بہت سے لوگوں کی رائے ہے کہ گلزار میں ایک عجیب سی کشش ہے جو دلوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ان سے کوئی کام نہ بھی ہو تب بھی ملنے، بات کرنے اور ساتھ بیٹھنے کو جی چاہتا ہے اور لوگوں کی اس رائے سے میں بھی متفق ہوں۔ کیوں کہ یہی رائے میری بھی ہے۔ گلزار صاحب مزاج کے اعتبار سے تنہائی پسند ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے یہ وہی تنہائی ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے:

''ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو''

اپنے بے حد لمبے دن کے کچھ گھنٹے چھوڑ کر باقی وقت ایک کمرے میں اپنی محبوبہ کے ساتھ گزارتے ہیں۔ چونکنے کی ضرورت نہیں ان کی محبوبہ کا نام ہے اردو! کتابوں، مسودوں اور خاموشی سے مہکتا ہوا وہ کمرہ گواہ ہے کہ وہاں ایک عاشق نے اپنی معشوق کے خم کاکل کی آرائش کس کس طرح کی ہے۔ گلزار صاحب کا دن کوئی پانچ بجے شروع ہوتا ہے۔ چھ بجے وہ ٹینس کورٹ پر ہوتے ہیں، آٹھ بجے تک جم کر کھیلنا، جم خانہ کے دوستوں سے گپ لڑانا اور ہری بیلوں سے ڈھکے ہوئے برآمدوں میں چائے کی چسکیاں لینا ان کے لیے تقریباً ایسا ہی ہے جیسا شام کو محفل یاراں میں بوتل کھولنا۔ گھر واپسی پر ایک گھنٹہ غسل خانے کو دیا جاتا ہے۔ جس میں آدھا گھنٹہ اُس ٹب کا ہوتا ہے جس میں وہ پانی بھر کے لیٹ جاتے ہیں اور اکثر سو بھی جاتے ہیں۔ (سنا ہے یہ عادت مولانا آزاد میں بھی تھی) اس کے بعد دن شروع ہوتا ہے، جس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ مگر آج کل ان کا دفتری دن جلدی ختم ہو جاتا ہے۔ ان کی شام اپنے نواسے سمے کے ساتھ گزرتی ہے جس کی عمر پانچ سال ہے۔

روزانہ اپنی دنیا میں بند ہو جانے اور لگاتار کام کرنے کے ان کو بہت فائدے اور کچھ نقصانات بھی ہوئے ہیں۔ فائدہ تو یہ ہے کہ گلزار صاحب نے تنہا جتنا کام کیا ہے اتنا تو بڑے بڑے ادارے بھی نہیں کرتے اور کام بھی

وہ جسے درجنوں خانوں میں بانٹا جاسکتا۔ پہلے وہ شاعر ہیں۔ پھر کہانی کار ہیں۔ فلمی نغمے، مکالمے اور اسکرین پلے لکھتے ہیں۔ فلمیں اور سیریل بناتے ہیں۔ بچوں کے لیے کہانیاں اور نظمیں لکھتے ہیں۔ ترجمے کرتے ہیں جو اکثر منظوم بھی ہوتے ہیں اور تو اور اب اسٹیج بھی نظر میں آچکا ہے۔ چار پانچ ڈرامے لکھ چکے ہیں گلزار کی ڈرامانگاری تھیٹر والوں کے لیے، بہت اچھی خبر ہے۔ رنگ منچ کے ایک چاہنے والے کی حیثیت سے میں بھی بہت خوش ہوں مگر وقت وقت کی بات ہے۔ کبھی میرے ناٹک دیکھ کر کہا کرتے تھے: ''ہمیں اپنا شاگرد بنا لیجیے!'' آج مجھے اپنی استادی خطرے میں دکھائی دیتی ہے۔ گلزار کا کوئی بھروسا نہیں۔ اللہ جانے:

''ٹھہرے گی جاکے دیکھیے ان کی نظر کہاں''

چلیے چھوڑیے اس چھیڑ خانی کو ایمانداری کی بات یہ ہے کہ وہ جس میدان میں اترے ہیں پرچم لہرا کے آئے ہیں اور اب اسٹیج ان کا انتظار کر رہا ہے۔ ارے ان باتوں میں وہ اہم بات تو رہی جا رہی تھی کہ گلزار صاحب کی تنہائی پسندی اور کم آمیزی نے ان کو کیا نقصان پہونچایا ہے۔ سب سے بڑا نقصان تو یہ ہوا کہ ان پر مغرور کی مہر لگادی گئی اور یہ مہر غیروں نے نہیں ان اپنوں نے لگائی جو گلزار کو اپنے رنگ میں نہیں رنگ سکے۔ انھیں اندازہ ہی نہیں ہوا کہ رنگ پکا اور گہرا ہو تو دوسرا رنگ نہیں چڑھتا۔ دوسرا نقصان یہ ہوا کہ مشاعرے اور ادبی محفلیں ان کے لیے ترستی رہیں مگر وہ ساون کے چاند کی طرح کبھی کبھی دکھائی دیتے تھے۔ دنیا سے کچھ فاصلہ رکھنے اور آسانی سے ہاتھ نہ آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ نقلی گرم جوشی اور جھوٹی مسکراہٹ کا فن نہیں جانتے۔ انھیں دنیا کے ہر مسئلے پر بولنا اور رائے دینا بھی اچھا نہیں لگتا۔ وہ بھی کوئی آدمی ہوا جو ہر بازار میں رکھا دکھائی دے۔ بقول سلیم عارف:

''وہ اپنے آپ کو بہت احتیاط سے خرچ کرتے ہیں!''

بہت سے لوگوں کو ان کی یہ بات پسند نہیں اور وہ بھی ایسے لوگوں کو منھ نہیں لگاتے، مگر جنھیں پسند کرتے ہیں ان سے ملنے کا تیور الگ ہی ہوتا ہے۔ اب یہاں چھوٹا منھ بڑی بات ہوجائے گی مگر پھر بھی میرا خیال ہے کہ وہ مجھ سے جس طرح ملتے ہیں شاید مجھ ہی سے ملتے ہیں اور اس طرح ملتے ہیں کہ اُس پر کوئی عنوان بھی نہیں لگایا جاسکتا۔ دور سے دیکھتے ہی اس طرح ہاتھ اٹھاتے ہیں کہ ''اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن'' یاد آجاتا ہے۔ پھر سینے سے لگا کر دیر تک میری دھڑکنیں سنتے رہتے ہیں اور پھر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایسی مسکراہٹ بکھیرتے ہیں کہ نثار ہوجانے کو جی چاہتا ہے۔ محبت کے اس اظہار کو دوسرے کیا کہتے اور سمجھتے ہیں مجھے نہیں معلوم۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ یہ معانقہ اور مصافحہ میرا مغالطہ نہیں ہوسکتا کیوں کہ خلوص کی خوشبو کچھ الگ ہی ہوتی ہے۔

ذہن پر بہت زور ڈالتا ہوں مگر یاد نہیں آتا کہ کیسے گلزار صاحب میرے یا میں گلزار صاحب کے اتنے قریب آگیا۔ دوستی میں کڑی سے کڑی ملتی چلی جاتی ہے اور ایک خوبصورت زنجیر بن جاتی ہے۔ یہاں عالم یہ ہے کہ کوئی حادثہ، کوئی واقعہ یاد نہیں آتا جو ہمارے درمیان پل بنا ہو، بس اتنا یاد ہے کہ ان کو پہلی بار شاید ۱۹۷۷ء یا ۱۹۷۸ء میں دیکھا تھا۔

کرکٹ کلب آف انڈیا میں ان کی فلم 'میرا' کے سلسلے میں پارٹی تھی اور گلزار صاحب وہاں آئے تھے۔ مجھے کچھ الگ سے لگے۔ یعنی نہ خالص فلمی تھے اور نہ نرے رائٹر۔ چال ڈھال، کپڑے اور چہرہ مہرہ اس وقت بھی ویسا ہی تھا جیسا اب ہے۔ اگر کچھ فرق تھا تو اتنا کہ اس وقت چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی دکھائی دے رہی تھی جسے انگلش میں Stubble کہتے ہیں۔ یہ داڑھی برسوں اسی طرح ان کے چہرے پر بکھری رہی۔ نہ کبھی گھٹنے کی گستاخی کی نہ بڑھنے کی جرأت۔ اس زمانے میں افواہ تھی کہ گلزار صاحب رات کو Shave بناتے ہیں تا کہ سویرے تک فصل تیار ہو جائے۔ پھر نہ جانے کب اس طرح غائب ہوئی کہ آج تک نہ دکھائی دی!

ہمارے تعلقات کو روانی اس وقت سے ملی جب میری بیٹی لبنیٰ کی شادی سلیم عارف سے ہوئی۔ سلیم، گلزار صاحب کے اسٹنٹ تھے اور گلزار صاحب ان کی قابلیت کی وجہ سے انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ آج یہ حال ہے کہ وہ لبنیٰ اور سلیم کے بچوں اور خود لبنیٰ کے بابا ہیں۔ گلزار کی شفقت اور محبت بھی کسی باپ سے کم نہیں۔ وہ رشتے کتنے خوب صورت ہوتے ہیں جو خون اور قانون کے رشتوں سے بلند ہوتے ہیں۔

آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ خاکہ گلزار کا ہے اور میں اپنی باتیں کر رہا ہوں۔ مگر یقین جانیے یہ سب کچھ محض حوالے کے لیے ہے 'اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے'! چلیے دوسری باتیں کرتے ہیں۔

گلزار صاحب ماشاء اللہ شادی شدہ ہیں۔ ایک ہونہار بیٹی کے باپ، ایک اچھے داماد کے سسر اور ایک پیارے سے نواسے کے نانا بھی ہیں۔ شہر کے سب سے مہنگے علاقے میں بنگلہ ہے۔ درجنوں سرکاری اور غیر سرکاری اعزازات اور انعامات مل چکے ہیں جن میں آسکر بھی شامل ہے۔ وہ ایک یونیورسٹی کے چانسلر بھی ہیں۔ کتابوں کے ایڈیشن پر ایڈیشن شائع ہوتے رہتے ہیں۔ خود ان کے اوپر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی دن رات ان کے نغمے بکھیرتے رہتے ہیں۔ وقت نے گلزار صاحب کو وہ سب کچھ دے دیا جو اس کے پاس تھا۔ انھیں کسی چیز کی کمی نہیں ہے اور ہو بھی تو کیا فرق پڑتا ہے وہ تو ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنی ذات میں انجمن ہوتے ہیں اور ایسے لوگوں کو کوئی حاجت، کوئی پرواہ نہیں ہوتی، مگر شاید ایسا ہے نہیں۔ کبھی کسی اشارے، کسی جملے یا کسی بات کے جھونکے سے پردہ ہل جاتا ہے تو اندر پھیلے ہوئے عظیم سناٹے میں کوئی کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔ مگر آنکھیں خالی ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی تنہائی کا یہ کرب چھلک بھی جاتا ہے۔

زندگی یوں ہوئی بسر تنہا

قافلہ ساتھ اور سفر تنہا

راکھی جی ان کی شریک حیات ہیں۔ مگر کچھ عجیب سلسلہ ہے۔ "ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے" خود گلزار صاحب نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔

My longest short story (میری طویل ترین مختصر کہانی) اب اس کے آگے اور کیا کہا جا سکتا ہے!

جیسا کہ میں نے اوپر کہیں لکھا ہے کہ وہ اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار بہت کم کرتے ہیں مگر وہ بے

خبر یا بے حس نہیں ہیں۔ وہ اچھی طرح واقف ہیں کہ ہمارا سماج، سیاست، تہذیب اور ادب کس طرف جا رہے ہیں اور ان تمام مسایل پر وہ اپنی ایک رائے بھی رکھتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنی رائے کا اظہار ہر جگہ نہیں کرتے بلکہ ان کے تخلیق کیے ہوئے کردار کرتے ہیں۔ ان کی کہانیاں ہوں یا فلمیں، ناٹک ہو یا نظمیں انھیں غور سے سنیے تو گلزار کی آواز سنائی دے گی۔ فلم "ماچس" میں اوم پوری کا ڈائیلاگ "آدھے ۴۷ نے کھا لیے آدھے ۸۴ کھا گیا" چار لفظوں میں سکھوں کے اس درد کو بیان کر دیتا ہے جس کی چبھن سردار سمپورن سنگھ کالرا آج بھی اپنی رگوں میں محسوس کرتے ہیں۔ ان کے طنز کا تیر بھی تیکھا ہوتا ہے۔ جب رونالڈ ریگن دوسری بار امریکہ کا صدر منتخب ہوا تو نصیر الدین شاہ کی زبان سے کہا:

"اس کا مطلب ہے کہ بڑا ایکٹر دو بار پریزیڈنٹ بن سکتا ہے!"

کبھی کبھی تو ان کے وار کو کردار کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اور بنا کچھ کہے ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ بس سوچتے رہ جائیے۔ ہر سال دیوالی پر گلزار صاحب کی طرف سے ہری الائچی اور مصری سے بھرا ہوا ایک بڑا سا ڈبہ آتا ہے، مگر کچھ سال پہلے دیوالی آئی تو الائچی نہیں آئی بلکہ ایک چھوٹی سے پٹاری میں رکھا ہوا ایک تحفہ آیا جو چمک دار روپہلے کاغذ اور لال ربن سے بندھا ہوا تھا۔ ہم نے بڑے شوق سے ربن کھولا کہ لگتا ہے اس بار ان کی طرف سے کوئی نئی چیز آئی ہے، مگر جب روپہلا کاغذ الگ ہوا تو دیکھا کہ اس کے اندر ایک پیاز رکھی ہوئی تھی۔ میری بیوی فریدہ نے اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہ سچ مچ پیاز ہی تھی وہی پیاز جو تقریباً ہر کھانے میں ڈالی جاتی ہے۔ فریدہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ارے۔ گلزار بھائی نے یہ کیا بھیجا ہے؟"

میں بہت زور سے ہنسا اور دل ہی دل میں داد دی کہ پیاز اس وقت کے حالات پر گلزار صاحب کا تبصرہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دس روپے کلو کی پیاز ڈیڑھ سو روپے کلو بک رہی تھی اور کہیں کہیں تو مل ہی نہیں رہی تھی۔ پیاز کی کمیابی کی وجہ سے شہروں میں مظاہرے اور فساد ہو رہے تھے اور غریب جو پیاز سے روٹی کھا لیا کرتے تھے سوکھی کھانے پر مجبور ہو چکے تھے۔ میں نے فون کیا تو فرمایا۔

"مجبوری تھی جاوید صاحب، بازار میں اُس سے زیادہ قیمتی کوئی تحفہ نظر ہی نہیں
آیا۔ اب مل بانٹ کر کھائیے۔ آئندہ شاید یہ بھی نہ ملے۔"

کاش قیمتی تحفے کے طور پر تقسیم ہونے والی پیاز ذخیرہ اندوزوں کی سرپرستی کرنے والے لیڈروں کو بھی نظر آ جاتی۔

گلزار صاحب کے بولنے بات کرنے کا اپنا ہی ایک انداز ہے۔ ٹھہرا، تھما اور باوقار۔ وہ رک رک کے یا سوچ سوچ کر نہیں بولتے پھر بھی ہر جملہ ترشا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ زبان سادہ اور روزمرہ، لیکن بلا کی برجستگی۔ گلزار کا بڑا سرمایہ ان کی آواز بھی ہے۔ جو نہ کھرج دار ہے نہ دندانہ دار اور نہ کبھی دوسُر سے اوپر جاتی ہے۔ مگر اس میں کچھ ایسی کشش ہے کہ سنتے ہی بنتی ہے۔ انھیں اپنی بات کہنے، سچوئیشن کو سنبھالنے اور محفل کا موڈ بدلنے کا بڑا سلیقہ ہے۔ اس کی ایک جھلک تو میرے سامنے میرے گھر میں دکھائی دی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب گلزار

صاحب پاکستان سے لوٹے تھے اور انھیں تقسیمِ ہند کے بعد پہلی بار اپنے وطن دینہ ،ضلع جہلم جانے کا موقع ملا تھا۔میر اسارا خاندان انھیں گھیرے بیٹھا تھا اور وہ ہم سے اپنی یادیں بانٹ رہے تھے۔اس وقت ان کی جو حالت تھی وہ مجھ سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا،میں بھی جب پچاس برس کے بعد اپنی حویلی کے ٹوٹے ہوئے پھاٹک کے سامنے کھڑا ہوا تھا تو دل پر کیا گزری تھی وہ دل ہی جانتا ہے۔گلزار صاحب کی آواز کچھ بھاری ہوگئی تھی ،وہ مسکراہٹ جو اُن کے ہونٹوں کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑتی غائب تھی۔وہ دینہ کے گلی کوچوں میں گھوم رہے تھے اور ہم سب ان کے ساتھ تھے۔ساٹھ برس بعد بھی وہاں سب کچھ تقریباً ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر آئے تھے۔ان کا گھر ویسا ہی تھا اس کی مٹی کی خوشبو وہی تھی ،گلیاں اور بازار اسی طرح تھے ،ندی کنارے کی ریت اسی طرح چمک رہی تھی اور اُس پر بچے اسی طرح کھیل رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔اسکول تھوڑا بڑا ہو چکا تھا کچھ کلاسیں بڑھا دیے گئے تھے اور اسکول کا نام گلزار صاحب کے نام پر رکھ دیا گیا تھا۔ماحول اِتنا بوجھل ہوگیا تھا کہ فریدہ سے برداشت نہ ہوسکا۔ان کے آنسو نکل آئے۔گلزار صاحب نے دیکھا تو کھڑے ہو گئے اور راجیش کھنہ کا ایک ڈائلاگ راجیش کھنہ ہی کے اسٹائل میں کھینچ کھینچ کر بولا: "Pushpa, I hate tears!" اور فریدہ کے آنسو پونچھ دیے۔پل بھر میں سب کا موڈ بدل گیا۔اس واقعہ کو سنانے کا مقصد بس اتنا ہے کہ ان پر چاہے جو گزر جائے مگر وہ ہمیشہ خیالِ خاطرِ احباب رکھتے ہیں۔ارے،ایک بات تو بتانا ہی رہ گئی کہ اُس دن سے گلزار صاحب نے فریدہ کا نام پُشپا ہی رکھ دیا ہے۔

میں نے خاطرِ احباب کی بات کی ہے تو لگے ہاتھوں ایک قصہ اور سن لیجیے۔میں نے ایک ناٹک لکھا تھا جو شری کرشن اور رادھا جی کے رشتے کو ایک الگ زاویے سے دیکھنے کی کوشش تھی۔اس کا ٹائٹل تھا 'شام رنگ' جو گلزار صاحب کے ایک فلمی گیت ''مورا گورا رنگ لئی لے،موہے شام رنگ دئی دے۔'' سے لیا گیا تھا۔اس ناٹک میں دو جگہ گانوں کی ضرورت تھی۔سوچا اگر گلزار صاحب لکھ دیں تو مزہ آجائے گا۔مجھے معلوم تھا کہ وہ بے حد مصروف ہیں اور لگ رہا تھا کہ 'بات بھی کھوئی التجا کر کے' والا مضمون ہوجائے گا مگر دوسرا کوئی نظر میں نہیں آرہا تھا اس لیے ڈرتے ڈرتے فون کیا اور ضرورت بیان کی۔فرمایا:

''ڈراما دے جائیے پڑھ لوں تو بتاؤں!''

گلزار صاحب روانی سے ہندی نہیں پڑھ سکتے ہیں اور شام رنگ کی ہندی تو بہت ثقیل تھی ،میں نے بتایا تو جواب آیا''اچھا تو سنا دیجیے!''اور کچھ دن بعد کا وقت بھی دے دیا۔اتفاق دیکھیے کہ جس دن انھوں نے بلایا تھا اسی دن مجھے ایک بہت ضروری کام سے مدراس جانا تھا۔وقت بہت کم تھا اس لیے جیسے تیسے ناٹک پڑھا اور فلائٹ پکڑنے کے لیے بھاگ کھڑا ہوا۔راستے بھر سوچتا رہا کہ میں نے جس طرح سنایا ہے اس کے بعد وہ گانے لکھنا تو دور ڈراما دیکھنے بھی نہیں آئیں گے۔مگر ٹھیک تیسرے دن ان کا فون آیا:

''کہاں ہیں آپ؟''

''جی بمبئی میں ہوں!''

''قلم ہے آپ کے پاس؟''

”جی ہے!“
”تو لکھیے!“

اور انھوں نے 'شام رنگ' کے پہلے گیت کا مکھڑا لکھوا دیا، کچھ دن بعد دونوں گیت بھی بھیج دیے۔ ان گانوں کی دُھن مشہور میوزک ڈائرکٹر اسماعیل دربار نے بنائی تھی اور بے حد مقبول ہوئے۔ میں آج بھی جب سی ڈی لگا کر وہ سنتا ہوں ”میں ایک پلک جاگی، میں ایک پلک سوئی۔“ تو کمرے میں ہر طرف محبت کی مدھم خوشبو بکھر جاتی ہے۔

گلزار صاحب وقت کے بہت پابند ہیں۔ بلکہ چلتے پھرتے ٹائم ٹیبل ہیں۔ ان کا یہ اصول کبھی کبھی بڑے دلچسپ حالات بھی پیدا کر دیتا ہے۔ ایک بار وہ ایک جلسے میں مہمانِ خصوصی تھے اور صدارت ایک منتری جی کرنے والے تھے۔ گلزار صاحب سے کہا گیا تھا کہ منتری جی کا ایک ایک منٹ قیمتی ہے اس لیے جلسہ ٹھیک ۶ ؍بجے شروع ہوگا اور ۹ ؍بجے ختم ہو جائے گا۔ گلزار صاحب وعدے کے مطابق ٹھیک وقت پر پہونچ گئے مگر بدانتظامی اور منتری جی کے دیر سے آنے کی وجہ سے جلسہ ساڑھے آٹھ بجے شروع ہوا۔ گلزار صاحب نے کسی غصے یا جھنجھلاہٹ کا اظہار نہیں کیا بلکہ اطمینان سے بیٹھے مسکراتے رہے اور ٹھیک ۹ ؍بجے اٹھ کر خاموشی سے چل دیے۔ کسی نے پوچھا ”ارے سَر آپ جا رہے ہیں؟“ فرمایا ”جی، وقت ختم ہو گیا!“ اور باہر نکل گئے۔

ایسا ہی ایک واقعہ ایک ادبی جلسے کا ہے۔ جس میں وہ ایک کتاب کی رونمائی کرنے والے تھے اور میری تقریر تھی۔ یہاں بھی وقت ۶ ؍بجے کا تھا۔ چوں کہ میں بھی وقت پر پہونچنے کی کوشش کرتا ہوں اس لیے سوا چھ بجے تک پہونچ گیا۔ ہال میں داخل ہوا تو وہاں نہ میزبان تھے نہ مہمان۔ دو آدمی اسٹیج پر بینر لگا رہے تھے اور تین چار افراد کرسیاں سجا رہے تھے۔ ان میں گلزار صاحب بھی تھے۔ میں نے کہا ”ارے یہ کیا کر رہے ہیں؟“ آنکھیں چمکا کر بولے۔ ”کرسیاں لگا رہا ہوں۔ آپ بھی لگائیے وقت کٹ جائے گا!“ اور پھر کرسیاں لگانے لگے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اسی وقت میزبان آگئے۔ بہت شرمندہ ہوئے، بہت معافی مانگی۔ گلزار صاحب نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بڑے پیار سے کہا:

”آئندہ کبھی بلائیں تو صحیح وقت بتائیے گا۔ وقت بڑا قیمتی ہوتا ہے۔“

جیسا کے میں نے پہلے کہا کہ گلزار کی ہشت پہلو شخصیت کو ایک مضمون میں سمیٹنا ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ ہر موضوع مطالبہ کرتا ہے: ”کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے“ مگر گلزار کا اصلی روپ ایک شاعر کا ہے اور یہی ان کی پہچان ہے۔ گلزار صاحب کی شاعری پر تعریف اور تعریض کا سلسلہ شاید اسی دن سے شروع ہو گیا تھا جس دن پہلی بار ان کا کلام شائع ہوا تھا۔ کچھ لوگ اس نئی آواز کو سن کر چونکے تھے اور ان کی ہمت افزائی کی تھی مگر بہت سے لوگوں کو ان کی نئی اصطلاحات، نئے استعارے اور لفظیات پر سخت اعتراض تھا۔ پہلے کبھی کسی نے نہ آنکھوں کی خوشبو دیکھی تھی اور نہ کسی نے آواز کو پہنا تھا۔ خود مجھے بھی اعتراض ہے کہ گلزار صاحب کہیں کہیں بہت زیادہ لبرٹی لے لیتے ہیں اور اظہار کی صدیوں پرانی سرحدوں کو پھلانگ کر غیر آباد علاقوں میں نکل جاتے ہیں۔ جہاں پہونچ کر قاری بھونچکا رہ جاتا ہے۔ اکثر اوقات یہ حیرت بڑی خوش گوار بھی ہوتی ہے اور سوچنے پر

مجبور کرتی ہے کہ اگر ادیب اور شاعر ہی زبان و بیان کے عظیم سمندر میں نئے جزیرے تلاش نہیں کریں گے تو پھر کون کرے گا۔ اس لحاظ سے گلزار صاحب اپنی جگہ صحیح ہیں کہ اگر اظہار کو وسعت دینی ہے تو لگے بندھے اصولوں سے باہر نکلنا ہی پڑے گا۔ اگر تفہیم کے نئے تجربے نہیں ہوں گے تو پرانے سانچوں میں بند رہتے رہتے الفاظ کا دم گھٹ جائے گا۔ نئے آسمانوں کی تلاش ہر زمانے میں ہوئی ہے اور ہر بڑے شاعر نے کی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو غالب کیوں پوچھتا۔

"ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب؟"

گلزار کا منفرد لب و لہجہ ان کی پہچان بن چکا ہے۔ اب تو نام بتانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ لوگ کلام پڑھ کے یا سن کر ہی جان جاتے ہیں کہ یہ تو گلزار ہیں۔ اس طرح دور سے پہچان لیے جانے کا اعزاز اردو شاعری میں چند ہی لوگوں کو ملا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ ان میں میرے محترم دوست گلزار صاحب بھی شامل ہیں۔

■■

م. ناگ

دکھی من میرے

'ممبئی ایک چوھادان ھے، جس میں روٹی کا ٹکڑا پھنسا تھا، میں روٹی کا ٹکڑا پانے اندر کیا گیا، ساری دنیا باھر رہ گئی- بس پھر کیا تھا، تیسری گھنٹی بجی، پردا اُٹھا اور چوھا بلّی کا کھیل شروع ھو گیا!"

۱۹۷۳ء

اس زمانے میں ہم سب بھائی صاحب کے ساتھ گوندیا میں رہتے تھے۔ بھائی گوندیا سب ڈویژن میں ایم ایس ای بی میں جونیئر انجینئر تھے۔ گوندیا اس وقت مہاراشٹر کے ضلع بھنڈارہ کی تحصیل تھا۔ آج ضلع ہے۔ ابا پولیس انسپکٹر، میل میں سیکیوریٹی افسر تاج الدین بابا ٹرسٹ میں اسٹنٹ ایگزیکٹو افسر کے عہدوں سے سبکدوش ہو چکے تھے۔

گوندیا میں میری تمام سرگرمیاں اور دوست داریاں ٹھپ ہو کر رہ گئی تھیں، میں اپنی بے روزگاری سے تنگ تھا۔ ابا کا مسئلہ یہ تھا کہ ناگپور ڈویژن کے سرکاری دفاتر سے ان کے جان پہچان والے اعلیٰ افسر ریٹائرڈ ہو چکے تھے اور ان کی جگہ نئے لوگ انچارج بن کر آ گئے تھے اور جس طرح ابا نے رشتے داروں اور دوستوں کے لڑکوں کو سفارش پر ملازمت دلائی تھی، لیکن میرے لیے وہ کچھ نہ کر سکے تھے اس کا انھیں قلق تھا اور ہمیشہ رہا۔

گیارہویں میٹرک کرنے کے بعد میں نے کئی چھوٹی موٹی پرائیویٹ ملازمتیں کیں، گوندیا میں شراب کی ہول سیل دکان پر حساب لکھا، بھنڈارہ میں اینٹ بھٹے والے پنجابی سیٹھ کے پاس کام کیا، کپڑا میل کے واٹر ٹینکر پر کلینری کی، لیکن یہ سب ڈیلی ویجیز والے کام تھے۔ کچھ دن مصروف رہتا، پھر بے کار، گھر میں پیسہ دینا تو دور، الٹے پیسے لیتا اور آوارہ گردی کرتا۔

۱۹۷۵ء

ہاں تو جب میں ممبئی کے دادر ریلوے اسٹیشن پر اُترا، وہ جولائی کی ۲۷ تاریخ تھی اور سال تھا ۱۹۷۵ء۔ میرا ممبئی میں کوئی رشتے دار نہ تھا۔ آج دیکھتا ہوں کہ یوپی بہار سے جوڑینیں بے روزگاروں کو لے کر ممبئی آتی ہیں، اُن کے موبائیل میں رشتے داروں اور شناساؤں کے دس بارہ نمبر تو فیڈ ہوتے ہی ہیں۔ وہ نمبر آزماتے ہیں، دو چار کلک ہو جاتے ہیں، کبھی نمبر ٹال مٹول کرتے ہیں، کبھی مثبت جواب دیتے ہیں، اس طرح ان کی راہنمائی ہوتی ہے۔

۱۷ گھنٹے کے سفر کے بعد جب میں شام ۴ بجے دادر اسٹیشن پر اُترا تو پتہ نہ تھا کہ کیسے چیمبور پہنچوں۔ چیمبور میں مجھے اپنے دوست گڈو کے جیجاجی تاپسکر کے گھر پہنچنا تھا۔ جو بیگر زہوم میں لیبر افسر تھے۔ میرے پاس ایک دوسرا پتہ تھا، سلام بن رزاق کا۔ جن کی کہانی کے ساتھ میرا افسانہ کسی رسالے میں شائع ہوا تھا اور میں نے کہانی پر اپنا ردِ عمل خط کے ذریعے ظاہر کیا تھا۔ میں نے اپنے 'لٹل میگزین' آرگن' کی دو کاپیاں بھی انھیں ارسال کی تھیں!

میرے ہاتھ میں ایک ٹوٹے تالے والا بوسیدہ سوٹ کیس تھا۔ جس میں ایک جوڑی کپڑا، ٹوتھ پیسٹ اور ایک صابن، کہانیوں کی فائیل اور تراشے، سرٹی فی کیٹ اور ایک لنگی بھی تھی، اس دوران شیوسینا کا نعرہ گونجا تھا: "اٹھاؤ لنگی، بجاؤ پنگی۔" لیکن وہ نعرہ تو ساؤتھ انڈینس کے لیے تھا۔ میں تو مہاراشٹر کا سپوت تھا، مہاراشٹر میرا تھا اور یہاں کی ایک عدد ملازمت پر میرا حق تھا۔

میں نے چائے پی اور سگریٹ سلگا کر دو کش لگائے کہ تھکن جیسے 'اُتر گئی'، ان دنوں ایسے ہی میری تھکن اُترتی تھی اور میں تازہ دم ہو جاتا تھا۔

ہاں ایک اور بات بتا دوں! سلام بن رزاق کے علاوہ میرے پاس ایک اور پتہ تھا، وہ پتہ ایک لڑکی کا تھا جو میری قلمی دوست تھی، وہ میری کہانیوں کی دیوانی تھی۔

میں بمبئی آنے کے لیے تقریباً دو ماہ سے پر تول رہا تھا۔ ابا سے ذکر کیا تو اُنھوں نے منع کر دیا "وہاں کون ہے تیرا؟ کہاں رہے گا، کیا کرے گا؟" میں نے کہا، "میں وہاں ہاتھ پاؤں ماروں گا، کہیں نہ کہیں تو جاب ملے گا۔" لیکن انھیں اطمینان نہیں ہوا۔ میں نے سوچا اب بغیر کسی کو بتائے ہی چلا جاؤں گا، یعنی بھاگ جاؤں گا۔ سو روپے میں نے اپنے مصور دوست مرحوم سرفراز سے اُدھار لیے تھے اور ۳۳ روپے ۳۵ پیسے کا ٹکٹ کٹا کر ناگپور سے دادر آیا تھا۔ باقی پیسوں سے میں نے کچھ تازہ میگزین، چارمینا کا ایک پاکٹ اور ماچس خریدی اور پھر بٹاٹا وڑا یعنی آلو بونڈا کھاتے ہوئے اور چائے پیتے ہوئے یہاں آ پہنچا تھا۔

یہاں کا سب کچھ میرے لیے نیا تھا۔ کھان پان، بول چال، ماحول، دوکانوں کا سیٹ اپ، طرز زندگی۔ پان بیڑی کی اتنی چھوٹی سی دوکان میں اتنا سارا سامان! اناسین کی گولی، ریونیو اسٹمپ اور پوسٹ کارڈ سب کچھ ملتا تھا! سڑکیں، اسٹریٹ لائٹ اور پولیس والے، میں متاثر ہوتا چلا گیا۔ ڈبل ڈیکر بس میں بیٹھ کر چیمبور ناکہ اُترا۔ بسوں میں چلنے والے اندھک بلب دیکھنے کا عادی میں بمبئی کی بس میں ٹیوب لائیٹ دیکھ کر چونک گیا۔ تاپسکر کے کوارٹر کی کال بیل بجائی تو وہ اور اُس کی بیوی مجھے دیکھ کر چونک گئے کہ یہ کیا مصیبت آگئی۔

میں نے اپنا تعارف کرایا کہ میں گڈو کا دوست ہوں! تو انھوں نے میرا استقبال کیا۔ جیجاجی بولے، "گڈو دو دن بعد آنے والا ہے۔" میں کھانا کھا کر بے خبر سویا۔ دو دن تک ناگپور کی باتیں چلتی رہیں، دوست کی بہن ڈکٹو سائرہ بانو کی کاربن کاپی یعنی آج کے مطابق زیراکس کاپی تھی۔ جیجاجی سوچ رہے تھے میں جلدی اپنا کوئی ٹھکانہ ڈھونڈلوں گا۔ لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ مجھے بھی لگتا تھا کہ جلدی ملازمت مل جائے گی لیکن مہینہ بھر ایسی نوبت نہ آئی اور میں ان کے یہاں پڑا رہا۔

ناگپور سے گڈو آیا۔ دو دن رہنے والا گڈو چار دن میرے ساتھ رہا۔ اس نے مجھے ممبئی دکھائی۔ اس کے ساتھ میں نے بھیڑ سے کھچا کھچ لوکل ٹرین میں سفر کیا۔ ممبئی کی رنگا رنگی دیکھی، اندھیری پارلے کا مڈل کلاس، گرگاؤں دادر میں نچلے متوسط طبقے کے لوگ دیکھے، لوور پریل اور ورلی میں میل مزدوروں کی بستیاں، چھوٹی چھوٹی کھولیوں میں دس دس لوگ۔ کوئی مالے پر سویا، کوئی پلنگ کے نیچے، جیسے ہی میلوں کے بھونپو بجے، لوگ کھولی سے باہر نکلے، اوٹے پر منھ ہاتھ دھویا اور ڈیوٹی پر چلے گئے۔

دور تک دھواں اگلتی چمنیاں!

میں نے گڈو کے ساتھ فلورا فاؤنٹین دیکھا، پھر آگے گیٹ وے، پھر کولابہ، یہاں میں نے پارسی کلچر کا اثر، گھاٹ کوپر پارلے میں گجراتی کلچر کا غلبہ، بھینڈی بازار اور محمد علی روڈ پر مسلم تہذیب، ہاربر لائن پر بیوپاریوں کے گودام اور ٹرک والے لوگ، ماتھاڑی حمال، ان کی الگ ہی دنیا، لال باغ، بھارت ماتا اور رانی باغ ٹھیٹ مہاراشٹر کلچر۔ ممبئیکر اپنے کمروں سے نکل کر لوکل ٹرین پکڑنے اسٹیشن کی طرف جھپا جھپ تیز تیز قدم بڑھا رہے تھے۔ ان کا جوش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

گڈو نے مجھے پاؤ بھاجی کھلائی، وڑا پاؤ کھلایا، پاؤ بھاجی کے ٹھیلے پر ایک کالا بھجنگ آدمی بڑا گیس کا چولہا اور اس پر بہت بڑا توا کرچھل توے پر بجا رہا تھا اور بھاجی کو الٹ پلٹ کر رہا تھا، امول بٹر (Amul Butter) ہم چمچے سے تھوڑا تھوڑا ڈبل روٹی میں لگا کر کھاتے تھے وہ بھی کبھی کبھی، یہاں میں نے دیکھا، وہ بھجنگ چاول کے فلیٹ چمچے سے بھاجی میں کھپ کے کھپ بٹر ڈال رہا ہے۔ پھر ہم ایرانی ہوٹل گئے۔ مخصوص فرنیچر تھا، چائے پی، ساؤتھ انڈین لنچ ہوم میں رات کا کھانا کھایا۔ میں ممبئی کی نیرنگی دیکھ کر بھونچکا تھا۔

یہاں دنیا بھر کے لوگ تھے جو ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے لیکن ایک ساتھ چل پھر رہے تھے۔

دوسرے دن ہم دیونار ڈمپنگ گراؤنڈ دیکھنے گئے۔ وہاں دور دور تک کچرا پھیلا تھا۔ کچرے کے پہاڑ، میں ظاہر تھا کہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ کچرے کو بڑے بڑے بیلچوں سے پھیلایا جا رہا تھا۔ کچرے ہی میں راستے بنے تھے اور کچرے کے ٹرک آ جا رہے تھے۔ کہیں کچرا جلایا جا رہا تھا تو کہیں دبایا جا رہا تھا۔ کالے کلوٹے بچے عورتیں مرد سب کچرے کو الٹ پلٹ کر رہے تھے۔

وہ کچھ تلاش کرتے ہوئے اپنے کندھے سے لٹکی گونی میں ڈال رہے تھے، کیسے تھے وہ لوگ؟ کچرے کی گندگی اور بدبو میں اپنی روزی تلاش کرتے ہوئے پلاسٹک کی بوتلیں، دھاتوں کے ٹکڑے ڈھونڈتے، کباڑ جمع کرتے وہاں کٹنے بلیاں اور بڑے بڑے چوہے تھے۔ کیسی ان لوگوں کی زندگی ہوگی؟ اور کیا ان لوگوں

کے خواب ہوں گے؟

لوکل میں کھچا کھچ بھیڑ۔ بارہ تیرا سال کا ایک لڑکا دروازے کا ڈنڈا پکڑ کر باہر کی طرف جھکا تھا۔ تبھی کسی نے کہا۔ ''پورا، واکونکوس، تو پڑشیل، آنی آمہالا لیٹ ہوئل۔'' (لڑکے جھگومت، تو گرے گا اور ہمیں تاخیر ہوگی!)

گڈو مجھے ممبئی کی سیر کراتا رہا۔ ایک دن برسات ہوئی، خوب دھو دھو پانی برسا، ہم شرابور ہو گئے۔ گڈو بولا، ''یہ ممبئی کی اصل بارش نہیں ہے، بارش تو ایسی ہوتی ہے کہ ریلوے لائن پر پانی جمع ہو جاتا ہے، راستے پانی میں ڈوب جاتے ہیں۔ کام کاج ٹھپ ہو جاتا ہے۔

میں تجربات اور مشاہدات کی کھلی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ میرے جسم کے مسامات کھلے تھے اور میں مناظر کے آر پار گزر رہا تھا کہ ان مناظر کو میری کہانیوں میں ایک بار پھر سے زندہ ہونا تھا۔ میرین ڈرائیو کا سمندر دیکھا، ملبار ہل کا بوٹ ہاؤس، ہینگنگ گارڈن اور پھر مچھلی گھر۔

وی ٹی سے نکلے تو سڑک کی فٹ پاتھ پر جھونپریوں میں بوڑھے بچے اپنے روٹن میں سرگرم تھے۔ ننھا بچہ جھولے میں سویا تھا۔ جھونپڑے کے آگے ایک پھٹے حال لڑکا، بے حال لڑکی کا چُمالے رہا تھا، دنیا و مافیہا سے بے خبر وہ اپنی دنیا میں مست تھے، چاروں طرف بسوں اور موٹروں کے ہارن بج رہے تھے لیکن انھیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

جوہو گھوم کر سانتا کروز آئے تو فلم روٹی کا گیت بج رہا تھا ''آدمی جو سنتا ہے، آدمی جو کہتا ہے، زندگی بھر وہ صدائیں پیچھا کرتی ہیں۔''

سانتا کروز اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ایک عورت کو ایک شخص بے تحاشا پیٹ رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر لوگوں کی بھیڑ تھی، عورت زور زور سے چیخ رہی تھی، سب دم بخود دیکھ رہے تھے۔ مرد عورت کو گیٹ کی طرف گھسیٹتے ہوئے لے جا رہا تھا۔ وہ چلا چلا کر کہہ رہی تھی۔ ''نہیں مجھے دھندے پر نہیں بیٹھنا ہے اور وہ لوگوں کی طرف مدد طلب نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ''یہ زبردستی مجھے دھندے پر بٹھانے لے جا رہا ہے۔'' وہ رو رہی تھی۔

ایک دن کماٹھی پورہ گئے۔ یہ ایک اور دنیا تھی، بہت سی عمارتیں، خستہ۔ لگتا تھا کہ سجی دھجی عورتیں بھی خستہ ہیں صرف روپے سے چونا گارا لگا دیا گیا ہے۔ چہرے پر میک اپ تھوپے، سجی سنوری لڑکیاں، کمروں میں ٹھسا ٹھس بھری تھیں، کوئی دریچے میں، کوئی روزن اور کھڑکی میں کوئی بالکونی میں مجسموں کی طرح۔ لیکن وہ سب مسکرا رہی تھیں، کچھ لڑکیاں سڑک پر بھی کھڑی تھیں۔ مجھے یہ سب دیکھ کر اپنے شہر ناگپور کا ریڈ لائیٹ ایریا گنگا جمنا یاد آ گیا!

باپ رے چار دن میں گڈو نے مجھے بمبئی کے کتنے شیڈز دکھائے۔ کیا اسی کو کہتے ہیں کثیر رنگی میں وحدت! ممبئی میں ہر طرف گندگی اور بد بو پیچھا کر رہی تھی۔

گڈو ناگپور چلا گیا تو میں ایک بار ٹائم پاس کرنے اس کے دوست گنیش سے ملنے دادر پوسٹ آفس گیا۔ گنیش ناگپور کا تھا، مہاراشٹرین کھانوں کی بات چلی تو ورن بھات کا ذکر بھی آیا۔ وہ بولا، ''چل میں تجھے ورن بھات کھلاتا ہوں، میری بیوی مراٹھواڑہ کی ہے اور بہترین ورن بناتی ہے۔ پھر کیا تھا کھچا کھچ بھری ٹرین سے

اندھیری پہنچے۔ وہاں پی اینڈ ٹی کالونی میں وہ رہتا تھا۔ میں نے دیکھا، ڈیڑھ منٹ بھر نہیں رُکتی تھی لوکل کہیں کہیں تو آدھا منٹ اور اتنی سی دیر میں کیسے ہزاروں لوگ باہر پلیٹ فارم پر بلو اَپ (blow-up) ہوتے تھے اور کیسے اسی دوران ہزاروں لوگ ٹرین کے پیٹ میں سماجاتے تھے۔

شروعات میں لوکل میں چڑھنے اور اُترنے میں کافی تکلیف ہوئی لیکن بعد میں عادی ہوگیا۔ ممبئی میں اسٹرگل کرنے والوں کی جدوجہد گھر سے نکلتے اور ٹرین میں چڑھتے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ لوکل ٹرین میں بھجن منڈلی بھی ہے۔ سالگرہ کا کیک بھی کٹ رہا ہے۔ سبزی ترکاری بھی صاف کی جارہی ہے، نیند کی جھپکی بھی لی جارہی ہے۔ بعد میں لوکل کا سفر روٹن میں شامل ہوگیا۔ یہاں ایسے لوگ بھی دیکھے جو سیٹ سے کھڑے ہو کر پہلے سے کھڑے لوگوں کو بیٹھنے کا موقع دیتے تھے۔ ایسے بزرگوں کی ٹولی بھی دیکھی جو ہر سنڈے ہنستے، خوش گپیاں کرتے بڑی بے تکلفی سے گھومتے تھے۔ اُنھوں نے اپنا سنڈے کلب بنالیا تھا۔ ٹرین کے دوست بھی دیکھے جو تاش کھیلتے تھے۔

ٹرین نے اسٹرگل کی ABC سکھائی، چوتھی سیٹ سے ونڈو سیٹ تک کا سفر جیسے پوری زندگی کا سفر بن گیا۔ ٹرین نے ممبیکروں کو ہر چیلنج سے لڑنا سکھایا، وقت کا پابند بنایا۔

گڈو نے ایک آدمی دکھایا جو سبزی والے بھیا سے لڑ رہا تھا۔

میں نے کہا، ”اس میں کیا خاص بات ہے!“

گڈو نے کہا، ”وہ جو سبزی والا ہے وہ پر پرانتی ہے، ہے نا؟“

میں بولا، ”ہاں....“

”اور جو لڑ رہا ہے وہ ممبیکر ہے۔ ممبیکر کسی طرح کا غصہ اپنے اندر لے کر چلتا ہے۔ موقع نہ پانے کا غصہ اس میں اہم ہے۔ اسے لگتا ہے کہ پر پرانتی اس کے مواقعوں پر قبضہ جمارہا ہے۔ اور اُس کا غصہ نکل آتا ہے۔ اگر کسی کو بات بے بات لڑتے دیکھو تو سمجھو کہ ممبیکر ہے۔“

رات میں گنیش کے گھر سویا، اس نے گڈو کی بہن سائرہ بانو کے قصے چھیڑ دیے کہ کون کون اسے لائن مارتا تھا، اس نے بتایا کہ اس کی آواز اچھی ہے اور وہ آکاش وانی میں سگم سنگیت گاتی ہے۔

گرلا قصائی واڑا میں سلام بن رزاق سے ملنے پہنچا۔ شاید اتوار کا دن تھا۔ سلام بھائی 'لمبی چال' میں رہتے تھے۔ میں جب ان کے گھر کے دروازے پر آواز دے رہا تھا تو وہ قریب ہی ٹائیلٹ سے پاٹ لے کر نکل رہے تھے۔ میں نے ان کی تصویر دیکھی تھی۔ پہچان گیا اور مسکرایا۔ جواب میں وہ بھی مسکرائے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا۔ بڑے خلوص سے ملے، بیٹھک میں بٹھایا۔ بہت سے باتیں ہوئیں۔ ان دنوں وہ ادب کی صورتِ حال پر اچھا بولتے تھے۔ ان کی کہانی ”پٹہ“ کو ہندی میں انعام ملا تھا۔

میں نے سلام بھائی سے ملازمت کے تعلق سے بات کی، دل دھک دھک کرنے لگا کہ دیکھو کیا جواب آتا ہے۔ وہ فوراً بولے، ”فکر مت کرو، کام ہو جائے گا۔ میرے دوست انور قمر انڈسٹریل کینٹین میں مینجر ہیں۔“

سلام بھائی کے جواب سے مجھے اطمینان ہوا۔ ایسا لگا جیسے سر سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ انھوں نے پوچھا:
"کیا تم نے انور قمر کی کوئی کہانی پڑھی ہے؟"
میں نے نا میں سر ہلایا تو وہ بولے، "ارے وہ افسانہ نگار ہیں۔"
سلام بھائی کی چھوٹی بچی باہر سے بھاگتی ہوئی آئی، باہر گلی میں میندو وڑا بیچنے والا آیا تھا۔ بچی نے میندو وڑے کے لیے سلام بھائی سے پیسے لیے اور گلی میں بھاگ گئی۔
بھابی نے ناشتہ بھیجا، ناشتے میں کیلے کو ٹکڑے کر کے گھی میں تلا گیا تھا اور پر ملائی تھی اور ساتھ میں پراٹھے، میں نے پہلے ایسا ناشتہ نہیں کیا تھا۔ خوب مزا آیا۔
جانے لگا تو سلام بھائی نے کہا، "شام کو سنسار ہوٹل پر آؤ، بہت سے دوستوں سے ملاؤں گا۔"
شام کو سنسار ہوٹل پہنچا تو کئی لوگوں جمگھٹا تھا۔ ابراہیم نذیر، سلطان شعلہ اور بہت سے لوگ۔ اب تو نام بھی یاد نہیں، کہا گیا کہ ندا فاضلی بھی دو ایک دن کے آڑے آجاتے ہیں۔
سنسار ہوٹل میں خوب شور ہو رہا تھا۔ لوگوں کی زور زور سے باتیں کرنے کا شور تو تھا ہی۔ چائے کے کاؤنٹر پر کپ ساسر دھونے والے کا شور بھی تھا۔ وہ ساسر اور کپ ٹرے میں جما کر رکھتا تو کھڑ کھڑ کی آواز ہوتی الگ الگ گروپوں میں لوگ باتیں کر رہے تھے۔ چائے پی رہے تھے۔ سلام بھائی نے بتایا کہ یہاں سیاسی اور سماجی لوگ بھی آتے ہیں۔ ادبی لوگ بھی جمگھٹا لگاتے ہیں۔ سنسار ہوٹل ملنے جلنے کا ایک اچھا مرکز تھا۔ تقریباً روز ہی یہاں آنے لگا، انہی دنوں 'برگِ آوارہ' میں عبدالرحیم نشتر پر میرا مضمون بھی چھپا تھا 'ایک پیاسا لڑکا' کے عنوان سے۔ سلام بھائی کو ملازمت کے تعلق سے یاد بھی دلاتا تھا۔ پیسے ختم ہو گئے، پھر اُدھار کا دور شروع ہو گا۔ گھر خط لکھا، بھائی نے سو دو سو روپے بھیج دیے۔ منی آرڈر گھومتا گھامتا بہت بعد میں ملا۔

کرلا میں چھٹی کے دن سلام بھائی کے گھر محفل جمتی۔ اقبال نیازی، اسلم پرویز اور اسلم خان سے تعارف ہوا۔ تینوں کالج اسٹوڈنٹ تھے۔ انھوں نے میرے کچھ افسانے پڑھے تھے اور مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ مجھے یہ سن کر اچھا لگا۔ اسلم خاں کے بارے میں بتایا گیا کہ انھوں نے ایک افسانہ "مچھو" لکھا ہے، مچھو کے کافی چرچے تھے۔ مچھو کا مطلب اسلم خانے نے 'انوکھی بات' بتایا۔ بعد میں مقدر حمید اور مشتاق مومن کے گھروں پر اس نے اپنے کچھ افسانے بھی سنائے لیکن وہ سب مجھے مچھو ہی لگے۔ مجھے بتایا گیا کہ اسلم خان افسانہ سناتا ہے تو سننے والے منھ کھول کر افسانے کی تعریف کرتے ہیں اگر کوئی قابلِ اعتراض بات ہوئی تو دبے لفظ میں بڑے پیار سے مخالفت بھی ہوتی ہے لیکن مخالفت میں بھی تعریف کا پہلو نکل آتا ہے۔ اسلم خان کو ہمیشہ زکام رہتا تھا اور وہ اپنی ناک کسی بھی دوست کے رومال سے یا شرٹ سے پونچھتا تھا اس لیے دوست ایک محفوظ فاصلہ رکھ کر ہی اس کے قریب بیٹھتے تھے۔ اگر گول تکیوں اور کشن والی بیٹھک ہوتی تو پھر کچھ نہ پوچھیے۔ وہ اپنی ناک بڑی بے دردی سے تکیوں کے غلاف پر رگڑتا تھا۔ ایک بار تو مقدر حمید کی بیگم نے اس کی یہ حرکت دیکھ لی اور خوب لال پیلی ہوئیں۔ انھوں نے سلام بھائی سے اسلم خان کو سمجھانے کے لیے کہا لیکن اسلم خان بھلا کسی کی سنتا تھا۔

اقبال نیازی نے سات آٹھ علامتی افسانے لکھے پھر پتہ نہیں کیوں وہ ڈرامے کی طرف چلا گیا۔ اسلم پرویز نے بولڈ افسانے لکھے اور ایک طویل افسانہ 'ایک لڑکی دھوپ میں بیٹھی رو رہی تھی'' لکھا جسے میں نے روزنامہ ہندستان کے ادبی صفحے پر قسط وار شائع کیا تھا۔ یہ کہانی اپنے وقت سے بہت آگے کی چیز تھی۔ افسوس کہ آج اس کی کاپی نہ اسلم کے پاس ہے نہ میرے پاس۔ بعد میں اسلم سیریل لکھنے لگا۔ اب وہ منٹو کی کھوج بین میں لگا ہے اور اچھے مضامین لکھے ہیں اپنے نام کے آگے محمد لگا لیا ہے تاکہ دہلی والے اسلم پرویز سے علاحدہ ہو۔

اسی دوران ممبئی پلے ہاؤس پر حفیظ آتش کی کھولی پر میں نے دو افسانے سنائے۔ حاضرین نے پسند کیے۔ سلام بھائی، انور خان، انور قمر نے تاثرات کا اظہار کیا، وہاں ایک اور افسانہ نگار شاہد احمد صدیقی سے بھی ملاقات ہوئی، کاغذ کی لڑکی کے عنوان سے ان کا ایک مجموعہ بھی آیا تھا۔

اسی دوران شمس کنول کے ماہنامہ 'گگن' کا کوئی خاص نمبر بھی آیا تھا اور افتتاحی پروگرام میں میں نے کئی جید فن کار دیکھے۔ ظ۔ انصاری، خواجہ احمد عباس، اختر الایمان، عزیز قیسی، مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی، مہندر ناتھ اور کرشن چندر جو جلسے کی صدارت کر رہے تھے۔ جو بھی فنکار نظر آتا، لوگ اس کا نام لیتے تو اپنے آپ تعارف ہو جاتا۔ شمع والے یوسف دہلوی کو بھی وہیں دیکھا، ایک پوری کہکشاں اسٹیج پر جلوہ گر تھی۔ کہکشاں کو دیکھتے ہوئے میری گردن اکڑ گئی، جو بہت دنوں تک اکڑی رہی۔

رات میں دیر تک نیند نہیں آتی تو میں ادھوری کہانیاں جینے لگتا۔ ایک ایک بات یاد آتی تھی۔ بار بار یہ سوال سر اٹھاتا تھا کہ آخر تاپسکر سے میرا کیا رشتہ تھا، اس نے مجھے کیوں اپنے یہاں آسرا دیا تھا۔ یہ طے شدہ بات تھی کہ یہ سب اچانک ہو گیا تھا۔

میں ورانڈے میں سوتا تھا، ہر ہفتے تاپسکر کی بیوی علامتی انداز میں آٹے اور دال کے خالی کنستر دکھایا کرتی تھی۔ ورانڈے سے لگا ہوا تاپسکر کا بیڈ روم تھا۔ وہ لوگ کھڑکی بھی بند نہیں کرتے تھے۔ دونوں میاں بیوی دو بچوں کے ساتھ ایک مچھر دانی میں سو جاتے اور میں مچھر مارتے ہوئے ان کی صحبت کی ننگی آوازیں سنتا رہتا۔ مچھر مجھے تنگ کرتے لیکن میں بھاگا نہیں، کفن باندھ کر آیا تھا۔ صرف سر پر نہیں، ہر جگہ کفن!

ایک بار میں نے دیکھا کہ دونوں میاں بیوی گھر میں نہیں تھے۔ میں کسی کتاب کے مطالعے میں غرق تھا اور وہ دونوں چھوٹے بچے۔ لڑکا، لڑکی ایسی حرکتیں کر رہے تھے جیسے ان کے ماں باپ مچھر دانی میں کرتے تھے۔

ایک بار تاپسکر کی بیوی نے مجھ سے کہا کہ ہم جیجوری کے کھنڈوبا کے درشن کو جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا۔ یہ مجھے بھگانے کا داؤ ہے۔ میں نے کہا: ''جائیے۔'' دو دن مجھے فٹ پاتھ پر اخبار بچھا کر سونا پڑا۔ نیند میں کتا میرا منہ چاٹ کر گیا!

ورانڈے میں سوتا اور رات بھر نیند میں دنیا جہان کی سیر کرتا، لیکن اٹھتا تو ورانڈے سے ہی۔ سوچتا، کاش ایسا ہو جائے کہ اچانک نیند اچٹ جائے اور میں کسی اور مقام سے اٹھوں، لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔

تاپسکر بہت دلچسپ آدمی تھا۔ خوب رنگین قصے سناتا تھا۔ ایک بار بولا ''دو باتوں سے شرم نہیں کرنا

چاہیے۔ایک، دستر پر بڈی سے دوسرے، بستر پر بڈی سے!
میرے افسانوں اور تراشوں کی فائل فیروزہ اٹھا کر لے گئی۔تو واپس نہیں آئی۔واپس آئی بھی تو خالی ہاتھ جب میں چیمبور میں رہتا تھا۔وہاں بھی اور جب بھانڈوپ کی کینٹین میں رہتا تھا وہاں بھی۔فیروزہ میری قلمی دوست تھی۔وہ آتی رہی، ہم گھومے پھرے، وہ میرے افسانوں کی شیدائی تھی۔روبی میں جب ''کالی لڑکی گوری لڑکی'' شائع ہوا تو اس نے مجھے محبت بھرا خط لکھا تھا اور تعریفوں کے پل باندھ دیے تھے۔ایک افسانہ سری نگر سے نکلنے والے نگینہ میں بھی چھپا تھا۔دھوبی گھاٹ پر دھلا ہوا دن۔جس پر اس نے بحث کی تھی، افسانے میں عورت کی بے وفائی کا ذکر تھا۔
ایک گارڈن ریستورنٹ میں میں نے فیروزہ کا داہنا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ سے دبایا تو وہ میرا مطلب سمجھ گئی۔ یہ سمجھ بوجھ کی یونیورسل زبان تھی۔فیروزہ نے مجھے اپنی کلائیاں دکھائیں جن میں ہری چوڑیاں تھیں جو مجھے بہت دیر تک نظر نہ آئیں اور جب نظر آئیں تو بہت دیر ہو چکی تھی!
فیروزہ نے مجھے ایک لالی پاپ دیا کہ میری خالہ کی لڑکی سے شادی کرلو، اور اس نے خالہ کی لڑکی سے ملایا بھی۔اس رات میں نے پناما سگریٹ کا پورا ایک پیکٹ بھونک ڈالا۔نیند جیسے مجھ سے روٹھ گئی تھی۔
دوسرے دن فیروزہ نے خالہ کی لڑکی بات کی تو میں نے انکار کر دیا۔کیونکہ نہ اب تک کوئی ملازمت تھی نہ سر چھپانے کا آسرا، جب قسمت ہی گانڈو تو کیا کرے گا پانڈو!

آخرش وہ دن آہی گیا جو میرے لیے عید سے کم نہ تھا۔سلام بھائی نے مژدہ سنایا کہ مجھے ملازمت مل گئی ہے۔انھوں نے کہا،''تم کھار جاؤ، وہاں ہوٹل گرو میں چمن لال سیسودیا سے ملو۔میں بھاگا بھاگا کھار پہنچا۔ سیسودیا ملے، انھوں نے مجھ سے کہا۔
''انور میرا اچھا دوست ہے، تم انور کے دوست ہو۔''
انھوں نے میرے لیے چائے منگوائی اور مجھ سے پوچھا۔
''گوا جاؤ گے، وہاں جگہ خالی ہے۔''
میرے لیے ممبئی کیا اور گوا کیا۔آسرا چاہیے تھا، میں نے ہاں کہہ دیا۔
انور قمر مجھ سے ملے، وہ سیسودیا صاحب کی فرم میں جنرل مینجر تھے۔سیسودیا اس وقت انڈسٹریل کینٹین کے کاروبار میں ایک بڑا نام تھا۔ان کے یونٹ ممبئی سے لے کر چپلون (کوکن) اور گوا تک پھیلے تھے۔پھر بعد میں انھوں نے او این جی سی کے رگز اور پلیٹ فارم پر بھی قبضہ جمایا۔اور کئی آئیل ٹینکرز پر اپنا کاروبار پھیلایا۔انور قمر سیلس اور سپلائے کا کام دیکھتے تھے۔مجھ سے بولے:
''تم فلحال گوا جاؤ۔تمھیں جلد ممبئی بلالوں گا۔''
میں نے پوچھا،''مجھے کیا کرنا ہوگا؟''
انھوں نے کہا،''یہ سب تمھیں کینٹین کا مینجر نائر بتائے گا۔''

انور قمر نے مجھے دوسرے دن بامبے سنٹرل ایس ٹی اسٹینڈ بلایا، شام کا وقت تھا۔ گوا کی راجدھانی پنجم جانے والی بس لگی ہوئی تھی، انھوں نے مجھے بس میں بٹھایا، کنڈکٹر سے ٹکٹ لے کر مجھے دیا۔ پھر سو روپے بھی دیے اور کینٹین مینیجر نائر کے نام خط دیا۔ اور کہا ''میں جلد ہی آؤں گا۔''

دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ پہاڑی راستوں پر بس رات بھر چلتی رہی۔ بس صبح منزل پر پہنچی۔ وہاں سے مجھے اولڈ گوا جانا تھا۔ جہاں سیبا کمپنی کا فرٹی لائزر پلانٹ تھا اسی کی کینٹین سیسودیا صاحب نے کانٹریکٹ پر لی تھی۔

پنجی اسٹینڈ پر ایک لائن سے بائیک والے اپنی بائیکوں کو پھٹ پھٹا کر ریز کر رہے تھے۔ وہ مجھے اپنی طرف بلا رہا تھے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ماجرا ہے، وہ سارے کوکنی زبان میں بول رہے تھے۔ ایک نے ہندی میں بات کی تو سمجھ میں آیا اور میں اس کی بائیک پر بیٹھ گیا۔ اس نے پندرہ منٹ میں مجھے سیبا کمپنی کے گیٹ پر چھوڑ دیا۔

کینٹین میں نائر سے ملا۔ اسے انور صاحب کا خط دیا۔ اس نے ناشتہ کرایا اور اپنے روم میں آرام کرنے بھیج دیا۔ اسی شام سے میں کام کرنے لگا۔ مجھے انتظام دیکھنا تھا۔ کھانے ٹیسٹ کرنے تھے۔ کمپنی ورکرز کو کوئی شکایت نہ پیدا ہو اس کا خیال رکھنا تھا۔ میں کینٹین سپروائزر تھا۔

خوب سگریٹ پیتا تھا۔ ورکر مجھ سے مانگ کر مفت میں سگریٹ پیتے تھے۔ ورکر میرے سوبھاؤ سے خوش تھے، نائر میری مقبولیت سے حسد کرتا تھا۔ اس زمانے میں ہپی ازم ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ میں نے اپنے بڑھے ہوئے بال کاٹے، میں رات میں آفیسرز ڈائننگ ہال میں ٹیبل پر سوتا۔ نہ سرہانہ، نہ بستر، نہ چادر۔ میرے پاس ایک جوڑی کپڑا تھا، میں نے سوچا تھا جیسے ہی ملازمت لگے گی سب کچھ کھل جا سم سم کی طرح ہاتھ آجائے گا!

نائر صاحب نے اپنے سوٹ کیس سے ایک جوڑی کپڑے نکال کر دیے۔

کپڑے دیکھ کر کوک الفانسو نے کہا ''یہ کپڑے تو سیسودیا صاحب کے ہیں۔ نائر جب بھی ممبئی جاتا ہے، سیسودیا صاحب سے کپڑے لیتا ہے۔'' نائر نے کہا ''ایک دم نئے ہیں۔''

میں کینٹین میں لیوش کھانا کھاتے ہوئے کافی تندرست ہو گیا تھا۔ صبح ڈبل انڈے کا ہاف فرائے اور بریڈ بٹر۔ دوپہر میں مچھلی اور گوشت، رات میں کانٹینینٹل فوڈ اور پھر ڈیزرٹ۔

ان دنوں فلم ''راجہ اور رنک'' خوب چلی تھی، اس کی ہیروئن ناظمہ تھی، یہیں پتہ چلا کہ ناظمہ انور صاحب کی سگی بہن ہے۔

مجھے وہاں سب ناگ کہتے تھے وہ مجھے بنگالی سمجھتے تھے، کوئی تو مجھے اننت ناگ کہتا تھا (ناگپور میں تمام دوست مجھے 'م' کہتے تھے) میں کوکنی زبان سمجھنے لگا تھا اور الٹی سیدھی کوکنی بولنے بھی لگا تھا۔

ایک بار اور کئی بار، رات دو بجے جب میں گہری نیند میں تھا تو فون کی بیل بجنے لگی۔ اکثر ورکر مجھے پریشان کرنے کے لیے فون کرتے تھے۔ میں ریسیور اٹھاتا اور ہیلو کہتا تو اُدھر سے ''پھس'' کی آواز آتی جیسے سانپ پھنکارتا ہے۔

شراب کیا ہوتی ہے جانتا نہیں تھا، نائر ڈیوٹی ختم کر کے، رات اپنے کوارٹر پر شراب پیتا تھا۔ میں ورکرز کا ڈنر نمٹا کر دو تین گھنٹے خالی رہتا تھا۔ ایک رات نائر نے مجھے اپنے کوارٹر پر بلایا اور بولا:

''یہاں تنہائی کا ایک ہی علاج ہے... کاجو فینی!''

اور اس نے کاجو فینی کا ایک بڑا پیگ میرے لیے بنایا، ''لو پیو''

میں نے ایک گھونٹ بھرا تو لگا سینے میں انگارے جل رہے ہو، نائر ہنسا، بولا: ''تھوڑی پانی ملالو... سوڈا تو ہے نہیں۔''

نائر نے چیئرز کہہ کر کافی لمبا گھونٹ بھرا، چکھنے کے نام پر بھونے ہوئے کاجو تھے اور سرمئی مچھلی کے دو تین تلے ہوئے ٹکڑے۔ کاجو فینی کی بُو تیز تھی، میں چائے کی طرح سپ کرنے لگا۔ نائر ہنسنے لگا۔ اسی طرح مئے نوشی کی شروعات ہوئی، لیکن یہ کبھی میری لت نہیں بنی۔

نائر نے کہا، ''تمھارے پینے سے لگتا ہے تم شراب کے عادی ہو۔''

میں نے نا میں سر ہلایا تو پتہ نہیں وہ کیا سمجھا اور ہنستا رہا۔

ایک گلاس کاجو فینی پی کر نائر کیرل میں اپنے گاؤں پہنچ جاتا تھا، جبکہ شراب پینے کے بعد میں خاموش رہتا۔ نائر باتیں کرتا جاتا اور آنسو اس کی آنکھوں سے رواں رہتے۔

سو روپیے تنخواہ ایڈوانس میں کٹ جاتی تھی۔ دو ماہ ہوا انور قمر آئے، کام کے معاملے میں وہ بڑے سخت تھے۔ انور قمر نے میری تنخواہ میں اضافہ کیا اور میری تنخواہ سو روپے سے ایک سو پچیس ہو گئی۔

گوا سے جب بھی ناگپور جاتا، کاجو اور گرم مصالحے لے کر جاتا۔

اولڈ گوا میں کافی قدیم اور تاریخی چرچ دیکھے۔ گوا میں کیرل کے مسلم چھوٹی چھوٹی دکانوں میں کاروبار کرتے تھے۔ گوا ٹرانسپورٹ رات نو بجے بند ہو جاتی تھی۔ کہیں آنا جانا نہیں۔ سیسا کمپنی جنگل میں تھی وہاں سے دو کلو میٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں تھا مارشل۔ وہاں ایک ٹاکیز تھی جس میں پرانی فلمیں لگا کرتی تھیں۔

کبھی میں نائر صاحب کے ساتھ پیدل مارشل فلم دیکھنے جاتا، کبھی میں اپنے حامی اسٹاف کے ساتھ سائیکل پر جاتا۔ ٹاکیز کے قریب دو تین طوائفوں کے گھر تھے، نائر نے مجھے بتایا تھا کہ گھریلو طوائفیں ہیں۔ ان میں ایک کا نام تھا منجو۔ نائر ہمیشہ وہیں جاتا تھا۔

ایک بار نائر نے مجھ سے کہا کہ سیسا کمپنی کے گیٹ کے سامنے ایک کلو میٹر کے فاصلے پر دس پندرہ گھر کا ایک گاؤں ہے۔ وہاں ایک لڑکی کو ہندی پڑھانا ہے یعنی ٹیوشن دینا ہے۔ میں نے سوچا چلو دو پیسے کی کمائی ہو جائے گی۔ سیسا کمپنی کے ورکر کے ساتھ اس گھر میں پہنچا جہاں وہ لڑکی رہتی تھی۔ پرتگیز تہذیب ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ ہر گھر میں زنجیر سے بندھے خوبصورت کتے تھے۔ وہاں مہمان کو چائے نہیں دی جاتی تھی بلکہ ان کو تواضع کاجو فینی اور کوکونٹ فینی سے کی جاتی تھی۔ شراب وہاں گھر گھر بنتی تھی۔ شہر میں بھی چائے کے ہوٹل بہت کم تھے۔

لڑکی ساتویں جماعت میں پڑھتی تھی، نازک سی خوبصورت، نام تھا پرپیتو۔ لیکن ایک کتا اس کے یہاں بھی تھا۔

۱۹۶۹ء

الگ الگ پریڈز میں میرے الگ الگ دوست رہے ہیں۔ ان دنوں محمود میرا دوست تھا۔ دنیا بھر کا آوارہ گرد، لیکن پتہ نہیں کیوں اسکی صحبت میں مجھے بڑا مزہ آتا تھا۔

مجھے یاد نہیں کہ میرے پاس سو روپے کہاں سے آئے تھے میرا ایچ ایس سی کا ریزلٹ آیا تھا۔ دو پرسنیج سے میرا فرسٹ کلاس گیا تھا۔ اردو اور بائیلاجی میں مجھے ڈسٹنکشن ملا تھا۔ وعدے کے مطابق بھائی صاحب نے مجھے راڈو گھڑی انعام میں دی تھی۔ ابا نے پیٹھ تھپتھپائی تھی، اماں نے دعائیں دی تھیں، دولہے بھائی نے مٹھائی تقسیم کی تھی۔

ہاں تو میں نے کہا کہ میرے پاس سو روپے کا کرارا نوٹ تھا محمود کے پاس مڑے تڑے پچاس روپے تھے، وہ بولا ''چل مزہ کرتے ہیں۔''

وہ مجھے گنگا جمنا لے گیا۔ ناگپور کا ریڈ لائیٹ ایئریا!

جیسے ہی گلی میں سگریٹ کا دھواں اڑاتے داخل ہوئے ایک آدمی ہمارے پاس آیا۔ وہ بولا ''سالڈ مال ہے، طبیعت خوش ہو جائے گی۔''

وہ آدمی ہمیں لے کر ایک مکان کے سامنے رک گیا، چاروں طرف میک اپ تھوپے لڑکیاں اشارے کر رہی ہیں۔ وہ ہمیں لے کر زینہ چڑھنے لگا۔ وہ دلال تھا اس نے اپنا کمیشن وصولا۔ میں محمود کے ساتھ کسی روبوٹ کی طرح چل رہا تھا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ریڈیو پر گانے بج رہے تھے۔ ہم ایک ہال نما کمرے میں داخل ہوئے، کوٹھریوں میں لڑکیاں کھڑی تھیں۔ سامنے تخت پر موٹی عورت بیٹھی تھی۔ دلال نے اسے سلام ٹھوکا۔

''سلام آکا۔''

موٹی عورت مسکرائی، اس نے آواز لگائی ''اے روپا! سب کو باہر لا۔'' لڑکیاں کھولیوں سے باہر نکل کر ہال میں ایک قطار میں کھڑی ہو گئیں۔

موٹی عورت بولی، ''دیکھو پسند کرو اور موج کرو۔''

پسند ناپسند کی بات ہی کہاں تھی ہم تو نو وارد تھے۔ پہلی کالی سانولی لڑکی کو پسند کر لیا محمود کی پسند میری پسند تھی۔ اکا ہنسی، لڑکیاں مسکراتے ہوئے اپنی اپنی کھولیوں میں چلی گئیں۔

سانولی لڑکی نے کہا، ''دونوں کا سو روپے۔''

میں نے سو روپے اس کے ہاتھ پر رکھے۔

اس نے محمود کا ہاتھ پکڑا اور کھولی میں لے گئی۔

اکا نے کہا، ''اچھا بیٹھنا مگر گراہک خوش ہونا چاہیے۔''

کھولی کا دروازہ بند ہو گیا، میں باہر کرسی پر بیٹھا رہا۔ دس منٹ بعد محمود کھولی سے نکلا اور بولا ''جا''

میں بولا، ''بس دس منٹ کا مزہ'' دل دھک دھک کر رہا تھا اندر جیسے طوفان مچا تھا۔ میں اندر گیا۔ بہت چھوٹی کھولی تھی، پلنگ تھا، پرانا پنکھا گھوں گھوں کی آواز کر رہا تھا، اندھا بلب جل رہا تھا۔ دیوار پر کپڑے

لٹکانے کے لیے ہک لگے تھے۔ایک گندی تاول موری کی دیوار پر لٹکی تھی۔موری میں رکھی بالٹی میں پانی تھا اور پانی کی سطح پر ایک مگ ڈول رہا تھا!

کالی سانولی لڑکی برہنہ تھی۔اس نے مجھے پلنگ پر کھینچا۔

پلنگ پر ایک دم چکٹ تکیہ رکھا تھا۔

میں لڑکی کی برہنگی کو ہکا بکا آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔حلق سوکھ رہا تھا۔لڑکی نے پوچھا،"پہلی بار آیا ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔"ہاں ہم دونوں دوست پہلی بار آئے ہیں۔"

"دونوں۔ہونہہ۔ارے تیرا وہ دوست پکا بدمعاش ہے۔"

اتنا کہہ کر اس نے میرے خصے دبا دیے تو میں اسٹالن گھوڑے کی طرح اچھلا،وہ ہنسی،بولی،"کپڑے اُتار۔"میں بدن چرانے لگا تو اس نے ایک جھٹکے میں میری پینٹ اس طرح اُتار لی جیسے کینچلی اُتار رہی ہو۔میرا ہاتھ غیر شعوری طور پر اپنے عضوئے تناسل پر گیا تو ہاتھ ہٹا کر بولی،"کیا کچھ نیا ہے تیرے پاس۔"

اور آنکھیں تریر کر دیکھا پھر بولی،"ارے تو بھی کتوا ہے۔"

پھر اس نے اپنی شہادت کی انگلی میری ناک پر رکھی اور انگلی کو ناک سے ٹھوڑی تک لے گئی پھر نیچے ناف کے گڑھے تک ایک عمودی لائن کھینچی،میرے بدن میں کرنٹ دوڑ گیا۔

فارغ ہونے میں دس منٹ لگے ہوں گے،وہ بولی۔"بڑے بڑے طرم خان آ کر چلے گئے۔"

جب محمود اور میں جانے لگے تو لڑکی کھولی کے دروازے پر کھڑی تھی۔

اکا نے پوچھا،"آیا مزہ؟"محمود ہنسا تو اکا بولی۔"پھر آنا۔"

"ہاں...ہاں ضرور آئیں گے۔"محمود نے کہا۔

تبھی اس سانولی لڑکی نے مجھے اپنے پاس بلایا،"ارے تیرا رومال۔"مجھے رومال دیتے ہوئے بولی، "پھر دوبارہ ایسی گندی جگہ مت آنا،سمجھا۔"

میں نے سر ہلایا تو بولی،"نندی بیل جیسا سر کیا ہلاتا ہے۔"

ابھی گوا سے متعلق کچھ یاد نہیں آرہا ہے آگے دیکھتے ہیں۔کبھی چندر پور ضلع کا کوٹھاری گاؤں یاد آرہا ہے، جہاں چڈی کے تعلق سے میرے سوچنے کا انداز بدل گیا۔کبھی ناگپور یاد آرہا ہے جہاں پہلا جدید مشاعرہ منعقد ہوا۔کامٹی یاد آرہا ہے۔

واقعات وہ اینٹ گارا ہیں جنھوں نے میری شخصیت کو گڑھا،کیسے اور کیونکر گڑھا،میں نہیں جانتا۔اس تحریر کے لکھنے کا بڑا مقصد یہ ہے کہ میں اپنی جڑوں اور مرکز بچے کو جان سکوں۔میں نہیں جانتا کہ وہ کیا پروسیس ہے جس کے تحت آدمی کی شخصیت گڑھی جاتی ہے۔

کالج کے دور میں جب میرے ایک دوست ڈاکٹر حامد نے کہا تھا،"تو بہت ابنارمل ہے اور تو کسی سائیکیاٹرسٹ کے لیے اچھا کیس ثابت ہو سکتا ہے۔"پھر ایک بار دوست قاسم امام نے کہا،"م۔ناگ پر اسرار

شخصیت ہے۔" مجھ میں کیا پُراسراریت ہے مجھے ضرور جاننا چاہیے۔ مجھے پتہ ہے کہ میری باڈی لینگویج، دوسروں سے ذرا سی الگ ہے، میرا سلوک و برتاؤ بھی بہت الگ ہے۔ میں قریب کی چیز نہیں سمجھتا ہوں اور دور کے ستارے کا جغرافیہ بتاتا ہوں، تو کیا ہے یہ گھڑاگ؟ مجھے جاننا ہے۔

مشہور رسالہ "نقوش" نے ایک نمبر ترتیب دیا تھا "میں کیوں لکھتا ہوں؟" سارے مشہور قلم کاروں نے اس میں اپنے لکھنے کی وجہ بتائی تھی۔ لیکن کیا اتنا آسان ہے اپنے لکھنے کی وجہ بتانا، وہ کیا ہے جو آپ لکھتے ہیں اور وہ کیا ہے جو پتہ نہیں کون آپ سے لکھواتا ہے۔ اور پھر لکھنے سے زیادہ اَن لکھا اہم ہوتا ہے، میرے خوابوں اور سچائیوں کا جو سلسلہ آپ دیکھ رہے ہیں ان میں ایسے کون سے روزن ہیں جہاں میرا Neuclious چھپا ہے؟ باتوں باتوں میں شمس الحق عثمانی نے کہا تھا تم لکھو "میں کیوں لکھتا ہوں؟" میں نے کہا تھا عثمانی صاحب یہ میرے لیے بہت مشکل ہے۔

۱۹۵۸ء

میں سمجھتا تھا کہ چڈی کا تعلق صرف چھوٹے لڑکے لڑکیوں سے ہے۔ لیکن چندر پور ضلع کے ایک دیہات کوٹھاری نے مجھے ایک اور ہی سبق دیا۔ کوٹھاری میں ہمارے پولیس اسٹیشن کا احاطہ جہاں ختم ہوتا تھا اس کے آگے سڑک تھی جہاں ایک بہت بڑا چھتنارہ درخت تھا جس پر بندروں کی ٹولیاں بسیرا کرتی تھیں۔ وہ ہمیں دیکھ کر نیچے اُتر تیں تو ہم انھیں ہُش ہُش کر کے بھگاتے۔ سڑک پر سامنے کی طرف انجن والی بسیں خوب چلتی تھیں، جنھیں ہینڈل مار کر چلایا جاتا تھا۔ گورنمنٹ کی بسیں بہت کم تھیں۔ گورنمنٹ کی بسیں نئی تھیں اور ان کا انجن اندر ہوتا تھا۔ چھتنارے درخت کے نیچے بس اسٹینڈ تھا۔ جب بس آتی تو میں ناک پر اُنگلی رکھ کر اماں سے کہتا، "اماں چپٹی ناک والی بس آئی۔" اور بس دیکھنے بھاگتا۔ دوسرے بچے اپنا کھیل چھوڑ کر گیٹ کی طرف دوڑ لگاتے۔ ایس ٹی بسیں ڈیزل سے چلتی تھیں اور بار بار چھینکتی تھیں۔ یہ مجھے اچھا لگتا تھا۔

داہنی طرف فاریسٹ محکمے کا آفس بھی تھا اور رینجر صاحب کا بنگلہ بھی۔ کبھی کبھی ہم ان کے بچوں کے ساتھ کھیلنے چلے جاتے۔ ایک بار میں اُن کے بنگلے میں بہت اندر تک چلا گیا تو میں نے دیکھا رینجر صاحب کی بیگم چڈی پہن رہی تھیں، یعنی جانگیہ! میں دروازے کی آڑ میں کھڑا حیرت سے دیکھتا رہا۔ میرے تئیں چڈی کا تعلق بچوں سے تھا نہ کہ بڑوں سے، اور بچے چڈی پہنتے اور اُتارتے تھے۔ تو پھر کیا رینجر صاحب کی بیگم پگلا گئی تھیں۔ میں نے والدہ سے ذکر کیا۔ انھوں نے میرے سر پر ٹیپو مار کر مجھے بھگا دیا۔ بہن سے ذکر کیا تو اس نے اتنی زور سے میرا گال کُچا توڑا کہ آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

والدہ کی ڈلیوری کے وقت کام کاج کے لیے ایک لڑکی سکینہ کو لایا گیا۔ ابا اکثر گھر میں رینجر صاحب کی بات کرتے، فاریسٹ کی بات کرتے، شیر اور ہرن کی بات کرتے۔ میں بڑی دلچسپی سے سنتا اور سوچتا کاش! ابا رینجر ہوتے، اتنا تو مجھے پتہ چل ہی گیا تھا کہ فاریسٹ کا مطلب ہوتا ہے جنگل۔ لیکن جنگل کیسا ہوتا ہے؟ پتہ نہیں تھا۔

میں نے ایک بار سکینہ سے جنگل کے بارے میں پوچھا تو وہ ٹال گئی۔ سکینہ ایک دن باتھ روم میں

نہا رہی تھی، مجھے آواز دے کر ٹاول لانے کے لیے کہا، میں ٹاول دینے گیا تو بولی "چھوٹو! تجھے جنگل دیکھنا ہے؟"

"ہاں... ہاں" میں نے کہا۔

"یہ دیکھ جنگل۔" سکینہ نے فوراً اپنی جانگھوں کے درمیان کا جنگل دکھادیا اور ہنسنے لگی۔ میں جانتا تھا کہ سکینہ جھوٹی ہے کیونکہ جنگل میں تو شیر چیتے رہتے ہیں! میں نے سکینہ سے کُٹّی لے لی اور دھمکی دی کہ یہ بات ابا سے کہہ دوں گا۔ اس نے مجھے گود میں لے کر پیار کیا اور مجھے منایا تو ہماری کُٹّی سے مٹھی ہوگئی۔

میں نے جھٹ اس کا کمر بند جو قمیض کے نیچے لٹک رہا تھا پکڑ لیا اور پوچھا "کھینچوں" وہ چھڑانے لگی تو میں نے کہا، "پہلے شکر ہاتھ پر رکھو تو چھوڑوں گا۔"

۱۹۷۳ء

گوندیا میں شراب کی ہول سیل دکان پر مجھے چالیس روپے کا غبن کرتے ہوئے پکڑا گیا اور کام سے نکالا گیا، "یہ لو تمھاری تنخواہ، کل سے کام پر نہیں آنا۔"

ایک بار بغیر ٹکٹ گوندیا سے کامٹی چلا گیا۔ میں اسٹیشن پر پچھلے گیٹ سے نکلنا چاہتا تھا کہ ٹکٹ چیکر نے پکڑ لیا۔ جرمانہ بھرنے کے لیے کہا۔ میں نے کہا، "پیسے نہیں ہیں اس لیے تو بغیر ٹکٹ ہوں۔" بعد میں اعجاز ملک کا نام لیا جو ریلوے کے لیے فٹ بال کھیلتے تھے۔ آدھ گھنٹے کی ماتھا پچی کے بعد چیکر نے چھوڑ دیا۔

اعجاز ملک کے گھر گیا تو پتہ چلا کہ وہ اپنی ٹیچر بیوی کے پاس ممبئی میں اندھیری گئے ہیں۔ ان کے بھائی مختار نے مجھے چائے پلائی جو میرا کالج فیلو تھا۔ پھر وہاں سے میں غیور جعفری کے پاس گیا جو جبلپور روڈ پر موٹر گاڑیوں کے پہیوں میں ہوا بھرنے اور پنکچر بنانے کا کام کرتا تھا۔ ان دنوں نشتر بھنڈارہ میں تھا۔ غیور جعفری نے مجھے ہکلا ہکلا کر غزلیں سنائیں اور دو تین مرتبہ چائے بھی پلائی اور سگریٹ بھی۔ میں جیسے ہی اس کے اشعار پر داد دیتا تو فوراً سگریٹ منگواتا۔ ایک گھنٹے بعد وہاں اقبال اشہر آیا۔ وہ کافی تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ کامٹی کے بڑے میدان سے ایک گورے (بچھڑے) کو پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا مگر وہ اس کے ہاتھ نہ لگا۔ ہانپتا ہوا وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ چائے والے سے پانی منگوا کر پیا۔ دھوپ تیز تھی۔ پسینہ خوب نکل رہا تھا۔ اس نے چائے منگوائی اور بولا، "اچھا گورا تھا۔ سالے نے دوڑا دوڑا کر تھکا دیا۔" اقبال اس گورے کو ذبح کر کے کاٹ چھیل کر اپنی دکان پر فروخت کرنے والا تھا۔ (پچھلے برس اس کی شاعری کا مجموعہ مدحت الاختر کی کوششوں سے شائع ہوگیا ہے۔) اقبال اشہر اور غیور جعفری دونوں اچھے شاعر تھے، دونوں کا انتقال ہوگیا ہے۔ پچھلے دنوں کامٹی گیا تو اقبال کا لمبا تڑنگا لڑکا ملا اور اس نے ایک ڈائری میرے سامنے رکھی، ڈائری میں میرے ہاتھ سے لکھی تحریر تھی۔ کچھ دیر تک تو دیکھتا رہا، پھر یاد آیا کہ ڈائری میں نے اقبال کو غزلیں لکھنے کے لیے دی تھی۔

اقبال نے مجھے دس روپے دیے۔ میں بس سے ناگپور گیا۔ بہن کے یہاں مرچی بازار، بہن مجھے ہمیشہ جیب خرچ دیتی تھی۔ وہ محلّے بھر کے کپڑے سلائی مشین پر سیتی۔ دولھے بھائی (بہنوئی) کپڑا میل میں پہلے

چوکیدار پھر صاحب کی گاڑی کے ڈرائیور بنے۔
ایک بار جب میں نے دولہے بھائی سے پیسے ادھار مانگے تو انھوں نے مجھے خوب ڈانٹ پلائی اور کہا، ”کام نہیں ملتا تو مزدوری کر۔“
میں نے کہا،”دولہے بھائی، وہ بھی نہیں کر سکتا۔“
چڑ کر بولے،”تو پھر گانڈ مرا۔“ اور غصے میں پاؤں پٹکتے گھر سے باہر نکل گئے۔
میری آنکھوں میں کبھی آنسو نہ آتے تھے۔ کالج کے ڈرامے میں گلیسرین لگا کر بھی میں رو نہ پاتا تھا لیکن دولہے بھائی کی بات سینے میں خنجر کی طرح چبھی اور میں رو پڑا۔ بہن نے آنسو پونچھے اور میری جیب میں بیس روپے کی تین نوٹیں ٹھونس دیں۔
بس پھر کیا تھا، ساٹھ روپے کیا جیب میں آئے کہ کالر ٹائیٹ ہوگئی۔ میں رونا بھول کر سائیکل پر سوار مومن پورہ بھاگا جہاں اس رات پہلی بار جدید شاعروں کا مشاعرہ ہو رہا تھا۔ باہر سے آئے شاعروں کو محمد علی سرائے میں ٹھہرایا گیا تھا۔ ہوٹل کے مالک سلیم بیگ، محمد علی سرائے والی ہوٹل 'آرادھنا' میں شاعروں کی خاطر تواضع میں لگے ہوئے تھے۔ سلیم بیگ بڑے مخلص انسان ہیں۔ انھوں نے ہوٹل کے کاؤنٹر پر بیٹھے بیٹھے کئی لوگوں کو شاعر بنا دیا۔ انھیں خوب سارے اشعار یاد تھے۔ ان کی ہوٹل کی بریانی سارے علاقے میں مشہور تھی۔
ان دنوں شاہد کبیر اور مدحت الاختر نے مل کر جدید شاعری کا ایک انتخاب چاروں اور شائع کیا تھا جس کا دیدہ زیب سرورق صادق نے بنایا تھا۔ وہ اس وقت صادق مولی ہوا کرتے تھے۔ جدید مشاعرہ محمد علی سرائے کے ایک بڑے کمرے میں تھا۔ شرف الدین ساحل منتظم اعلیٰ تھے۔ ممبئی سے ندا فاضلی ممتاز راشد، ناندیڑ سے صادق، اورنگ آباد سے بشر نواز اور ناگپور کے مقامی شعرا شاہد، مدحت اور نشتر کے علاوہ ضیا انصاری، ظفر کلیم بھی تھے۔ صادق اور میں اتنی جلدی گھل مل گئے کہ جیسے برسوں کے دوست ہوں۔ ہم ”ڈرینیج میں گرا ہوا قلم“ پر بحث کر رہے تھے لیکن بعد میں صادق نے ایسی اجنبیت کا اظہار کیا جیسے کبھی ملے ہی نہ تھے۔
مشاعرہ کامیاب رہا۔ مشاعرہ ختم ہوا تو ہماری محفل شروع ہوئی۔ شعرا کے لیے شاہد کبیر کے کسی امیر دوست نے شراب منگوائی اور شاعروں نے خوب چھک کر پی۔ بشر نواز نے تو اتنی پی لی کہ وہ بعد میں شاہد کبیر سے اصرار پر اصرار کرنے لگے۔ ”مجھے گنگا جمنا لے چل۔“

گوا میں مڈگاؤں سے ناگپور کے لیے مہاراشٹرا ایکسپریس چلتا تھا، یہ ٹرین کافی مسافت طے کرتی ہے، کبھی ایکسپریس بن جاتی ہے تو کبھی پیسنجر۔ ابا کا انتقال ہوا، میں منھ نہ دیکھ سکا۔ نہ جنازے کو کندھا دے سکا۔ کینٹین مینجر نے تار میرے ہاتھ میں دیا، ایک ہفتہ پہلے ابا کا انتقال ہو چکا تھا۔ مینجر بولا ”اب جا کر کیا کرو گے؟ چالیسویں پر جانا۔“ انور قمر کا فون آیا، میں نے انھیں بتایا تو چہلم پر ناگپور جانے کی رائے دی۔
ابا کے چہلم پر جانے نکلا اور ایک دن بعد گوندیا پہنچا۔
کینٹین میں رہتے ہوئے مجھے موسم اور تہواروں کا علم نہیں ہوتا تھا۔ ایک موسم باہر چلتا تھا، ایک کینٹین میں

چلتا تھا اور ایک موسم میرے دل کے اندر چلتا رہتا تھا۔کمپنی ورکرز کو پتہ چل گیا تھا کہ میں مسلم ہوں، وہ مجھے مذاق میں کٹ پیس کہتے تھے۔ایک ورکر گائیکواڑ تو ہنس ہنس کر چڑھاتا تھا۔

"سلام والے کم... مار سالے کو"

گوندیا جانے نکلا، جیسے جیسے ٹرین آگے بڑھی، میں سردی سے کانپنے لگا۔کیسل راک کا اسٹیشن آیا تو سردی مزید بڑھ گئی۔ باہر اونچی اونچی پہاڑیاں ان کے آبشار اور گھپ اندھیرا! ٹرین کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں مگر میں سردی سے کانپ رہا تھا۔میں نے نائر صاحب کا دیا ہوا مہین شرٹ پہن رکھا تھا۔میرے پاس نہ سوئیٹر تھا نہ چادر! جیب میں چار مینار سگریٹ تھی جو سوئیٹر بھی تھی اور چادر بھی۔میں نے چار مینار جلائی اور دو بھرپور کش لیے ہی تھے کہ سارے ڈبے والے جو اونگھ رہے تھے جاگ کر کھانسنے لگے اور "بند کر سگریٹ... بند کر سگریٹ" کہتے ہوئے مجھ پر پل پڑے۔

گوندیا پہنچا تو بھائی صاحب نے کہا "کہاں تو نوکری کرتا ہے؟ کیسی ہے نوکری تیری؟ باپ مر گیا، تجھے آنے کی فرصت نہیں۔"

ماں گلے لگ کر روئی اور بولی کہ صبح سے کوا کائیں کائیں کر رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ تُو آئے گا۔

دوسرے دن صبح میں ایک شخص کے ساتھ قبرستان گیا، وہاں گورکن نے مجھ سے کہا "میں مرحوم کے قبر کی مٹی چاروں طرف سے سمیٹ کر ٹھیک کر دیتا ہوں لیکن محنتانہ دینا ہوگا۔"

میں نے حامی بھر لی۔ ابا کی بات یاد آئی۔ وہ گوا آنا چاہتے تھے کہتے تھے ٹکٹ کا پیسہ دے دینا۔ یہ بات جیسے ہی یاد آئی میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

دوسرے دن سائیکل پر سوار گورکن مجھے بازار میں ملا اور اپنا محنتانہ بیس روپے مانگنے لگا۔میرے پاس پیسے نہیں تھے! میں نے اسے رُکنے کے لیے کہا تو وہ بولا "میں سب سمجھ گیا، ٹھیک ہے مت دو پیسے، خدمت کا اجر مجھے مرحوم کی دعا سے اللہ دے گا۔" اور اتنا کہہ کر وہ غصے میں زور زور سے سائیکل کے پیڈل مارتا چلا گیا۔

مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

ضمیر نے ملامت کی... اچھا ہی ہوا۔

میں ہمیشہ جیٹھ کے بھروسے پیٹ پالنے کی بات جو کرتا تھا۔

۱۹۷۷ء

گوا جانے کا وقت آیا تو پیسے نہیں، انور قمر کو خط لکھا وہ ناراض ہوئے، پیسہ آیا تو گوا گیا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ مدہوش بلگرامی کا بھانجہ علی میری جگہ کام کر رہا ہے۔ علی مجھے اپنے گھر کی نوکرانیوں پر ہاتھ صاف کرنے کی کہانیاں سناتا۔

نائر نے مجھے پونڈا (گوا) کی مینفیلڈ ٹائر کمپنی میں بھیج دیا۔ وہاں رات کی شفٹ میں ڈیوٹی ملی۔ پانڈے صاحب مینجر تھے۔کمپنی کے گیٹ کے سامنے ایک گاؤں تھا۔ وہاں ایک کمرہ رہنے کے لیے کرائے پر ملا۔

رات بھر ڈیوٹی کرتا اور دن میں سوتا۔

عجب حال تھا۔ وہاں انور قمر اور سلام بن رزاق بھی آئے۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور اس میں خرّاٹے بھر رہا تھا۔ اُنھوں نے دیکھا سالے بکھرے پڑے ہیں اور میں سویا ہوں۔ میں اتنی گہری نیند میں تھا کہ اُنھوں نے جگانا مناسب نہ سمجھا، میں ان سے دو بات بھی نہ کر سکا۔

کمرے کا دروازہ پورا بند نہیں ہوتا تھا۔ ذرا کلکلا بھڑا ہوا رہتا تھا اور بڑی سی جھری سے مکان مالک کی ایک لڑکی جھانکتی رہتی تھی۔ مجھے کسی فیکٹری ورکر نے بتایا تھا کہ مکان مالک اور اس کی بیوی بہن بھائی ہیں۔ میں چونک گیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ جھری سے جھانکنے والی لڑکی بدمعاش ہے اور یہ کہ تو اس کے چکر میں مت پڑ!"

اور پھر اس ورکر نے مجھے ایک بڑی عجیب بات بتائی کہ اس کی دو لڑکیوں میں سے ایک لڑکی ناکان ہے۔ ناکان کا مطلب مجھے نہیں معلوم تھا۔ میں نے پوچھا "ناکان... ناکان کیا ہوتی ہے؟"

وہ بولا، "جسے سوراخ نہیں ہوتا!"

(جاری)

■■

جتیندر بلّو

دیکھو ہم نے کیسے بسر کی

(جلد دوئم، تیسری قسط)

عمر بڑھ رہی تھی۔ شب و روز تیزی سے گزر رہے تھے۔ دن تو ریسٹورٹ کے کام کاج میں بیت جاتا لیکن شام ہوتے ہی اکیلا پن اور تنہائی قدم بہ قدم ساتھ چلا کرتے۔ ایسا لگتا کہ لندن شہر بہت بڑا قبرستان ہے۔ تیز گام، بھاگتے دوڑتے لوگ کام سے فارغ ہو کر، اپنی اپنی صلیب اُٹھائے قبرستان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اُن میں بندہ بھی شامل ہے۔ میں نے چند نام نہاد دوست ضرور بنا لیے تھے، اُن میں حسین جوان عورتیں بھی شامل تھیں۔ مگر ہر کسی نے خود کو اپنی ذات میں بند کر کے چابی سمندر میں پھینک رکھی تھی۔ کوئی کسی دوسرے کے جذبات میں شریک ہو کر اُس کا کوئی مسئلہ حل کرنے کو آمادہ نہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں پورا معاشرہ ایک ہی روایت سے جُڑا ہوا تھا۔ ''یا شیخ اپنی اپنی دیکھ'' وہ نام نہاد دوست اور آشنا اگر مجھ سے ملا بھی کرتے تو محض وقت گزارنے کے واسطے، پھر اپنی اپنی راہ چل دیتے۔ یوں تو میں انگلستان کے مادی معاشرے کو اپنے سابقہ دورے میں قریب قریب جان چکا تھا۔ مگر اکیلا پن تھا کہ وہ میری رگوں پہ سوار میرا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ ایک ہی آواز میرے باطن سے بدستور آیا کرتی کہ میرے حالات اور مسائل کا واحد حل ''ایک سے دو ہونا'' ہے۔ لیکن میری سوچ کا تقاضا یہ بھی رہا تھا کہ میں کسی مغربی عورت کو اپنا شریک حیات نہ بناؤں۔ گو کہ میں اس قوم کے خلاف ہرگز نہیں تھا۔ جبکہ اس اینگلوسیکسن قوم نے دنیا کے ہر براعظم میں اپنی نو آبادیاں قائم کی تھیں۔ وہاں کے عوام اور قدرتی وسائل کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا تھا اور اپنی تجوریاں بھر کر امیر کبیر بنے تھے۔ جاگیردارانہ اور زمین دارانہ نظام قائم کر کے بے کس کسانوں کا استحصال کیا تھا، جو آج بھی پاکستان جیسے ملک میں جاری و ساری ہے۔ مگر دوسری طرف اِن فرنگیوں نے مثبت کاموں کی داغ بیل بھی ڈالی تھی۔ جسے نظر انداز کرنا سراسر ناانصافی ہوگی۔ اُنھوں نے علم کی روشنی ہر سو پھیلائی۔ تعلیم کا نظام قائم کیا۔ اسکول، کالج اور یونی ورسٹیاں وجود

میں آئیں۔ جدید میڈیکل علاج کی بنیاد رکھ کر ہسپتال تعمیر کیے۔ میڈیکل کالج میں تربیت کے ذریعے اَن گنت ڈاکٹر دنیا کو دیے۔ ذاتی کاروبار اور عوام کی سہولت کی خاطر خود ساختہ ریل گاڑی کے سفر کا چلن عام کیا۔ اور سب سے اہم اور بڑی بات، ان کا دنیا بھر میں جمہوریت کے پرچم کو لہرانا تھا۔ ورنہ ہر خطے میں بادشاہ، شہنشاہ، آمر، سلطان، راجے مہاراجے حکمراں تھے۔ اُن کا کہا حرفِ آخر ثابت ہوا کرتا تھا۔ اگر کوئی شخص حکم عدولی کرتا یا اعتراض تو اُس کی گردن تن سے الگ کردی جاتی۔ یا کھوپڑیوں کے مینار کھڑے کیے جاتے۔ فرنگیوں کے تمام منفی اور مثبت اقدام اپنی جگہ۔ لیکن میں کسی مغربی عورت کو اپنی زندگی کا ہمسفر بنانے کے حق میں اس سبب نہیں تھا کہ الگ الگ نوعیت کی طرزِ زندگی، رہن سہن، زبان، کھانا پینا، سوچ اور سب سے اہم بات رنگ برنگے بچے؟ وہ کس مذہب اور کلچر کے سہارے پروان چڑھیں گے؟ اس طرح کے کئی سوال دیر سے میرے ذہن میں اٹکے ہوئے تھے۔ لہٰذا میں نے ۱۲؍جون ۱۹۷۶ء کو ایک ہندوستانی نژاد عورت سے رجسٹرار کے دفتر میں، چند روائتی جملے بول کر بیاہ رچالیا۔ اُس کا نام پولا میئر تھا۔ وہ ذات کی ویش تھی، جبکہ میں کھتری تھا لیکن میں ذات پات کے دائروں سے کب کا آزاد ہو چکا تھا۔ میری نظر میں کوئی چھوٹا بڑا نہ تھا۔ دنیا کے تمام لوگ ایک سا مقام رکھتے تھے اور میں خوش تھا۔ پولا کے والدین دہوں پہلے ہندوستان کے غیر منقسم پنجاب سے افریقہ ہجرت کر گئے تھے۔ والد ماجد کا تعلق نور محل شہر سے تھا۔ جبکہ میری خوش دامن صاحبہ لودھیوں کے بسائے ہوئے شہر لدھیانہ سے تھیں۔ اُن کے ہاں تین لڑکیاں اوپر تلے پیدا ہوئیں۔ پھر دو بیٹے۔ میرے حصے میں اُن کی سب سے چھوٹی بیٹی آئی تھی۔ اُن کے تمام بچے افریقہ کے ملک ٹانگانیکا (موجودہ تنزانیا) میں پیدا ہوئے اور وہیں اُنھوں نے تعلیم حاصل کی لیکن آگے چل کر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اُس پریوار کو دیگر اَن گنت ایشیائیوں کی طرح افریقہ کو خیر باد کہنا پڑا۔ درحقیقت مغربی ملکوں نے اپنی جنگی طاقت کی بنیاد پر افریقہ کو فتح کرکے وہاں اپنی نوآبادیاں قائم کر رکھی تھیں۔ مشرقی ممالک یوگینڈا، کینیا، ٹانگانیکا اور صومالیہ میں سلطنتِ برطانیہ کی حکمرانی تھی۔ جبکہ مغربی ممالک گنی، مالی اور سیرالائن فرانسیسیوں کے زیرِ حکومت تھے۔ پھر ملک بیلجیم کیوں پیچھے رہتا۔ اُس نے بھی مرکزی ممالک راوانڈا اور برونڈی ہتھیا لیے تھے۔ رہی سہی کسر ڈچ لوگوں نے ساؤتھ افریقہ کو انگریزوں سے بوئیر وار (Boer war) میں فتح کرکے پوری کرڈالی تھی۔ لیکن دوسری جنگِ عظیم کے بعد مغربی طاقتیں اپنے اندرونِ خانہ کھوکھلی ہوئی جارہی تھیں۔ افریقی عوام میں جذبۂ آزادی اس قدر بیدار ہو چکا تھا کہ وہ آزادی کے متوالے مرمٹنے کو تیار تھے۔ جمبو کنیا ٹا کی ماؤ ماؤ تحریک نے سلطنتِ برطانیہ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ انجام کار ملک کینیا، یوگینڈا، ٹانگانیکا، نائجیریا اور صومالیہ وقفے وقفے سے آزاد ہوئے۔ مگر وہاں کی آباد ایشیائی برادری کو زیادہ خوشی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے کہ اب اُن کے مالک بدل گئے تھے۔ پہلے سفید فام مالک تھے۔ اب سیاہ فام۔ ایشیائی بندے خود کو افریقیوں سے برتر تصور کیا کرتے تھے۔ اُن کے گھروں اور دکانوں کے ملازم بھی سیاہ افریقی تھے۔ وہ لوگ بھی ایشیائی برادری کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا کرتے تھے، لیکن مجبور تھے۔ ناپسندیدگی کی اہم وجہ معیشت تھی جو ایشیائی تاجروں کے ہاتھوں میں تھی۔ روزمرہ کا پرچونی اور تھوک کاروبار بھی ایشیائی برادری نے سنبھال رکھا تھا۔ لاوا اندر ہی اندر مدت سے پک رہا تھا۔ اور جب اُن ملکوں میں

یہ نعرہ "افریقہ، محض افریقی عوام کے واسطے" شدت اختیار کر بیٹھا تو مار دھاڑ کی وارداتیں عام ہونے لگیں۔ قتل و غارت بھی اپنے رنگ دکھانے لگا۔ ایشیائی برادری کے واسطے زمین تنگ ہوتی چلی گئی۔ میری بیوی کے خاندان نے انگلینڈ ہجرت کرنے میں ہی اپنی عافیت جانی۔ چونکہ اُس خانوادے کے بھی افراد برٹش سبجیکٹ (British Subject) تھے۔ اُنھیں انگلینڈ چلے آنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ اُن کے خانوادے کو دیگر نو وارد ایشیائی خاندانوں کے ساتھ حکومت برطانیہ نے بسانے میں ہر طرح کا ثبوت دیا۔ اور وہ جلد ہی مرکزی دھارے کا حصہ بن گئے۔

میں اور پولکا کورٹ شپ کے دوران قریب قریب ہر شام کو ملا کرتے تھے۔ میں نے کھلے لفظوں میں اُسے واضح کر دیا تھا کہ میری سب سے بری کمزوری لکھنا پڑھنا ہے۔ ایک عدد ناول لکھ چکا ہوں وہ عنقریب انڈیا سے شائع ہونے والا ہے۔ آئندہ بھی لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ میں ایک شوہر کی حیثیت سے گھریلو ذمہ داریوں کو کبھی نظر انداز نہیں کروں گا۔ بلکہ گھر کے کام کاج کو اپنے لکھنے پڑھنے سے زیادہ اہمیت دوں گا۔ میں اپنے گھر کو سورگ بنا کر شانتی سے جینا چاہتا ہوں۔ پولکا میرا ہاتھ زور سے دبا کر خاموش نگاہوں سے یقین دلایا کرتی کہ وہ بھی شانتی سے جیون گزارنے کی طلب گار ہے۔ وہ کم گو تھی۔ مگر اُس کے صاف دل میں جو بھی ہوا کرتا، وہ اُس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر اُبھر آتا۔ اُسے جھوٹ، مکر و فریب، دوہرے معیار اور منافقت سے سخت نفرت تھی۔ وہ اُن لوگوں کو رتی بھر برداشت نہیں کر پاتی تھی، جو اپنی شخصیت میں اس طرح کے عناصر لیے ہوئے ہوں۔ وہ برسرِ روزگار تھی اور فوڈ منسٹری کے شعبہ میف (MEFF) میں ملازمہ تھی۔ نفاست پسند انتہائی حد تک۔ اُس کا احساس مجھے شادی کے بعد ہوا تھا۔ اتنا تو میں جانتا ہی تھا کہ قدرت نے صنفِ نازک کو صفائی ستھرائی کا وصف مردوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ عطا کر رکھا ہے۔ جب بھی میرے تحریر کردہ کاغذات میرے ارد گرد بے ترتیبی سے پھیلے ہوتے تو وہ اُن کو سمیٹتے ہوئے کہا کرتی:

"اتنا بکھیڑا تو بچے بھی نہیں ڈالا کرتے، جتنا آپ ڈالتے ہو۔ یہ کاغذ آپ کے من سے جڑے ہوئے ہیں۔ انھیں ادھر اُدھر مت پھینکا کرو۔ نہیں تو یہ روٹھ جائیں گے۔"

میں اپنی بیوی کی معصومیت اور اُس کے مخلص پن پر ہنس کر رہ جاتا۔

لندن کی پُر رونق سڑکوں پر گھومتے ہوئے شہر بمبئی میری اُنگلیاں تھامے مرے ساتھ ساتھ ہی چلا کرتا۔ کوشش کے باوجود میں اُسے خود سے الگ نہیں کر پاتا۔ چرچ گیٹ پر دوستوں کے ساتھ گزاری ہوئی حسین شامیں۔ میرین ڈرائیو کی تفریح اور ناری من پوائنٹ پر اُچھلتی، شور مچاتی لہریں۔ بلند و بالا عمارتیں، انڈیا گیٹ۔ کولابا اور جانے کیا کیا یاد آ کر رہ جاتا۔ پھر وہ تمام مجھ کو جھنجھوڑ کر کہا کرتے کہ اب اِس شہر کے ساتھ تمھارا کوئی سروکار نہیں رہا۔ اگر ہے بھی تو محض ایک سیاح کی طرح، جو چند دنوں یا ہفتوں کی غرض سے وہاں جاتا ہے۔ ان احساسات کے ساتھ کہ وہ اُس شہر کو دیکھے، سمجھے اور کھنگالے۔ پھر مقررہ وقت وہاں گزار کر وہ شہر اُس

کے لیے غیر بن جاتا ہے۔ پھر اُس شخص نے جہاں سے سفر شروع کیا تھا وہیں وہ واپس لوٹ جاتا ہے۔ سچ کے یہ تمام پہلو جان کر مجھ کو سخت کوفت ہوا کرتی۔ مگر سچ تو پھر سچ ہے۔ اُس سے مفر کہاں ممکن؟ شام کو گھر لوٹتے سمے میں اپنے خیالوں میں گُم رہتا۔ پولا مجھ سے پہلے گھر پہونچ جایا کرتی اور رات کا کھانا بنانے میں جُٹ جاتی۔ یہ احساس مجھے تنگ بھی کیا کرتا کہ چھوڑا ہوا شہر آدمی کو پریشان کیوں کرتا ہے؟ اُسے وقفے وقفے سے اپنی طرح کیوں کھینچتا رہتا ہے؟ ناسٹلجیا مجھے دن رات پریشان رکھا کرتا۔ لیکن گھر میں قدم رکھتے ہی پولا کی مسکراہٹ اور کھلتا ہوا چہرہ دیکھ کر میرے تمام مسائل خود بخود دور ہو جاتے۔ اُن دنوں ہم کرائے دار کی حیثیت سے ایک بیڈ سِٹ (Bed sit) میں مقیم تھے۔ لیکن کمرے کی چوکھٹ پار کرتے ہی میری دنیا بدل کر رہ جاتی میں اپنی نئی نویلی بیوی سے صدق دل سے پوچھا کرتا: "کہو آج کا دن کیسا گزرا؟"

لیکن ایک روز کچھ ایسا ہوا کہ بس کے سفر کے دوران گھر لوٹتے سمے جب میں یکسر خالی الخیال تھا، کئی سوالوں کے جواب اپنے آپ میرے ذہن کی سلیٹ پر خود کو لکھتے چلے گئے۔ میں اپنے لاشعور پر حیران رہ گیا۔ بلاشبہ وہ آدمی کا سب سے بڑا معاون ثابت ہوا کرتا ہے۔ منفی یا مثبت انداز میں ساتھ دیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں نے اپنی بھرپور جوانی کے سولہ برس جو شہر بمبئی کے نذر کیے تھے۔ خود کو وہاں کے ہوٹلوں اور ایرانی ریسٹورنٹوں میں چھوڑ آیا تھا۔ سڑکوں پر میرے قدموں کے انمٹ نشانات تھے۔ فلمی نگار خانوں کا میں اٹوٹ حصہ رہا تھا۔ غرض کہ میں خود کو روحانی طور پر وہاں چھوڑ آیا تھا، مگر جسمانی اعتبار سے لندن میں سانس ضرور بھر رہا تھا۔ میرا المیہ میری سمجھ میں آچکا تھا۔ مجبور کر رہا تھا کہ میں اپنی سوچ اور نظریات میں تبدیلیاں لاؤں کہ یہ وقت کا تقاضا ہے۔ ورنہ ماضی میں سدا زندہ رہنا خود کو ذہنی طور پر بیمار کرنے کے مترادف ہے۔ رفتہ رفتہ وقت کی سوئیاں گھومنے پر میرے ذہنی جالے صاف ہوتے چلے گئے اور میرے حواس صحیح سمت میں سفر کرنے لگے۔ میرے سامنے پھیلا ہوا شہر مجھے اپنے دامن میں سمیٹنے لگا اور میں اُس کا حصہ بنتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ لندن شہر اب مجھے دوسرا گھر محسوس ہونے لگا۔ اور میں اُس سے محبت کرتا چلا گیا۔

گھر گرہست کا جیون مجھے راس آنے لگا تھا۔ پولا بھی مجھ سے مطمئن تھی اور جب ہم دونوں نے دنیا کو ایک دوسرے کی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا تو ہمارے درمیان اعتبار، سمجھ بوجھ اور پیار بڑھنے لگا۔ ہر ہفتے کے ابتدائی پانچ دن تو ہمارے ملازمت کی نذر ہو جایا کرتے۔ لیکن ویک اینڈ بلا کسی مجبوری یا پابندی کے ہمارا اپنا ہوا کرتا تھا۔ شاپنگ کرنا یا لندن کے کسی نئے مقام کی تفریح کرنا یا کوئی فیملی فرینڈ مع اپنے بچوں کے ہمارے یہاں چلا آتا یا پھر کوئی ہمیں اپنے ہاں دوپہر میں یا رات کے کھانے پر مدعو کر لیتا۔ مگر اُن بچوں کے متعلق جو تجربہ مجھے ہوا وہ میرے نزدیک بالکل نیا تھا اور انوکھا بھی۔ وہ بچے ہمارے ساتھ انگریز بچوں کی طرح شستہ انگریزی زبان میں بات چیت کیا کرتے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے والدین سے بھی اُسی انداز اُسی زبان میں پیش آتے۔ مجھے تعجب اس وجہ سے ہوا کرتا کہ مجھے اُن ایشیائی اور انگریز بچوں میں کوئی فرق دکھائی نہ دیتا۔ ویسا ہی تلفظ، ویسا ہی لب و لہجہ اور ویسی ہی جملوں کی ساخت اور اُن کا استعمال بھی ایک سا تھا۔ اگر اُن بچوں کے

درمیان کوئی فرق تھا بھی تو وہ جسمانی رنگ روپ اور ذات کا تھا، ورنہ کچھ بھی نہ تھا۔ میں دانستہ اُن سے ہندستانی یا پنجابی زبان میں بات کرتا۔ محض یہ جاننے کی خاطر کہ آیا وہ اپنی مادری زبان سے کم وبیش واقف ہیں بھی یا نہیں؟ لیکن وہ جواب انگریزی زبان میں دے کر میرے شکوک کی تصدیق کیا کرتے کہ وہ اپنی مادری زبان بولنے سے کوسوں دور ہیں۔ میں میزبان یا صاحبہ خانہ سے دریافت کرنے پر مجبور ہو جاتا کہ کیا اُن کے بچے اپنی مادری زبان سے واقف نہیں ہیں یا وہ اپنی مادری زبان بولنے سے شرماتے ہیں؟ والدین کا جواب ایک ہی ہوا کرتا۔ ''ہمارے بچے سمجھتے تو سب کچھ ہیں مگر اپنی زبان بول نہیں پاتے... مگر دیکھا جائے تو ان بچوں کو اب یہیں رہنا ہے... یہ جتنی زیادہ انگلش لینگوئج جان کر یہاں کے کلچر کو قبول کریں گے، اتنی ہی آسانی اور تیزی سے یہاں کی سوسائٹی میں اپنی پوزیشن بنائیں گے۔'

لیکن میرا جواب اُن کے برعکس ہوا کرتا:

''دنیا کے ہر بچے کو اپنی مادری زبان کا جاننا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ ورنہ وہ بے جڑ کا پودا بن کر رہ جاتا ہے۔ اپنی تہذیب اور ثقافت کو جان نہیں پاتا۔ بلکہ اپنے لوگوں میں بیٹھا خود کو آوٹ سائیڈر محسوس کرتا ہے۔''

میری دو ٹوک باتوں کا اُن پر زیادہ اثر نہ ہوتا۔ لیکن میں اپنے اندرون خانہ بہت خوش تھا کہ میرے دماغ نے صحیح خطوط پر سوچنا شروع کر دیا ہے اور وہ صحیح سمت میں چل نکلا ہے۔ اس لیے کہ پچھلے دو برسوں سے میں بلکل خاموش تھا۔ میں نے ایک ٹوٹا پھوٹا جملہ تک نہ لکھا تھا۔ کبھی کبھار یہ خیال بھی گزرتا کہ میں آئندہ کچھ لکھ بھی پاؤں گا یا نہیں؟ لیکن میری خود اعتمادی برابر میرے حوصلوں کو بلند رکھتی۔ درحقیقت میں اپنی زندگی کو راہِ راست پر لانے اور اپنی شادی بیاہ کے سلسلے میں دیر تک اُلجھا رہا تھا۔ دیر آید درست آید۔

میں نے جلد ہی ایشیائی بچوں کی موجودہ نسل، اُن کی مادری بول چال اور انگریزی زبان کو ایک موضوع بنایا، اُس کے ہر پہلو پر غور کر کے اُس کا تجزیہ کیا۔ پھر ایک روز قلم اُٹھا کر اپنے ناول ''پرائی دھرتی اپنے لوگ'' اور اپنی شادی کے بعد جو پہلا افسانہ سپردِ قلم کیا، وہ ''مانگے کا اُجالا'' تھا۔ وہ اُس زمانے کے رسالے 'شمع' دہلی میں ۱۹۷۸ء کے کسی شمارے میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔ وہ کئی جہات اپنے ساتھ لیے ہوئے تھا۔ لیکن بدقسمتی سے یہ افسانہ میرے کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ سبب اُس کا یہ رہا کہ نقل مکانی کے عمل کے دوران رسالہ کہیں اوپر نیچے ہو کر رہ گیا۔ لیکن قارئین نے یہ افسانہ یقینی طور پر پسند کیا تھا۔ ورنہ 'شمع' کے اگلے شمارے میں دو دو، تین تین سطری تعریفی خط شائع نہ ہوتے۔ اُن تمام کا لب لُباب ایک ہی تھا کہ وہ ایشیائی اَن پڑھ عورتیں کتنی بدنصیب ہیں، جب وہ اپنی اولاد سے مادری زبان میں ہم کلام ہوتی ہیں۔ لیکن اُنھیں جواب اپنے بچوں سے انگریزی زبان میں ملا کرتا ہے۔ جانے اُس سمے اُن ماؤں کے دلوں پر کیا گزرتی ہوگی۔ خدا بہتر جانتا ہے۔ خطوط پڑھ کر مجھے دو چند خوشی ہوئی تھی۔ اول تو اس لیے کہ قارئین نے کہانی کے بنیادی المیے کو سمجھ کر قبول کیا تھا۔ دوئم یہ کہ میں نے برسوں بعد قلم اُٹھایا تھا۔ میری نئی صلاحیتیں، تجزیاتی قوت اور اسلوب جوں کا توں برقرار تھا۔ کوئی فرق پیدا نہ ہوا تھا۔ ورنہ اکثر سننے اور دیکھنے میں آیا ہے کہ زیادہ تر فن کار مدت مدید کے بعد جب قلم اُٹھاتے ہیں تو اُن کی تخلیق میں وہ پہلی سی شدت، گہرائی اور زبان کی پختگی دکھائی نہیں دیتی۔ مگر

قدرت مجھ پر مہربان رہی تھی اور میں تہ دل سے اُس کا شکر گزار تھا۔

اور جب قدرت کسی فن کار پر مہربان ہو، اُس کا گھریلو ماحول بھی پُر سکون ہو اور اُس کی بیوی کو اُس کے لکھنے پڑھنے پر کوئی اعتراض بھی نہ ہو تو فن کار اپنے پورے جوش، ہوش اور حواس کے ساتھ اپنی ذات اور معاشرے کو کھنگالتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کماحقہ یہی ہوا تھا۔ نئے نئے موضوعات میرے ذہن میں موجود تھے۔ وہ مجھے طبع آزمائی کرنے پر اُکسایا بھی کرتے۔ میں اُن دنوں جو بھی نئی کہانی مکمل کرتا، اُسے پاکستان میں 'سیپ' یا 'اوراق' کو بھیج دیتا۔ اور وہی کہانی ہندستان میں 'شاعر' یا 'آج کل' کی نذر کر دیتا۔ البتہ آگے چل کر میری ایک کہانی 'خدا کا رنگ' میرے نہایت قریبی دوست ساقی فاروقی کے از حد اصرار پر میں نے 'فنون' کو ضرور ارسال کی تھی۔ اُس کی پوری تفصیل میں اپنی سوانح کی پہلی جلد میں بیان کر چکا ہوں۔ اُسے یہاں دہرانا میرے واسطے اس باعث مناسب نہ ہو گا کہ میں اپنا ادبی قد بڑھانے کی خاطر کسی عظیم شخصیت کا نام اور حوالہ دے کر قاری کو مرعوب کروں۔ یہ میری فطرت کے خلاف ہے۔

میں لندن میں آباد ضرور ہو چکا تھا۔ لکھنا پڑھنا بھی جاری تھا۔ لیکن ادبی دوستوں کی کمی کا احساس شدت سے رہا کرتا۔ ادبی حلقے بھی میری دسترس سے باہر تھے۔ لے دے کے میں صرف گلشن کھنہ سے واقف تھا۔ اُس سے میرے انگلستان کے سابقہ دورے میں کئی ملاقاتیں رہی تھیں۔ وہ مہربان دوست ثابت ہوا تھا اور میرے مجموعی حالات کو دیکھتے ہوئے ہمدرد بھی۔ اُس کی ہر نئی کہانی نسلی امتیاز کے موضوع کے اردگرد گھوما کرتی۔ وہ اینگلو سیکسن قوم کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتا تھا۔ اُس کے دل و دماغ میں فرنگیوں کے واسطے کچھ زیادہ ہی نفرت پنپ رہی تھی۔ وجہ میں سمجھتا تھا کہ دو سو برسوں تک انگریز ہمارے حکمراں رہے تھے۔ اُنھوں نے جس طرح سے چاہا، ہندستانیوں کو استعمال کیا اور ہر زاویے سے اُن کا استحصال بھی کیا۔ اُس کی ایک کہانی 'مجرم کون' اُس نے مجھے سنائی تو اس نے حسبِ معمول انگریزوں کو تعصبی اور قصور وار ٹھہرایا تھا اور ایشیائی کردار بری الذمہ تھے۔ کہانی لندن کے پس منظر میں تحریر کردہ تھی۔ اُس کا موضوع اور اُس کا برتاؤ خود میں تحیر، تجسس اور دلچسپی لیے ہوئے تھے۔ میں نے دوستانہ سطح پر اُسے مشورہ دیا کہ کلائی میکس کو اُلٹا کر دو۔ کہانی کا اثر دوبالا ہو جائے گا۔ انگریزوں کے بجائے ایشیائی کرداروں کو قصور وار ٹھہراؤ۔ کہانی ایک نیا موڑ اختیار کر لے گی۔ موصوف کا ایسا کرنے سے کہانی یادگار بن کر رہ گئی۔ اُس کا حوالہ گلشن کھنہ کے فن سے ہمیشہ جڑا رہتا ہے۔ اُسے بھی کئی افسانہ نگاروں کی طرح منہ کا ذائقہ بدلنے کی خاطر شعر کہنے کا مرض ہے۔ مگر وہ شاعر کم، کہانی کار زیادہ ہے۔

ایک ڈھلتی دوپہر کو میں اپنے ریسٹورنٹ میں چائے کے کاؤنٹر پر ویٹرس کے آرڈر نکلوا رہا تھا کہ اچانک گیت کار سوہن راہی ایک اجنبی کے ساتھ مرے روبرو چلا آیا۔ اُس کا دفتر ہمارے ریسٹورنٹ کے قریب ہی تھا۔ وہ بی بی سی (BBC) میں نقشہ نویس کی حیثیت سے ملازم تھا۔ کبھی کبھی مجھ سے لنچ ٹائم میں ملنے کو چلا آتا۔ اُس کے ہمراہ جو شخص تھا، وہ شاعر راج کھیتی تھا۔ شعر و شاعری کے علاوہ وہ شخص سنگیت ودیا کا بھی بھرپور گیان رکھتا تھا۔ وہ مشاعروں میں جب غزل سرا ہوتا تو اپنے ترنم سے اشعار کا جادو جگا دیتا۔ اُس کی وفات تک

میرے اُس کے تعلقات مخلصانہ، برادرانہ اور ادیبانہ رہے۔ اعلیٰ ذوق اور ذہانت رکھنے کے کارن اُس کے فن میں پختگی تھی۔ وہ میرے ساتھ مشترکہ ایک ناول لکھنے کا آرزومند تھا۔ لیکن طرح طرح کی امراض نے اُسے اندر سے کھوکھلا کر رکھا تھا۔ لہٰذا اُس کی خواہش دل میں ہی رہ گئی۔ اُس کا ایک شعر میں بھول نہیں پاتا۔

دُعا بھی مجھ کو زمانے کی بددُعا سی لگے ۔۔۔ یہ زندگی تو مجھے اب کوئی سزا سی لگے

میرے دوست سوہن راہی کے ہاتھ اُس کی پیدائش سے ہی لمبے رہے ہیں۔ وقت کے گزرنے پر وہ مزید لمبے ہو گئے ہیں اور اُنھوں نے ادبی میدان میں اُس کی ذاتی راہیں بھی ہموار کی ہیں، خواہ وہ کتنی بھی کھوٹی کیوں نہ رہی ہوں؟ اُسی کے اثر و رسوخ اور تعلقات کی بنا پر میں بی بی سی اُردو سروس کے پروڈیوسر جناب راشد اشرف تک پہنچا تھا۔ وہ زمانہ ۱۹۷۷ء کا اختتام تھا۔ مقررہ وقت پر راشد اشرف فارن سروس کی عمارت بش ہاؤس کی بار (BAR) میں ہمارا منتظر تھا۔ شام کا وقت تھا۔ الگ الگ زبانوں کے کارکن دن بھر کی ذہنی تھکن دور کرتے ہوئے پی پلا رہے تھے۔ ہم نے بھی ایک چھوٹی بیئر سے دل بہلایا۔ ماحول نہایت خوشگوار تھا۔ سوہن راہی نے بڑھا چڑھا کر راشد اشرف سے میری کہانیوں اور میرے فن کی تعریف کی۔ وہ میرے نام سے ضرور واقف تھا لیکن کام سے نہیں۔ میں 'شب خون' کا ایک رسالہ ساتھ لے کر گیا تھا، جس میں میری کہانی 'پہچان کی نوک پر' بھی شامل تھی۔ میں نے راشد اشرف کو نہایت مہذب اور ہمدرد پایا تھا۔ تکبر کا احساس اُس کی باتوں سے ذرا بھی نمایاں نہ تھا۔ میں نے وہ رسالہ اُس کے حوالے کر دیا کہ وہ کہانی پڑھ کر میری فنی صلاحیتوں کے ساتھ میرا اسلوب، میری زبان اور میرے نظریات کو بھی جان پائے۔

دو روز کے بعد راشد اشرف کے دفتر میں اُس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑا کر اُردو سروس کا ماحول جاننا چاہ رہا تھا کہ راشد صاحب کی آواز پر چونک اُٹھا:

''جتیندر صاحب۔ آپ کا قلم خوب چلتا ہے... لیکن فی الحال اردو سیکشن میں نہ تو نوکری کی کوئی گنجائش ہے اور نہ ہی چھوٹے موٹے کام کی... ویسے یہاں زیادہ تر کام ترجمے کا ہوتا ہے... مجھے علم نہیں کہ آپ ترجمے کے فن سے واقف ہیں یا نہیں؟''

''جناب میں رو دھو کر ترجمہ کر ہی لیتا ہوں۔''

اُس نے میرے جملے کا لطف اُٹھایا اور بولا:

''یہ تو اچھی بات ہے... مگر آپ کو تو علم ہی ہے کہ اردو پاکستان کی سرکاری زبان ہے... اس ادارے میں کام کرنے والے زیادہ تر وہیں کے ہیں... پھر آپ کا تعلق تو بھارت سے ہے۔''

اشارہ میرے لیے کافی تھا کہ اردو سیکشن کلوز شاپ ہے۔ یہاں کسی غیر مسلم کا داخل ہونا مشکل ہی نظر آتا ہے۔

''اگر آپ کہیں تو میں آپ کو ہندی سیکشن میں لے چلتا ہوں۔ وہاں کوئی نہ کوئی کام تو نکل ہی آئے گا؟''

''مگر راشد صاحب، میں ہندی لپی سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔ پڑھ تو لیتا ہوں، مگر اُسے لکھنے میں دقت ہوتی ہے۔''

"بہرحال آپ چلو تو سہی۔"
ہندی سیکشن کے انچارج مسٹر بہادڑی تھے۔ وہ اُس زمانے کی معروف فلمی اداکارہ جیا بہادری کے حقیقی چچا تھے۔ راشد اشرف مجھے وہاں پہنچا کر اور میرا تعارف توصیفی جملوں میں کروا کر چلا گیا۔ بہادڑی صاحب پندرہ بیس منٹوں تک بالی ووڈ اور ہندی کے ادیبوں کے بارے میں بات چیت کرتے رہے۔ پھر میز کی ایک دراز کھول کر چند کاغذات نکالے اور اُنھیں چھانٹ کر انگریزی زبان میں تحریر کردہ چار مضامین میری طرف بڑھا کر بولے:

"آپ ان کا انوواد (ترجمہ) کر کے لے آئیں۔"

"جناب میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں۔ مجھے ہندی لکھتے ہوئے مشکل ہوتی ہے۔"

"آپ چاہیں تو اِن سب کو اردو میں لکھ کر لائیں۔ انھیں نشر بھی تو آپ ہی کو کرنے ہیں۔"

وقت نکال کر میں نے ترجمے کا کام نہایت محتاط، مگر ہنر مندی سے مکمل کیا۔ اس اُمید پر کہ آئندہ بھی کام ملتا رہے گا۔ پھر کون جانے کبھی کوئی آسامی خالی ہوئی تو؟ اگلا مرحلہ ترجموں کو بہادڑی صاحب کو سُنا کر اُن کی تصدیق کرانی تھی۔ موصوف نے ہر ترجمہ بڑے غور سے سُنا اور میرے کام کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ کہیں کہیں اردو کا کوئی ثقیل لفظ آسان ہندی میں بدلوا دیا۔ اگلا مرحلہ نشریت کا تھا۔ سو شام میں اپنے کام سے فارغ ہو کر میں بُش ہاؤس پہنچ کر روزانہ ایک ترجمہ نشر کیا کرتا تھا۔ تمام مراحل جب طے پا گئے تو مجھے معاوضے اور محنتانے کا بے صبری سے انتظار رہنے لگا۔ پھر ایک صبح چیک بھی آ گیا۔ خوشی خوشی لفافہ چاک کیا۔ دل کی دھڑکنیں اوپر نیچے ہوئی جا رہی تھیں۔ کل رقم گیارہ پونڈ پچاسی پینس چیک کی صورت میں میرے سامنے تھی۔ یعنی فی ترجمہ تین پونڈ کے لگ بھگ تھا۔ جبکہ میری توقع کل ملا کر تیس پینتیس پونڈ سے کم کی نہ تھی۔ سخت مایوسی ہوئی۔ ایک بار تو من میں آیا کہ چیک کو پھاڑ کر، اس کے ٹکڑے ہوا میں اُچھال دوں۔ اس لیے کہ اتنے پیسے تو میں نے آنے جانے میں اور بسوں کی ٹکٹوں پر خرچ کر ڈالے تھے۔ دماغ سوزی الگ سے کی تھی۔ اُس پل مجھے اردو زبان کا ایک مشہور قول یاد آ کر رہ گیا:

باز آیا میں ایسی محبت سے

دو تین روز میں جب میرے اندر کی کڑواہٹ دور ہو گئی اور میرے جذبات معمول پر آ گئے تو بہادڑی صاحب سے فون پر بات ہوئی۔ اُن کا جواب سیدھا سادا سا تھا: "بھئی جتیندر تمھاری شکایت اپنی جگہ بلکل ٹھیک ہے... مگر کیا کیا جائے یہ ادارہ کمرشل نہیں ہے۔ گورنمنٹ کے فنڈز پر چلتا ہے... یہاں لوگ دل کا شوق پورا کرنے اور اپنی آواز کو ریڈیو پر سننے کو چلے آتے ہیں... آگے بھی کام کی ضرورت ہو، تو چلے آنا۔"

لیکن میں نے بی بی سی بُش ہاؤس کا دروازہ پھر کبھی نہ دیکھا۔

کرائے کے مکانوں میں رہ رہ کر اور ہر ہفتے کرائے ادا کرتے کرتے میں اور میری بیوی تھک چکے تھے۔ خواہش مند تھے کہ ہمارے سروں پر ہماری اپنی چھت ہو۔ دیواریں بھی اپنی ہوں۔ ہمارے گھر آنے

جانے پر کوئی پابندی، بندش اور کرفیو عائد نہ ہو۔ تالہ بھی اپنا ہو اور تالی بھی۔ ہم دونوں چونکہ برسرِ روزگار تھے، اپنا اپنا پیٹ قدرے کاٹ کر جب مکان خریدنے کے قابل ہو گئے تو تلاش بسیار کے بعد اپنی پسند کا دو بیڈ روم فلیٹ ہماری ملکیت بن گیا۔ وہ فلیٹ لندن کے علاقے ایکٹن میں واقع تھا۔ اُسے خوبصورت بنانے اور اُس کی آرائش و زیبائش میں پولکا کا ہاتھ مجھ سے کہیں زیادہ رہا تھا۔ میں تو اُس کی ہر مانگ کے مطابق نئی نئی اشیا خرید کر اُس کا تقاضا پورا کر رہا تھا اور جب ہمارا ٹھکانا سج گیا تو دو آتمائیں بے انتہا خوش ہوئیں۔ لگا کہ جنت ہمارے ہاتھ لگ گئی ہو۔ ہم نے مغربی تہذیب کی روایت کے مطابق اپنے فلیٹ کو گرم کرنے کی خاطر رشتہ داروں، یار دوستوں اور چند حاسدوں کو بھی ہاؤس وارمنگ پارٹی میں مدعو کیا تھا۔ اُس ڈھلتی شام اور اُبھرتی شب میں موسم نہایت خوشگوار رہا تھا۔ نہ تو برسات ہوئی، نہ بادلوں سے آسمان دھکا رہا اور نہ ہی تیز ہوائیں چلیں اور نہ ہی پارٹی کے اختتام تک کوئی تکلیف دہ بات مہمانوں کے درمیان ہوئی اور نہ ہی کوئی دل شکن حادثہ رونما ہوا کہ میں جا کر کسی سے شکایت کرتا پھرتا۔

اور ایک شام کام سے فارغ ہو کر میں گھر میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ٹیلی ویژن کی اسکرین پر ایک لمبی سی اونچی دیوار کھڑی ہے، جس کے دونوں طرف اَن گنت جوان، ادھیڑ عمر، بوڑھے بوڑھیاں، مرد اور عورتیں اُس دیوار کو توڑنے میں کوشاں ہیں۔ کسی جوان نے ہاتھ میں ہتھوڑا تھام رکھا ہے تو کوئی ادھیڑ عمر شخص سریا سے کام لے رہا ہے۔ کسی کے ہاتھ میں کلہاڑا ہے اور کوئی لوہے کا وزنی ہتھیار اُٹھائے دیوار پر پے در پے ضربیں لگائے چلا جا رہا ہے۔ عوام بے انتہا خوش ہیں۔ لوگ باگ رقص کر رہے ہیں۔ تالیاں پیٹتے ہوئے ایک دوسرے سے لپٹ رہے ہیں۔ کوئی عمر رسیدہ شخص بگل بجا رہا ہے تو کوئی جوان ٹرمپٹ۔ شور و غل مچا کر لوگ چھلانگیں لگا رہے ہیں، کود رہے ہیں۔ بے شمار کیمرہ مین اپنے اپنے ٹی وی چینل کی خاطر پورے منظر کو کیمروں کے ذریعے ناظرین تک پہنچا رہے ہیں۔ بی بی سی کا عملہ بھی وہاں موجود ہے۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے حیران ہو کر پولکا سے پوچھا۔

''برلن وال کو توڑا جا رہا ہے۔''

''او مائی گاڈ'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ میں نے اپنے لاؤنج کی دیوار پر آویزاں کلینڈر پر ایک نظر ڈالی۔ وہ ۱۰ر نومبر ۱۹۸۹ء کا دن تھا۔ میں نے جھٹ سے کوٹ کی جیب سے پین نکالا اور اُس تاریخ کے گرد اپنی یادداشت کی خاطر ایک دائرہ کھینچ ڈالا کہ یہ سانحہ دنیا کے عظیم ترین سانحوں میں شمار ہوگا۔ میں اور پولکا اُس ٹوٹتی ہوئی دیوار کو اپنے برلن کے سابقہ دورے میں بہت قریب سے دیکھ چکے تھے، جب ہم اپنے ایک قریبی دوست محمد اسد اللہ کے از حد اصرار پر اپنی چھٹیاں منانے مشرقی جرمنی (G.D.R) میں گئے تھے۔ اسد اللہ مشرقی جرمنی میں گذشتہ دو ڈھائی دہائیوں سے رہائش پذیر تھا۔ وہیں اُس نے جرمن کی ایک خاتون سے شادی کی اور دو ہونہار بچوں کا باپ بنا۔ اردو ادب سے اُس کا تعلق خاصا گہرا رہا تھا۔ یہی ہماری ایک دوسرے کے قریب آنے کی وجہ بھی رہی تھی۔ پھر دوستی پروان چڑھی۔ اکثر فون اور خطوط کے ذریعے رابطہ رہتا۔ دنیاوی مسائل کے ساتھ اردو ادب بھی اپنی اہمیت رکھتا۔ اسد اللہ پہلا پاکستانی ادیب تھا، جس نے اردو افسانے کے

لیجنڈ اور آبرو سعادت حسن منٹو کی موت واقع (۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء) کے بعد اُس کی زندگی کے متعلق، اُس کے لا اُبالی پن، تنگدستی، کثرتِ مے نوشی اور آخری ایام پر ایک کتاب لکھی تھی۔ عنوان تھا 'منٹو میرا دوست'۔

وہ کتاب ۱۹۵۶ء میں منٹو میموریل سوسائٹی نے شائع کی تھی۔ کتاب میں درج، مصنف محمد اسد اللہ، منٹو کے آخری برسوں میں اُس کے نہایت قریب رہا تھا۔ جبکہ اُن دونوں کی عمروں میں بیس بائیس کا فرق تھا۔ وہ کتاب جب منٹو کے پرستاروں اور مداحین کی سنجیدہ نظروں سے گزری تو اُنھوں نے مصنف کی ذات کے متعلق کئی اعتراضات کیے کہ اس کتاب کے کئی واقعات مبالغہ آمیز ہیں۔ کئی قصے من گھڑت ہیں۔ کئی حقیقت سے دور ہیں اور وہ تمام بائیس سالہ جوان مصنف محمد اسد اللہ کے زور دار تخیل کا نتیجہ ہیں۔ علاوہ ازیں وہ اِس کتاب کے ذریعے منٹو کی موت کو کیش (Cash) کرنا چاہتا ہے اور اپنا ادبی قد بڑھانے کی فکر میں ہے۔

ملک جرمنی، خصوصاً اُس کا مشہور شہر برلن دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ مشرقی سلوشلسٹ حصہ سوویت یونین سے وابستہ تھا۔ جبکہ مغربی جرمن ہر اعتبار سے آزاد، خود مختار اور جمہوری تھا۔ اُس کی اپنی پارلیمنٹ تھی۔ اپنی کابینہ تھی اور اُن کے فیصلے بھی اپنے ہوا کرتے تھے۔ وہ کسی دوسرے ملک سے احکام نہیں لیا کرتے تھے۔ میں تاریخ کا طالب علم ہونے کے ناطے اتنا تو جانتا ہی تھا کہ دوسری جنگِ عظیم کے اختتامی دنوں میں ایک طرف سرخ فوجیں اور دوسری جانب اتحادی فوجیں، جرمن فوجوں کو پسپا کرتی ہوئیں برلن شہر کے ایک مقام پر پہنچ کر ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑی ہوگئی تھیں۔ بعد ازاں جرمنی کے ایک شہر پاٹس ڈیم (Postdam) میں برطانیہ، روس اور امریکہ کے تینوں بڑوں کی تاریخی ملاقات ہوئی تھی۔ جہاں چرچل، اسٹالن اور ٹرومین کی باہمی گفتگو اور علاقوں کی فتح یابی کی نیبلو پر جرمن ملک کے ساتھ برلن شہر کو بھی تقسیم کردیا گیا تھا۔ اور یوں ملک مشرقی جرمنی معرضِ وجود میں آیا۔ لیکن وہاں کے عوام زیادہ خوش نہیں تھے۔ اُنھیں زندگی بسر کرنے میں بنیادی لوازمات مشکل سے میسر ہوا کرتیں۔ خورد و نوش کا سامان بھی آسانی سے دستیاب نہ ہوا کرتا۔ تقریر و تحریر پر بھی قدرے پابندیاں تھیں۔ جبکہ مغربی جرمنی کے باشندے زندگی کا ہر مزا لوٹ رہے تھے۔ ہر پہلو سے مطمئن تھے۔ چونکہ پوری دنیا دو بلاکز میں بٹی ہوئی تھی۔ کولڈ وار جاری تھی۔ دنیا کا کوئی بھی براعظم ایسا نہ تھا، جہاں دونوں بلاکز (مغربی دنیا اور سوویت یونین) نے اپنے اپنے پنجے پھیلا کر، اپنے اپنے اثرات اور اپنی اپنی خیال پرستی کو پھیلانے اور اُسے مضبوط کرنے میں اُلٹے سیدھے کھیل نہ کھیلے ہوں۔ لیکن بدقسمتی سے اُن کا اُٹھایا ہوا ہر قدم، وہاں کے عوام کے واسطے فائدہ مند کم، نقصان دہ زیادہ ثابت ہوا کرتا۔ وہ عمل آج بھی جاری ہے۔ گو کہ کولڈ وار دنیاوی سطح پر ختم ہو چکی ہیں۔ لیکن مجھ جیسے شخص کے نزدیک صرف پیمانے بدلے ہیں۔ سازشیں آج بھی ساری دنیا میں جاری ہیں۔ جنگیں بھی جاری ہیں۔ غریب غربا کا کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ محرومیاں سر چڑھ کر بول رہی ہیں۔ خواہ وہ اقتصادی ہوں یا سیاسی یا سماجی یا مذہبی انتہا پسندی کی۔ اقوام متحدہ کی کوئی بھی قرارداد عمل میں نہیں آتی۔ عظیم طاقتیں ہاتھ میں وِٹو (Veto) تھامے مسکرا رہی ہیں۔ لاکھوں کروڑوں بچے، مرد، عورتیں، بوڑھے اور ادھیڑ عمر لوگ گھر سے بے گھر ہو کر مشرقِ وسطیٰ کے کیمپوں اور خیموں میں زندہ درگور ہیں۔ دنیا بربادی کے دہانے

پر کھڑی ہے۔

میں نے اپنے جرمنی کے دورے میں اسد اللہ سے جرمن وال دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ جس نے ایک ہی ملک، ایک ہی قوم، ایک زبان اور ایک ہی ثقافت کو بانٹ ڈالا تھا۔ دونوں طرف کے بندے ایک دوسرے سے ملنے کو بے تاب رہتے۔ جرمن قوم کا خون تو ایک ہی تھا اور ورثہ بھی۔ مگر یہ کیسی ستم ظریفی تھی کہ ان کے درمیان دیوار کھڑی کر دی گئی تھی۔

اسد اللہ کی عادت کچھ ایسی تھی کہ وہ بات چیت کے دوران 'برادر' کا لقب بار بار استعمال کیا کرتا تھا۔ وہ اُس کا تکیہ کلام کیا بنا، یار دوست اُسے اسی روشنی میں دیکھنے لگے۔ جلد ہی اُنھوں نے برادر کا لقب اُس کی ذات سے جوڑ دیا اور وہ اسی لقب سے دوستوں کے درمیان مشہور ہو گیا۔ ہم سبھی یعنی میں، پولکا اور اسد اللہ مشرقی حصے میں دیوار کے قریب کھڑے اُسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ وہ لمبائی میں تاحدِ نظر پھیلی ہوئی تھی اور اونچائی میں بیس بچیس فٹ سے کم نہ تھی۔ میں نے اسد اللہ سے پوچھ ہی لیا۔

''اس دیوار کو کھڑا کرنا ضروری تھا کیا؟ ملک تو تقسیم ہو ہی چکا تھا؟''

''برادر کیا بتاؤں۔ مغربی جرمنی کے لوگ بدمعاش ہیں۔''

''بدمعاش؟ وجہ؟''

''مغربی جرمنی کا ٹی وی اور پریس میڈیا بہت تیز ہے۔ ٹی وی پر جان بوجھ کر دکھاتے ہیں کہ مغربی برلن میں ڈسکو کیسنو، کلب اور شراب خانے رات کے تین تین چار چار بجے تک کھلے رہتے ہیں۔ پینا پلانا بھی جاری رہتا ہے۔ کوئی پابندی نہیں۔ ہر طرح کی آزادی ہے... کھاؤ پیو ناچو اور جو کھیلو تو...'' وہ اچانک رُک گیا۔ لیکن میں نے فوراً ہی پوچھ لیا: ''رُک کیوں گئے؟ آگے کہو۔''

''یہی کہ ہماری طرف کے جوان لڑکے، لڑکیاں ہر طرح کا خطرہ مول لیے سرحد پار کرنے کی سوچا کرتے... چند کامیاب بھی ہو جاتے۔ زیادہ تر پکڑے جاتے۔ بہت سے بھون بھی دیے جاتے... اس وجہ سے یہ دیوار ۱۹۶۱ء میں کھڑی کر دی گئی تھی۔''

اسد اللہ پکا کمیونسٹ تھا۔ بلکہ میری نظر میں وہ پیدائشی کمیونسٹ تھا۔ اُس کا انگ انگ مارکزازم کی خیال پرستی میں گروی پڑا ہوا تھا۔ دنیا میں کہیں بھی کوئی حادثہ گزرا ہو، کسی بھی ملک میں رونما ہوا ہو۔ اسد اللہ اُس کا تجزیہ مارکزازم کے تناظر میں کیا کرتا تھا اور پورا قصور مغربی دنیا کو دیا کرتا تھا۔ وہ مغربی دنیا اور اُس کی طرزِ زندگی کے سخت خلاف تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں کیڑے نکالنا اُس کا شیوہ تھا۔ ہماری دوستی کی ابتدا میں مجھے موصوف سے کچھ کچھ ہمدردی سی ہو چلی تھی۔ اس کی کئی وجوہات رہی تھیں۔ اول تو یہ کہ میں بھی بائیں سوچ کا آدمی تھا اور ہوں۔ ہوش سنبھالنے پر میں بھی سرمایہ داری کے خلاف اول دن سے تھا۔ میں اُسے دنیا کی سب سے بڑی لعنت تصور کرتا تھا۔ میں بذاتِ خود تیسری دنیا کے ہر ملک میں انقلاب در انقلاب دیکھنے کا متمنی تھا۔

دوئم یہ کہ اسد اللہ مشرقی جرمنی میں ادبی اعتبار سے بلکل تنہا تھا۔ اُس کا کوئی بھی ادبی دوست وہاں موجود نہ تھا۔ مگر سب سے اہم وجہ یہ رہی تھی کہ اُس نے میرے پسندیدہ ادیب سعادت حسن منٹو کے بارے میں ایک کتاب لکھی تھی۔ اور اُس کی زندگی کے آخری برسوں میں اُس کے بہت قریب رہا تھا۔ لیکن اِس شخص کی ذات میں ایک پہلو ایسا بھی چھپا ہوا تھا کہ دوست یار اُس کے دوستی کا بھرم بھرتے ہوئے اُس سے کنارہ کشی اختیار کرلیا کرتے۔ جھوٹ بولنا اُس کا ایمان تھا۔ سچ کے قریب سے گزرتے ہوئے اُسے خوف آتا تھا۔ دروغ گوئی اُس کی سائیکی میں یوں بیٹھ چکی تھی کہ جھوٹ بولتے وقت وہ اِس خیال میں رہا کرتا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ میرا یارانہ بھی اِس کارن ختم ہوا تھا کہ وہ جھوٹ کی آڑ میں دوستی کا استحصال کرنے میں ماہر تھا۔ اُسے کھو کر مجھے افسوس بھی ہوا تھا۔ لیکن اب وہ میری سائیکی سے نکل کر سدا دور جا چکا ہے۔

☆

محترم وزیر آغا صاحب جب تک حیات رہے، وہ اُردو زبان و ادب کی مختلف اصناف کی شمعیں اپنی بھرپور ذہانت سے روشن کرتے رہے۔ اُن کے چند پسندیدہ شاعر، ادیب اور انشا پرداز بھی رہے تھے۔ بندے کو بھی موصوف نے کرم کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ خواہ میں نے ''اوراق'' کی محفل میں قدم قدرے دیر سے رکھا تھا۔ مگر ''مونگرل اور نئے دیس میں'' جیسی کہانیاں لکھ کر میں نے جلد ہی ''اوراق'' میں اپنی جگہ بنالی تھی۔ ہندوپاک کے تمام جدید فن کار اپنی تازہ ترین تخلیق لیے اُن کے رسالے میں شامل ہوا کرتے۔ اُس فہرست میں محترم جوگندر پال بھی تھے۔ وہ ادب میں اپنا لوہا منوا چکے تھے۔ قارئین اُن کو عزت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ اُن کا ''اوراق'' میں افسانے کے تعلق سے ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ عنوان تھا ''اردو افسانے کا منظر نامہ'' مضمون بلاشبہ دعوتِ فکر دیتا تھا۔ افسانوی صنف کے کئی غیر مرئی پہلو اور اُن کے زوایے قاری کے سامنے آئے تھے۔ مشرقی اور مغربی طرزِ زندگی کا فرق، اقدار کا براہ راست تصادم اور ذہنی فاصلے نہایت ہنر مندی سے اُجاگر کیے گئے تھے۔ چونکہ پال صاحب کی سوچ بنیادی طور پر ایک فلسفی کی رہی ہے۔ اُن کی کہانیوں اور ناولوں کے زیادہ تر کردار بھی اُسی انداز میں اپنے اندرون کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ اُن کے فن کی خاصی بھی رہی ہے۔ اسی لیے اُن کے مجموعی فن اور کرداروں میں رنگا رنگی پیدا نہیں ہو پائی۔ کرداروں کی سوچ میں یکسانیت کا احساس رہتا ہے۔ البتہ مذکورہ بالا مضمون میں موصوف نے منشی پریم چند کی کہانی 'کفن' سے لے کر اپنے ہم عصروں کے نام اور اُن کی معروف کہانیوں کے حوالے بھی چن چن کر دیے ہیں۔ لیکن موصوف کا رویے برصغیر کے دیگر ناقدین، مضمون نگار یا تنقید نگاروں سے الگ نہیں رہا۔ وہ تمام کے تمام اردو افسانے کا جائزہ لیتے وقت ہندوپاک کے افسانہ نگاروں تک ہی محدود رہا کرتے۔ وہ بھی سرحدوں کو عبور کر کے یورپ کی طرف دیکھا نہیں کرتے تھے۔ جانے کیوں؟ جب کہ افسانہ تو اپنی تمام تر تازگی اور توانائی کے ساتھ یورپ میں بھی لکھا جا رہا تھا۔ ادب تو زندگی کا وہ میدان ہے، جہاں فن کار کو اُس کی تخلیق کا جائز مقام اور صلہ ملنا ہی چاہیے۔ یورپ، امریکہ اور کینیڈا میں جانے مانے کہانی کار قیصر تمکین۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کریم، ش صغیر ادیب، منیر الدین احمد، خالد سہیل، سعید انجم، ضمیر الدین احمد، سائیں سچا، نصر ملک، ستیہ پال آنند، ارشاد احمد صدیقی، افتخار نسیم، انور خواجہ،

گلشن کھنہ، مقصود الٰہی شیخ، رضا علی عابدی اور جتیندر بلّو موجود تھے۔ خواتین میں محسنہ جیلا، صفیہ صدیقی، نجمہ عثمان، عطیہ خان، نعیمہ ضیاالدین، مرتضیٰ رفعت اور حمیدہ معین رضوی تھیں۔ مگر محترم پال صاحب کا مضمون پڑھ کر شدت سے احساس ہوا کہ مغربی دنیا میں اردو کا کوئی بھی افسانہ نگار اس درجے کا موجود نہیں ہے، جس کا ذکر اس کی کہانی کے ساتھ اُن کے مضمون میں ہوتا؟

بیرونِ ملک میں آباد میرے ہم عصر کہانی کار فون پر مجھ سے دریافت کیا کرتے کہ کیا وجہ ہے کہ ہم کہانیاں تو اپنی دانست کے مطابق بڑھ چڑھ کر لکھ رہے ہیں۔ وہ ہندستانی رپاکستانی رسائل میں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع بھی ہو رہی ہیں۔ پسند آنے پر تعریفی خطوط بھی شائع ہوا کرتے ہیں۔ لیکن برصغیر کا کوئی بھی مضمون نگار یا نقاد جب اُردو افسانے پر قلم اُٹھاتا ہے تو وہ بیرونِ ملک کے کسی بھی کہانی کار کا حوالہ تک دینا پسند نہیں کرتا؟ کیا ہم لوگ ہندو پاک کے رسائل کو زرِ سالانہ ہی دینے کو رہ گئے ہیں؟ یا مدیرانِ کرام جب بیرونی ممالک میں تشریف لاتے ہیں تو کیا ہم اُن کی خاطر و مدارت ہی کے لیے بچ رہے ہیں؟ ہمارا استحصال کب تلک ہوتا رہے گا؟ ہمیں پہچانا کیوں نہیں جا رہا؟ اُن کی شکایات میں منطق تھی۔ عقلیت تھی۔ مجھے واقعی بڑا الگ کرتا تھا۔ ایک روز غصے میں آ کر میں نے پال صاحب کو ایک خط ۱۲ر مئی ۱۹۹۷ء کو داغ ہی ڈالا۔ غصہ آنے کی وجہ یہ رہی تھی کہ پال صاحب بذاتِ خود کہانی کار ہو کر بھی بیرونِ ملک کے کہانی کاروں کی نہ تو حوصلہ افزائی کر رہے تھے اور نہ ہی پذیرائی؟ یقین غالب تھا کہ جواب ضرور آئے گا۔ میں نے اُس خط کی ابتدا کچھ یوں کی تھی کہ میں اپنی ادبی زندگی میں پہلی بار کسی نامور ادیب کو خط لکھ رہا ہوں۔ ورنہ ادیبوں کو خط لکھنا میری ادبی زندگی میں روزِ اول سے نہیں رہا۔ وجہ سیدھی سادی سی ہے کہ میں ادب میں خطوط کے سہارے نہیں، ٹھوس تخلیق کی سطح پر زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ میرا مدعا پا گئے ہوں گے۔

پال صاحب اس حقیقت سے تو آپ واقف ہی ہوں گے کہ میں مغربی دنیا میں سکونت پذیر ہوں۔ اس جہاں کو اپنی نظر سے دیکھتا ہوں۔ یہ دنیا نہایت پیچیدہ ہے اور Complexed بھی۔ میں اُسے اپنی عقل و فہم کے سہارے اپنی اچھی بُری کہانیوں میں پیش کرتا ہوں۔ اُس کا احساس آپ کو یقیناً رہا ہوگا؟ بہر کیف میں اصلی مقصد کی طرف لوٹتا ہوں، ورنہ اپنے مقصد سے بھٹک جاؤں گا۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہندو پاک کے مضمون نگار، ناقد یا ادیب اُردو افسانے کا جائزہ لیتے ہوئے وہ یورپ می ں آباد کہانی کاروں کو نظر انداز کر ڈالتے ہیں؟ آپ کا رویہ بھی اُن سے الگ نہیں رہا۔ کیا آپ ایمانداری سے میرے ایک مختصر سے سوال کا جواب دیں گے کہ آیا اس وقت مغربی دنیا میں اردو زبان کا کوئی بھی فن کار اس پائے کا موجود نہیں ہے، جس کا ذکر آپ اپنے مضمون میں کرتے؟ خدارا آپ ہمیں آؤٹ سائیڈر تسلیم مت کریں؟ ہم اُسی گنگا جمنی تہذیب، اُسی مخلوط زبان اور اسی مٹی کے پروردہ ہیں، جن معاشروں میں آپ نے، میں نے اور میرے ہم عصروں نے آنکھ کھولی تھی۔

دیر تک جواب کا انتظار رہا۔ مگر جواب نہ آیا۔ مایوسی کو میرے دماغ کے ہر خلیے نے قریب سے محسوس کیا تھا۔ کارن جلد ہی میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ نوّے کی دہائی میں جوگندر پال صاحب کا ادب میں طوطی بول رہا تھا۔

جبکہ میں ین را کے رسالے 'شعور' میں 'جزیرہ' جیسی کہانی لکھ کر ادبی پہچان کی ابتدائی سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ اہلِ ذوق کو وہ کہانی بے حد پسند آئی تھی۔ بعض ناقدین نے تو یہاں تک لکھا تھا کہ اردو افسانے میں دیر سے تازہ ہوا کا جھونکا آیا ہے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ ابھی مجھے اور معیاری کہانیاں لکھ کر ہی کئی ادبی سیڑھیاں طے کرنی ہیں اور ادب کے مہارتھیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہے۔ پال صاحب یقینی طور پر اس خیال میں رہے ہوں گے کہ جزیرہ کہانی لکھ کر جتیندر بلو کا ضرور فلیوک (Fluke) لگ گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ آئندہ کیا لکھتا ہے؟ مستقبل قریب میں اگر اس کی کوئی غیر معمولی کہانی یا تحریر منظرِ عام پر آئی تو پھر دیکھیں گے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؟ فلحال تو اتنا سنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ نئے نئے ادیب تو آئے دن روز ابھرا ہی کرتے ہیں؟ لیکن جلد ہی ان کا ذہنی شعلہ بجھ کر رہ جاتا ہے؟ پھر وہ بھولے سے بھی کہیں نظر نہیں آتے۔ میں چار و ناچار چند کڑوے گھونٹ پی کر خاموش رہ گیا تھا۔

وقت کا نظام تو روزِ اول سے خود ساختہ رہا ہے۔ اس کی سوئیاں تو اپنے حساب سے گردش میں رہتی ہیں۔ ان پر تو ابھی تک کائناتی طاقتیں بھی کوئی پہرہ بٹھا نہیں پائیں؟ وہ دن رات اپنے مخصوص دائرے میں گھومتا رہا۔ میں بھی اپنے ادبی و تخلیقی کاموں میں مصروف رہا۔ کہانیاں میں نے 'کورکشیتر فرار'، 'خدا کا رنگ'، 'سودا'، 'دیس پردیس' اور 'بازار' لکھ کر پہچان کی کئی اور سیڑھیاں طے کر لی تھیں۔ میں اپنی ذات میں پھیلتا بھی جا رہا تھا اور مطمئن تھا ہر اعتبار سے۔

ایک شام شاعر، لیکھک، براڈ کاسٹر اور ہفت زبان چمن لال چمن کا غیر متوقع طور پر فون آیا کہ اس کا دیرینہ دوست جوگندر پال اپنی اہلیہ کے ساتھ لندن تشریف لا رہا ہے اور اس کے ہاں ہی قیام پذیر ہوگا۔ ان کا یارانہ افریقہ کے ملک کینیا میں پروان چڑھا تھا۔ شہر نیروبی میں ان کی سنگت برسوں تک رہی تھی۔ چمن نے مزید بتایا کہ وہ جوگندر پال کے اعزاز میں ایک شام منعقد کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور میری شمولیت پال صاحب کے فن پر ایک سیر حاصل مضمون کی صورت میں ہونی چاہیے؟ پال صاحب کا نام سن کر اچانک ہی میرے ذہن کے افق پر وہ خط ابھر آیا تھا، جس کا جواب پال صاحب نے دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس سمے مجھے اپنے ہونے یا نہ ہونے کا احساس جاگ اٹھا تھا۔ چمن کے ساتھ میرے تعلقات صاحب سلامت کی حد تک ہی تھے۔ اگر کہیں ملاقات ہو جاتی تو تپاک سے ملا کرتے۔ لیکن ہمارے درمیان کبھی ادبی مکالمہ تفصیل سے نہ ہوا تھا۔ میں نے ادھر ادھر کی بے جا مصروفیت جتا کر چمن سے معذرت چاہ لی اور خود کو آزاد کر لیا۔

چمن ان دنوں مغربی لندن کے علاقے ہنسلو میں ایشیائی کمیونٹی سینٹر کا روحِ رواں تھا۔ وہیں جوگندر پال صاحب کے ساتھ ایک شام منانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ لندن شہر کے کسی بھی کونے میں مشاعرہ منعقد ہو، معمولی سے معمولی شاعر بھی ہندو پاک سے وارد ہوا ہو، ہال قریب قریب ایشیائی عمر رسیدہ اور قریب المرگ لوگوں سے بھرا رہتا ہے۔ ان کی سوچ میں آج بھی جاگیردارانہ تہذیب کے اثرات رینگ رہے ہیں۔ وہ اپنی کھری ہوئی زبان کی چاشنی سے محظوظ ہو کر مکرر مکرر، واہ واہ کے کلمہ تحسین تب تک الاپتے رہتے ہیں،

جب تک کہ مشاعرہ اختتام تک نہیں پہنچ پاتا۔ دوسری طرف کوئی کہانی کار یا نقاد تشریف لے آئے تو ہال میں ناظرین اور سامعین کی کمی کا احساس شدت سے رہتا ہے۔ لیکن اُس مخصوص شام میں، پال صاحب کے نام پر کئی ادب نواز باشعور اور اہلِ ذوق اشخاص اُن کو سننے کی غرض سے چلے آئے تھے۔ پال صاحب نے پہلے تو کہانی کی بنیادی تشریح کی کہ کہانی کیا ہوتی ہے۔ اس نے انسانی فطرت کی بنا پر کیوں جنم لیا؟ اس کی روایات کیا ہیں؟ کتھا سرت ساگر اور پنچ تنتر کی کہانیوں کے حوالے دیے۔ مہابھارت کے بعض کرداروں کے منفی اور مثبت پہلوؤں سے آگاہ کیا۔ پھر اپنا کوئی افسانہ سنانے کے بجائے موصوف نے نہایت سلجھے ہوئے انداز میں اپنے تحریر کردہ افسانچے سنائے جو سنجیدہ سوچ اور فلسفیانہ جہت ساتھ لیے ہوئے تھے۔ سامعین نے بڑھ چڑھ کر موصوف کے فن کو سراہا تھا۔

میں، شاعر راج کھیتی اور مصور ابرار ترمزی پروگرام شروع ہونے سے پہلے ہی وہاں پہنچ گئے تھے۔ مصور ابرار کا المیہ یہ تھا کہ اُس نے مصوری کے ساتھ ادب اور فوٹو گرافی کے شوق بھی پال رکھے تھے۔ بیک وقت وہ تین کشتیوں میں سوار تھا۔ انجام یہ ہوا کہ اُسے اپنے جیون میں کوئی کنارہ نصیب نہ ہوا۔ پال صاحب ہم سب سے بڑی گرمجوشی سے ملے تھے۔ اُن کے ہاتھوں کی گرمائش احساس دلا رہی تھی کہ وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے ہیں۔ وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے ایک طرف لے گئے اور اپنے ہاتھوں میں میرا ہاتھ تھام کر، اُسے تھپتھپاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا:

جتیندر، میرا مضمون ہندو پاک کے کہانی کاروں کے بارے میں تھا، اُردو کے باہر کی دنیا کو میں نے چھوا نہیں تھا۔"

میں حیرت سے اُن کو دیکھتا رہا۔

"ویسے دیکھا جائے تو انگلینڈ میں صرف تم اور قیصر تمکین دو ہی قلم کار ایسے ہو، جو افسانے کی رمز رمز سے واقف ہو، خوب لکھ رہے ہو... باقی تو ادھ کھلی کلیاں ہیں... منہ بند پھول ہیں، اُن پر جب جوبن آئے گا، اُن کا بھی ذکر رہے گا۔"

پال صاحب کا لہجہ مخلصانہ تھا۔ سچ اُنکی آنکھوں سے جھانک کر خود کو منوانے کے درپے تھا۔ میں کچھ دیر اُن کی آنکھوں سے الگ نہیں ہو پایا تھا۔ شدت سے محسوس ہوا کہ اب میرے لیے احتجاج کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ لیکن اتنا میں نے ضرور کہا:

"آپ نے میرے خط کا جواب کیوں نہیں دیا تھا؟"

بولے: "جتیندر، کبھی کبھی بڑے بڑوں کی مت ماری جاتی ہے... ستاروں کا کھیل بڑا نرالا ہے۔ اُس کو سمجھنا اتنا آسان نہیں۔"

میرے ساتھ وہ بھی مسکرا دیے تھے۔

(جاری)

■■

وقار ناصری

پامال خوابوں کی کہانی: اُداس نسلیں

برطانوی نوآبادیات کا حصہ بننے کے بعد ہندستان ان تمام المیوں کا مرکز رہا ہے جو اس کی تہذیب و ثقافت اور سماجی ساخت کو پامال کرتے رہے ہیں۔ پلاسی (۱۷۵۷ء)، بکسر (۱۷۶۴ء) اور ٹیپو کی شہادت (۱۷۹۹ء) نے اس ہندستانی سماج کو تہ و بالا کر دیا جو صدیوں سے ایک مخصوص سماجی ڈھانچے اور سماجی ساخت کے تحت اپنی اپنی مادی ضرورتوں و اس کے وسائل کا مالک تھا۔ غیر ملکی بالادستی نے اختیار حاصل رتے ہی توسیع پسندی کے وہ تمام حربے استعمال کرنا شروع کر دیے جو عوام کے ذہنی رویوں کو بدلنے میں ہی معاون ثابت نہ ہوئے بلکہ ان کے ذریعے ملک کی تہذیب و ثقافت کو ناکارہ ثابت کرنے کا بھی عمل شروع ہوا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جد و جہد کے بعد ہندستان مکمل طور پر وہ حیثیت بھی کھو بیٹھا جو اس کے اقدار و تہذیب کی علامت تھی۔

کسی سماج میں جو طبقہ بالادستی حاصل کر کے مادی وسائل پر اختیار حاصل کر لیتا ہے، فکری اور علمی سطح پر بھی اس کا غلبہ ہوتا ہے۔ یعنی پورے سماج میں ایسے افکار اور ایسے علوم و فنون رائج ہوتے ہیں جو اس طبقے کے مفادات اور ضروریات کے مطابق ہوتے ہیں۔ میکالے کا یہ قول: "ہمیں اس وقت ایک ایسا طبقہ پیدا کرنے میں پوری قوت صرف کر دینی چاہیے جو ہمارے اور ان لاکھوں لوگوں کے درمیان جن پر ہم حکومت کرتے ہیں، ترجمان کا کام کر سکے۔ ایسے لوگوں کا ایک طبقہ جن کا خون اور رنگ تو ہندستانی ہو لیکن جو میلان و افکار اور اخلاق و عقلی لحاظ سے انگریز ہوں۔"

نہ صرف بالادست طبقے کے افکار کا ترجمان ہے بلکہ ثقافتی و نظریاتی طور پر انگریز حاکمیت اور نگہداشت کا وہ حکم نامہ ہے جو ہندستانی عوام اور ان کے سماجی اداروں کو اپنا پابند رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔

عبداللہ حسین کے ناول 'اداس نسلیں' اور ان کی دوسری تحریروں کو اس مخصوص سماجی، ثقافتی پس منظر میں

دیکھنا دراصل اس زندگی کا مطالعہ کرنا ہے جہاں لوگوں کی زندگیاں اتفاقات وحوادث کے درمیان مسلسل تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔

کانگریس، مسلم لیگ، تحریک خلافت، انتہا پسند جلیانوالا باغ کا سانحہ، ویلز کا دورۂ ہندستان، عوامی سول نافرمانی، چوراچوری، گاندھی جی کی گرفتاری، سائمن کمیشن، عہدنامہ آزادی-لاہور، ڈانڈی یاترا، نمک قانون، پہلی گول میز کانفرنس، گاندھی اردن معاہدہ، کانگریس سوشلسٹ پارٹی، کانگریس کا اجلاس، کراچی، آزاد ہند فوج، تقسیم و آزادی وغیرہ نے ہندستان کی سیاست، تہذیب وثقافت پر جو اثرات مرتب کیے ان سے ہندستانی عوام بھی اسی طرح متاثر ہوئے جس طرح انھیں ہونا تھا۔

زندگی کے بدلتے ہوئے منظر نامے میں تقسیم کی لکیر نے سرحدوں اور فاصلوں کے جو نشانات معین کیے، انھوں نے عوامی زندگی کے خارج و باطن کو کس طرح اپنی گرفت میں لیا اور شعور ولاشعور پر ان کے کیا کیا اثرات مرتسم ہوئے 'اداس نسلیں' کی بکھرا بکھرا منتشر زندگی کا یہ ایک اور پہلو ہے۔

''آگ کا دریا' کے آس پاس عبداللہ حسین کا ناول ''اداس نسلیں'' (۱۹۶۲ء) شائع ہوا۔ اس کا کینوس ۱۹۱۳ء سے ۱۹۴۷ء تک پھیلا ہوا ہے جس میں نوآبادیات کے وہ تمام سیاسی، سماجی، ثقافتی اور معاشرتی حالات ہیں جو حاکم ومحکوم طبقے کی کشمکش، عمل اور ردِ عمل کے طور پر منظر سے پس منظر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ محکوم طبقہ پامال خوابوں کے ملبے کے ڈھیر پر اس زندگی کا آرزومند ہے جو اس کا خواب ہے۔ اسے خواب دیکھنے کی اجازت ہے مگر رنگ بھرنے کی نہیں اور نہ ہی اس خواب کو پورا کرنے کی جو اس کی زندگی میں رنگ بھر سکتا ہے۔ اس کے لیے بس اتنا ہی ہے کہ وہ پامال شدہ خوابوں کے ساتھ اداسی کا لباس اوڑھے، مجبور اور لاچار بن کر اس زندگی سے مشروط رہے جو بالادست طبقوں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے لیے مادی آسائشوں اور وسائل کے حصول میں طے کی گئی ہے۔

سماج کبھی ساکن و جامد نہیں رہتا وہ ہر دم بدلتا رہتا ہے۔ سادہ سے پیچیدہ، خراب سے بہتر اور ادنا سے اعلا کی طرف تا کہ ایک بہتر معاشرے کی تشکیل ہو سکے۔ مگر کبھی کبھی وہ ہو جاتا ہے جو عینیت پسند کہتے ہیں۔ وہ سماجی قوانین کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں دنیا اور تاریخ اتفاقات اور حادثات کا مجموعہ ہے اور یہ ناقابل فہم ہے۔ تاریخ کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ تاریخ کے سفر میں کوئی منطق نہیں ہے۔ لہٰذا انسان مستقبل پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ سماجی نفسیات کے ماہرین ایک الگ نظریہ رکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں سماجی نشو و نما کو فرد کی جبلت اس کی خواہشات، اس کے تحت الشعور، لاشعور دوسری باطنی چیزوں پر مبنی ہے۔ اور ان کے خیال میں فرد کے باطن اور سماج کا باہمی تعامل کا کوئی رشتہ نہیں۔ اور اگر کوئی ہے بھی تو یہ رشتہ سماجی نظام کے معروضی قوانین کی پیداوار نہیں ہے۔ اس طرز فکر کا منطقی انجام نراج اور جبریت پرستی پر ہوتا ہے۔

سماج سے متعلق ان باتوں کے لکھنے سے غرض صرف اتنی ہے کہ اداس نسلیں کا مطالعہ کرتے وقت اس میں دیے ہوئے سماج کو آخر کس نظر سے دیکھا جائے اور زندگی کو حاصل، لاحاصل کے کس روپ کی تعبیر قرار دیا جائے۔ عبداللہ حسین کا اپنا خیال ہے کہ:

''زندگی کا نہ کوئی نقشہ ہے نہ نمونہ۔ بس چھوٹے بڑے اتفاقات کا ایک جال ہے جو ایک ایک گانٹھ جڑ جڑ کر پھیلتا جاتا ہے۔''

چھوٹے بڑے اتفاقات کے ساتھ ''اداس نسلیں'' کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

دلی کے قریب ایک گاؤں روشن پور تھا جو ایک متوسط گھرانے کے فرد کو ۱۸۵۷ء کے ہنگام میں ایک انگریز افسر کی جان بچانے کے عوض بطور انعام روشن آغا کے خطاب کے ساتھ جاگیر میں ملا تھا۔ روشن آغا کی ایک قیام گاہ دلی میں بھی تھی جس کا نام روشن محل تھا۔ نیاز بگ اور ایاز بیگ روشن آغا کے دوست کے بیٹے تھے۔ نیاز بیگ روشن پور میں کھیتی کرتا تھا اور ساتھ ہی طرح طرح کے اسلحے بنانے میں لگا رہتا تھا۔ اپنی اس مجرمانہ حرکت کی وجہ سے وہ گرفتار ہو کر جیل چلا گیا اور اس کی بہت سی زمین بھی انگریزی سرکار نے ضبط کر لی۔ ایاز بیگ جو کلکتہ کی کسی تعمیری کمپنی میں کام کرتا تھا روشن پور آ کر اپنے بھتیجے نعیم کو اپنے ساتھ لے کر کلکتہ چلا جاتا ہے۔ نعیم نے اپنے چچا ایاز بیگ کے پاس رہ کر سینیر کیمرج تک تعلیم حاصل کی۔ انہی دنوں روشن آغا کا انتقال ہو جاتا ہے اور ان کے فرزند محی الدین کو روشن آغا کا خطاب ملتا ہے۔ دلی کے روشن محل میں اس سلسلے میں ایک تقریب منعقد کی جاتی ہے۔ کلکتہ سے ایاز بیگ اپنے بھتیجے کے ساتھ روشن محل آتا ہے۔ وہاں نعیم کی ملاقات روشن آغا کی لڑکی عذرا سے ہوتی ہے۔ نعیم کو عذرا پسند آجاتی ہے۔ عذرا بھی نعیم کی خوبصورتی اور اس کے انداز سے متاثر ہوتی ہے۔ نعیم کچھ دنوں دلی میں رہ کر اپنے باپ کے پاس (جو جیل سے رہا ہو کر آچکا ہوتا ہے) روشن پور چلا جاتا ہے اور کھیتی باڑی میں اس کا ہاتھ بٹانے لگتا ہے۔ اسی دوران جنگ عظیم شروع ہو جاتی ہے۔ نعیم فوج میں بھرتی ہو کر دور دراز کے محاذ پر چلا جاتا ہے۔ جنگ کے دوران اس کا ایک بازو بیکار ہو جاتا ہے مگر غیر معمولی بہادر کے صلے میں اس کو وکٹوریہ کراس ملتا ہے اور ساتھ ہی زمین بھی دی جاتی ہے۔ خاندانی مخالفت کے باوجود عذرا نعیم سے شادی کر لیتی ہے۔ نعیم اپنی کھیتی کے ساتھ ساتھ روشن آغا کی جاگیر کا کام بھی سنبھال لیتا ہے۔ محاذ جنگ کی ہولناک زندگی، بھوک افلاس اور ناانصافی کے سبب نعیم کو انگریزوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ وہ انتہا پسندوں میں شامل ہو جاتا ہے لیکن جلد ہی اسے احساس ہو جاتا ہے کہ آزادی کی جنگ میں یہ اقدام بے نتیجہ ہے۔ تشدد کسی مسئلے کا حل نہیں ہے۔ وہ کانگریس میں شامل ہو کر ملک کی آزادی میں سرگرم تحریک کا حصہ بن جاتا ہے۔ عذرا بھی اس کا برابر ساتھ دیتی ہے۔ کانگریس کی حمایت کے الزام میں اس کو سزا ہو جاتی ہے۔ آزادی کے جذبے سے سرشار نعیم کو پتہ نہیں کیوں یہ زندگی بے کیف سی لگنے لگتی ہے۔ اس کا ذہن منتشر ہو جاتا ہے۔ وہ شروع سے ایک پرسکون اور اطمینان بخش زندگی کا خواہاں تھا لیکن ہندو مسلم سوال، سیاسی آپادھاپی اور کانگریس مسلم لیگ کے جھگڑوں سے اس کی الجھنیں کچھ اور بڑھ جاتی ہیں۔ ان ذہنی الجھنوں سے نجات پانے کے لیے وہ سیاسی سرگرمیوں سے دور ہو جاتا ہے۔ روشن آغا کی مدد سے اسے سرکاری ملازمت مل جاتی ہے لیکن ملک کی تقسیم کے وقت وہ نوکری چھوڑ کر اس کی ملاقات اپنے چھوٹے بھائی علی اور اس کی بیوی عائشہ سے ہوتی ہے۔ بیماری کی وجہ سے عائشہ کا راستے ہی میں انتقال ہو جاتا ہے اور جب قافلے پر حملہ ہوتا ہے تو نعیم بھی مارا جاتا ہے۔ عذرا اپنے والدین کے ساتھ لاہور پہنچ جاتی ہے جہاں کچھ دنوں بعد روشن آغا کا انتقال ہو جاتا

ہے۔ عذرا اپنی بہن نجمی کے ساتھ اس گھر میں رہنے لگتی ہے جہاں اس کا بھائی پرویز اور اس کے بیوی بچے موجود ہیں مگر نعیم کی یاد اسے ہر گھڑی ستاتی رہتی ہے۔ ہندوستان سے ہجرت کرنے والا اعلا طبقہ پاکستان کے اعلا طبقے کے ساتھ مل کر پھر زندگی کے ہنگاموں میں مصروف ہو جاتا ہے۔ رہے عام لوگ اور ان کی زندگی تو وہ کس شمار و قطار میں تھی۔

اداس نسلیں سیاسی، ثقافتی اور سماجی تبدیلیوں کا بیانیہ ہے۔ اس میں جا بجا ایسے واقعات ہیں جو نو آبادیاتی رویوں کے خلاف کہیں واضح اور کہیں پوشیدہ احتجاج کی علامت ہیں۔ انگریزوں کے خلاف نفرت اور اپنے ملک کی آزادی کی جو تڑپ تھی نعیم اور دوسرے کردار اس کی مثال ہیں۔ گو کھلے، اینی بسینٹ اور ایک غیر ملکی اخبار نویس کانگریس کے اجلاس بانکی پور کے بارے میں روشن محل کی تقریب میں باتیں کر رہے تھے۔ اس وقت اخبار نویس جنوبی افریقہ کی سیاست کے بارے میں بات کرتے ہوئے ہندوستان کی سیاست پر حقارت آمیز طنز کرتا ہے تو نعیم کو غصہ آجاتا ہے۔ یہ ردِ عمل پس نو آبادیات ذہن اور احتجاج کی وہ آواز ہے جس کا اظہار نا گزیر تھا۔

''پیچھے کھڑا نعیم اپنی ٹوپی کو بری طرح ہاتھوں میں مروڑنے لگا۔ گو کھلے یک لخت سنجیدہ ہو گئے۔ آپ کے اخبار کا کوئی نمائندہ جنوبی افریقہ میں بھی تھا؟''

''او ہاں ضرور تھا۔ اخبار نویس نے رک کر بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ آپ جنوبی افریقہ سے آرہے ہیں۔ میں جانتا ہوں مگر وہاں کا مقابلہ آپ ہندستان سے نہیں کر سکتے۔ یہاں تو سیاست یعنی پڑھے لکھے لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔

''پڑھے لکھے لوگوں سے آپ کی مراد...''

''یہی کہ تعلیم یافتہ ہیں تاریخ سے واقف ہیں، اور...'' دفعتاً نعیم آگے بڑھا جس سے اس کا چہرہ جو سرخ ہو رہا تھا روشنی میں آگیا، ذرا سا جھک کر نو عمری کے جوشیلے لہجے میں وہ بولا اور یہ بھی کہ ساری کارروائی انگریزی زبان میں ہوئی۔

''سب نے ایک ساتھ مل کر دیکھا نعیم کے ماتھے پر پسینہ تھا اس نے ٹوپی کے پھندنے کو اس زور سے کھینچا کہ وہ اس کے ماتھے پر آگیا ایاز بیگ کا رنگ سفید پڑ گیا۔

''یہ کوئی بری بات نہیں اسکے علاوہ کوئی بھی بڑی زبان سیکھنا معیوب نہیں بلکہ اچھی تعلیم ہے۔ اخبار نویس اپنے آپ کو سنبھال کر بولا۔''

''اسی لیے کم پڑھے لکھے لوگ قید کر دیے جاتے ہیں۔ اور آپ کیا توقع رکھتے ہیں تلک جیل میں ہے کیا؟''

عام ہندستانی کس خوف اور جبر میں جی رہے تھے اس کا اندازہ ایاز بیگ کے ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نے روشن محل کی تقریب سے واپسی پر نعیم سے کہے تھے۔

''تم تقریر کرنے کے لیے وہاں نہیں گئے تھے۔ ایاز بیگ نے نعیم کو کہا تمھیں پتہ ہے تلک کا نام لینا ہی دہشت پسندی میں شمار ہوتا ہے کوئی اور جگہ ہوتی تو تمھیں گرفتار کر لیا جاتا۔ روشن محل کی تقریب تھی اس لیے...''

نعیم بیٹھا سوچتا رہا پھر آہستہ سے بولا مجھے افسوس ہے، چچا وہ ہمارا سب کا ایسا ہیرو ہے۔ ورنہ...''

اداس نسلیں میں اور بھی بہت سے مقامات ہیں جہاں اس نسل کی ذہنیت کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے جو اس

دور پر آشوب میں پروان چڑھ رہی تھی۔ معاشرے میں موجود آمرانہ اور ناروا داری کے رویوں نے انھیں اس مقام پر لا کر کھڑا کر دیا تھا جہاں ایک جنگ جاری تھی خود اپنے وجود سے اور ان سے جو اس جنگ میں انھیں ایندھن کی طرح استعمال کر رہے تھے۔ مزدور، کسان اور وہ ہزاروں لوگ جو سراپا احتجاج بن چکے تھے۔ تشدد اور عدم تشدد کے ہر مقتل میں وہ موجود تھے۔

"میں جانتا ہوں" نعیم نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ کرایا۔ "لیکن عزت اور آبرو کے لیے ایک بڑی جنگ کی ضرورت ہے۔ اس سے بھی بڑی جو میں نے دیکھی ہے۔ ہمارے پاس ہتھیار نہیں ہیں۔ ہم کمزور ہیں۔ نیچے جا کر ہم ایک وسیع جنگ شروع کر سکتے ہیں۔ ایک نئی جنگ، جو بغیر اسلحے کے ہوگی اور کروڑوں میں ہوگی۔ اس طرح، جیسے ہم کر رہے ہیں۔ ہم کوئی جنگ نہیں جیت سکتے۔"

کہا جاتا ہے کہ دنیا کی تاریخ میں شاید پہلی طبقاتی جنگ مصر کے غلاموں نے ۱۸ ویں صدی قبل مسیح کے وسط میں (تقریباً ۱۷۵۰ ق م کے قریب) فرعون وقت اور بالادست طبقات کے خلاف لڑی تھی۔ کسانوں، مزدوروں، دستکاروں اور غلاموں کی بھاری اکثریت جو بدترین غربت کا شکار تھی اس نے فرعون کو تخت سے ہٹا دیا اور دولت مند زمینداروں کو ان کے گھروں سے نکال دیا۔ خوراک کے ذخیرے لوٹ لیے گئے، ٹیکس اور خراج کی دستاویزات جلا دی گئیں۔ مصری وقائع نے لکھا ہے، "زمین کمہار کے چاک کی طرح گھوم گئی۔"

بیسویں صدی کے ہندستان میں صدیوں پہلے مصر جیسی حالت تو نہ تھی مگر وسائل پر جو لوگ قابض تھے ان کی ذہنیت کسی فرعون سے کم نہ تھی۔ ان کے خلاف ملک کے وہ ہزاروں، لاکھوں کسان، مزدور اٹھے جو آزادی کے خواہاں تھے اور جنھیں اپنی زمین پر آزاد انسانوں کی طرح رہنے کا حق تھا۔ مگر اس حق کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے احتجاج کا جو طریقہ اختیار کیا وہ کچھ اور تھا۔

"تم جنگ پر سے لوٹ کر دو سال تک کیا کرتے رہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں؟ کانگریس کی طرف سے کام کرتا رہا۔"

وہ پھر سلائیوں پر جھک گئی۔

"کیوں؟" نعیم نے پوچھا۔

"مجھے علم ہے۔"

"پھر؟"

"اب کیوں نہیں جاتے؟"

یہ سارے مہینے نعیم اور اس کی بیوی کسانوں میں پھرتے رہے اور انھوں نے ایک بہت بڑی، بدلتی ہوئی دنیا دیکھی، سر اٹھاتے اور کمر سیدھی کرتے ہوئے کسانوں کی دنیا جو تیزی سے بدل رہی تھی... ہندستان کے شدید موسموں میں وہ دور دور کے گاؤں میں پیدل پہنچے اور کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسانوں سے مخاطب ہوئے.... ان پڑھ اور پیدائشی لاعلم کسانوں کے لیے یہ قبول کرنا بڑا مشکل کام تھا کہ ان کی زمینوں کا مالک،

جاگیردار، ان کا محسن نہیں بلکہ دشمن تھا... ان کے چھوٹے موٹے کام کرنے میں ان کی مدد کی اور وہ سب کچھ کیا جو ہر کسان کرتا ہے تو ان کا عمومی پن سب پر واضح ہوگیا۔ اور انھوں نے نئے سرے سے ان کی باتیں سنیں جنھوں نے ان کے دلوں میں گھر کرلیا۔ اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ساتھ ملک کے لاکھوں کھیتوں میں جھک کر اور کام کرتے ہوئے کروڑوں کسانوں نے سر اٹھایا اور کمر سیدھی کی اور غرور سے ابرو پر انگلی تھپکا کر پسینہ خشک کیا۔ یہ ہندستان کا بدنصیب کسان تھا۔

... آخر جب حالات اور واقعات کے زور سے وہ بیرونی طاقت میسر آگئی تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور مظلومیت کا احساس غصے اور نفرت میں تبدیل ہوگیا۔ انھوں نے اپنے آلام زدہ مقدر کو محسوس کیا اور یہ بڑی بات تھی۔ ملک کی تاریخ میں پہلی بار کسانوں نے اپنی حیثیت بیل سے بلند تر خیال کی۔"

جلیانوالا باغ کا جلسہ، فائرنگ، پرنس آف ویلز کی آمد کے خلاف احتجاج، کالی جھنڈیاں، سائمن کمیشن گو بیک کے نعرے، ڈانڈی مارچ، نمک قانون کی مخالفت، ہڑتالیں، جلوس، ستیہ گرہ نوآبادیات کی ایک بدلتی ہوئی صورتِ حال کی حقیقت ہیں۔ یہ سارے واقعات معاشرے کی تاریخ مدون کرتے ہیں اس آدمی کی نہیں جسے عبداللہ حسین نے "اداس نسلیں" کے بہت سے کرداروں میں خلق کیا ہے۔ "اداس نسلیں" میں یہ آدمی اس پُر آشوب دور کی علامت یا استعارہ ہے جو نوآبادیاتی فکر کے خلاف ردِ عمل کے طور پر ابھرا تو ضرور مگر وہ ان اداس انسانوں میں ہے جن کا انجام ہمیشہ ناآسودگی میں ہوا ہے۔ نعیم، عذرا، شیلا، مدن، علی وغیرہ تو فقط نام ہیں اس آدمی کے جسے خود اپنی جستجو ہے۔ تقسیم کی لکیر پر وہ آدمی کہاں گم ہوگیا یا گم کردیا گیا یہی وہ سوال ہے جو ناول کے پس منظر میں بار بار ابھرتا ہے۔ عبداللہ حسین کا اپنا ایک فلسفہ ہے جس کی روشنی میں بھی اس ناول کو دیکھا جاسکتا ہے۔

"میرا ایک فلسفہ بھی بن گیا ہے کہ انسان کی ذات پر بہت سے ظلم آزمائے جاتے ہیں۔ شروع سے آخر تک یعنی پیدا ہونے سے مرنے تک کچھ زندگی کی صورت ہی ایسی ہے، چاہے وہ یہاں ہو، چاہے یورپ میں ہو۔ انسان کی زندگی پر بہت سے ظلم ہوتے ہیں، تھوپے جاتے ہیں، آزمائے جاتے ہیں اور ان سے بچ کر نکل جانا یا بچ کر زندہ رہنا انسان کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے اور یہ ظلم صرف سیاسی ظلم ہی نہیں ہیں، اس کی کئی شکلیں ہیں۔ آپ کی زندگی ایک مسلسل کشمکش بن کر رہ جاتی ہے اور آپ کسی اسٹیج پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ اب میرے سارے کام ہوگئے، مسئلے حل ہوگئے اب میں آرام سے بیٹھ سکتا ہوں۔"

اس زمانے میں اداس نسلیں کی معنویت اس لیے کچھ اور بڑھ گئی ہے کہ اس کے بہت سے حوالے آج بھی اتنے ہی سچ ہیں جتنے کل تھے۔ پامال ہوتے ہوئے خوابوں کا ایک اور سلسلہ شروع ہوچکا ہے جو زمین کو نگلتی ہوئی اونچی اونچی عمارتوں، ناپید ہوتے جنگلوں، بنجر کھیتوں، مردہ فصلوں اور خشک ہوتی ہوئی ندیوں کے ساتھ دور دور تک پھیلتا جارہا ہے۔ نوآبادیات کا یہ نیا محاورہ بھی ایک کہانی ترتیب دے رہا ہے۔ مگر ایسی کہانی جس کے کردار پامال ہوتے ہوئے خوابوں کے دیکھنے کا احساس بھی کھو بیٹھے ہیں۔

■■

اسیم کاویانی

پھول جو اصلی تھے
مصنوعی لگے گلدان میں

(محمد اسلم پرویز کی مرتبہ کتاب 'منٹو اور چچا سام' کا تنقیدی مطالعہ)

عروس البلاد ممبئی کے ادیب و صحافی محمد اسلم پرویز منٹو کے ایک پُر جوش مداح ہیں۔ گذشتہ کئی برسوں سے وہ بڑی خاموشی کے ساتھ منٹو شاسی اور ناشناسی کی تاریخ کے اہم نکات نشان زد کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے کئی مضامین میں منٹو کی کائناتِ فن کے کم دیدہ گوشوں کو بھی اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ موقع بہ موقع منٹو پر سیمی نار، مباحثے اور ڈراموں کے انعقاد اور مراٹھی، ہندی اور گجراتی کے ادبی حلقوں کو منٹو آشنا کرنے میں بھی اُن کے خلوص اور لگن کی ایک الگ داستان ہے۔ چند برس قبل وہ احمد ندیم قاسمی کے نام لکھے منٹو کے خطوط 'آپ کا منٹو' میں پیش کر چکے ہیں۔ اب حال ہی میں مجھے اُن کا مرتبہ چچا سام کے نام لکھے منٹو کے خطوط کا مجموعہ 'منٹو اور چچا سام' موصول ہوا ہے۔

چچا سام کے نام منٹو کے یہ خطوط ۱۶/دسمبر ۱۹۵۱ء تا ۲۶/اپریل ۱۹۵۴ء کے اٹھائیس مہینوں کے درمیان لکھے گئے تھے۔ یہ نو خطوط (دراصل آٹھ، چھٹا خط 'ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے') پہلے پہل ۱۹۵۴ء میں چھپے منٹو کے افسانوی مجموعے 'اوپر، نیچے اور درمیان' میں شامل کیے گئے تھے اور اردو کے زیادہ تر نقادوں نے انھیں توجہ کے قابل نہیں سمجھا تھا لیکن مرتب کا ماننا ہے کہ ان خطوط میں منٹو کی مستقبل فہمی کے نقوش موجود ہیں اور اسی کی بازیافت اور تفہیم کے لیے اُنھوں نے یہ مجموعہ شائع کیا ہے۔ ہمیں نو مرتب مجموعہ مکاتیب میں دائیں اور بائیں اُن کے دو مبسوط مضامین (ایک بشکل مقدمہ اور ایک بصورت خط) میمنہ و میسرہ کی طرح کیل

کا نٹے سے لیس اس طرح محاذ سنبھالے ہوئے نظر آتے ہیں کہ لگتا ہے مرتب کو بھی کھٹکا لگا ہوا ہے کہ کہیں نہ کہیں منٹو کو کمک کی ضرورت پڑے گی۔

میں نے اپنے مضمون کے ابتدائی حصے میں مرتب کا دعوا و مدعا اور مصنف کا مواد و مضمون تنقید اور تجزیے کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور دوسرے حصے میں زبان و بیان کے اعتبار سے بحث کی ہے۔

(۱)

ان خطوط میں کسی خاص موضوع کے فقدان اور جا بجا منٹو کی پریشاں نگاری (digression) کو دیکھتے ہوئے، ان کے حسن و قبح پر رائے زنی دشوار تھی۔ اس لیے میں نے ان میں حاوی موضوعات کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے جو تقریباً مساوی حجم میں اور ہر حصے کا لبِ لباب پیشِ نظر رکھ کر ان خطوط کے تجزیے کی کوشش کی ہے، ساتھ ہی مرتب کے معروضات پر بھی نظر کی ہے۔

مجھے حیرت ہے کہ اس مجموعے کا تقریباً ایک تہائی حصے پر محیط ذکرِ نسواں، مرتب کے نسیاں کا شکار کیوں کر ہوا! واقعہ یہ ہے کہ آٹھ میں سے سات خطوط میں جہاں تہاں منٹو کے سر پر عورت اگر سوار نہیں ہے تو اُس کا پنڈ چھوڑتی بھی نہیں دکھتی۔ کہتے ہیں کہ مصر کا عیاشِ زمانہ شاہ فاروق کسی بھی عورت کو اُس کی ٹانگوں کی طرف سے دیکھنا شروع کرتا تھا، عورت کے چہرے پر اُس کی نظر بعد میں پڑتی تھی۔ منٹو نے فلم 'بیدنگ بیوٹی' (!) کیا دیکھ لی، ہالی ووڈ کی ایکٹریسوں کی ننگی ٹانگیں اُس کے ذہن پر مستول ہو گئیں اور وہ اُس نے ان خطوط (نمبر ۱، ۲، ۴، ۵، ۸ اور ۹) میں جا بجا پھیلا رکھی ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ چچا سام ایسی 'ملین ڈالر ٹانگوں اور ملین ڈالر جوبنوں' والی لڑکیاں پاکستان بھیج دے تاکہ وہاں کے اور تھوڑکس لوگ جو بے چارے اپنی بیویوں کی ٹانگوں ہی پر گزارا کر رہے ہیں، 'اپنا جی پشوری کر لیں'۔ مزید برآں اگر فوجی امداد میں امریکی اسلحہ کے ساتھ امریکی حسن کا اسلحہ خانہ بھی چلا آئے تو کیا کہنے! امریکی لڑکیاں پاکستانی نوجوانوں کے زخم پر مرہم رکھنے کے علاوہ اُن کی جھینپ دُور کرنے، ساقی گری کرنے اور اُنھیں رقص اور بوسے کے آداب سکھانے کا فرض بھی ادا کر سکیں گی۔ البتہ الزبتھ ٹیلر جو چلی آئے تو اُس کا بوسہ منٹو اپنے حق میں محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ ایک بار بمبئی سینٹرل کے اسٹیشن پر فیشن کی ماری اینگلو انڈین، پارسی اور یہودی لڑکیوں کو امریکی فوجیوں کی بغلیں گرم کرتے دیکھ کر اُس نے اپنی حسرت زدگی کا اظہار یوں کیا تھا کہ 'بے چارے ٹامیوں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں'۔

منٹو نے روسیوں کے ثقافتی وفد کی پذیرائی میں پاکستانی ترقی پسندوں کو سرگرم دیکھ کر چچا سام کو تاکیداً تحریر کیا تھا کہ وہ جلد از جلد امریکن پن اپ گرلز کا برشگالی وفد (موسم برسات کی رعایت سے) بھیج دے تاکہ وہ اُن ترقی پسندوں کی گرم جوشیوں پر پانی پھیر دے۔ منٹو نے اس وفد کو شورش کشمیری جیسے گائڈ کی رہبری میں، ہیرا منڈی کی سیر کرانے کی پیش کش بھی کی تھی۔

منٹو کا قلم کہیں کس پروف لپ اسٹک سے چپکا ہے تو کہیں ریتا ہیورتھ سے چپاں ہے۔ پاکستان کی عورتوں کا پردے سے باہر آنا اُسے اس لیے نہیں سہاتا کہ امریکی میکس فیکٹر نے اُن کا حلیہ مزید بگاڑ دیا ہے۔ اس پر 'اپوا' (آل پاکستان ومنس ایسوسی ایشن) کی چالیس برس کی عمر سے متجاوز عورتوں کی تخفیفِ لباسی نے اُن کی

ہیئت کذائی حسن کو واقعی نظارہ سوز بنا دیا ہے۔ اُن کے کلوبت (!) چڑھے پیٹ کا موازنہ ہالی ووڈ کی بڑھیوں کے پیٹ سے کرتے ہوئے منٹو نے اپنی حیرت کا اظہار کیا تھا کہ مجال ہے جو وہاں ایک جھری بھی نظر آجائے۔ کیا وہ منہ زبانی بچے پیدا کرتی ہیں!'

اِس اخباری خبر پر کہ بھارتی حسینائیں اپنی زلفوں کے پیچ و خم میں قمقمے روشن کر رہی ہیں، منٹو کا ذوقِ عریانی اُسے اس وسعتِ خیالی تک لے جاتا ہے کہ کیوں نہ وہ قمقمے ان کے بلاؤز کے اندر جگمگ کیا کریں! یہاں تک کہ وہ چچا سام کو ایک ایسا تابناک سفوف بنانے کا آئیڈیا پیش کرتا ہے'۔۔۔جسے کھا کر اُن کا سارا بدن روشن ہو جایا کرے اور کپڑوں سے باہر نکل نکل کر اشارے کیا کرے'۔

اپنے آخری دو خطوط میں اُس نے پاکستان آئے خیرسگالی وفود کے سلسلے میں شاہِ ایران، شاہِ عراق، پرنس علی خان، مہاراجا جے پور اور اپنے پچیس شہزادوں کے ساتھ شاہ سعود کے دُورہ ہائے مسعود کا ذکر کیا ہے۔ کہیں پرنس علی خان اور عرب و ایران کے شاہان کی رنگین مزاجی کا قصہ چھیڑا ہے تو کہیں ان فرماں رواؤں کی نگہِ التفات کی اُمیدوار پاکستانی ہائی سوسائٹی کی نا کتخدا اور باکرہ لڑکیوں کے جوڑ پیوند کے امکانات پر کسی مشاطہ کی سی چترائی سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ چچا سام کی ممالک اسلامیہ پر نظرِ کرم دیکھ کر وہ اُسے اسلام کو امریکا کا سرکاری مذہب بنانے کی صلاح دینے سے بھی نہیں چوکتا۔ ترغیب یہ ہے کہ 'شاہ سعود کی مردم خیزی مذہبِ اسلام کی دین ہے۔ امریکی بھی تعددِ ازواج سے کام لینا سیکھ جائیں گے اور اُنھیں جاپان فتح کرنے کے لیے حرامی بچے پیدا کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی'۔ پھر 'شاہ سعود کے صدری نسخے' بھی کمک پہنچانے کے لیے موجود ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ۔۔۔ہندو مذہب، عیسائی ریلیجن، بُدھ مت۔۔۔آخر یہ ہیں کیا؟'' ان کے ماننے والوں میں کیا کوئی مردِ مجاہد پچیس لڑکوں کا باپ ہونے کا دعوا کر سکتا ہے؟' تتمے (آخری خط) میں اُس نے خود انکل سام کے لیے ایکٹرس عشرت جہاں بنو کا رشتہ پیش کیا ہے جو کہ کئی شوہروں کا تجربہ رکھتی ہے اور ریٹا ہیورتھ کو بادۂ ہر جام بنا کر مسٹر سہروردی، مولانا بھاشانی، چودھری فضل حق اور خواجہ ناظم الدین جیسے شایانان نکاح کے ساتھ اپنی اُمیدواری بھی درج کرادی ہے۔ کسی خط کے خاتمے پر منٹو نے چچا سام کو ہیرا منڈی کی طوائفوں کی طرف سے عرضِ مجرا کی اطلاع بہم پہنچائی ہے، کسی خط میں ایک حسینہ کی مچھیرن کی چولی پہنے پیٹ کا ننگ دِکھاتی تصویر بطورِ 'پاکستانی گُدگُدی' بھیجی ہے، کسی خط میں بنڈی لانا اور جین ٹیرنی کو اپنے 'اُڑتے ہوئے بوسے' بھیجے ہیں۔

یہ ملخص ہے تقریباً بیس صفحات کے حجم کے ایسے ہی معمولی خیالات کا، جس میں کسی حد تک اسلام کے تعددِ ازواج اور مغرب کی عریانیت پسندی پر منٹو کی آزادیِ رائے کا اظہار ہوا ہے، بس۔ مجھے یہ ماننے میں کوئی عذر نہیں کہ ایک شادی شدہ مرد کی مسرتوں کا انحصار اُن عورتوں پر ہے، جن سے اُس نے شادی نہیں کی۔ ایسے میں وہ یہاں زیادہ سے زیادہ ایک دل پھینک رومیو نظر آتا ہے اور مرتب کے اس بیان کی کوئی حقیقت نہیں رہ جاتی کہ 'یہ نو کے نو خط اول تا آخر جاں سوز لمحات سے لبریز اور ملولِ خاطر ہو کر لکھے گئے ہیں'۔ (ص: ۲۸)

ثلثِ ثانی میں ہم جس بات کو پھیلا ہوا پاتے ہیں، اُسے غالب سے لے کر منٹو تک، بلکہ آج تک کے ہر اردو مصنف کا دل پسند موضوع کہا جا سکتا ہے، یعنی 'محرومیِ قسمت کی شکایت'۔ منٹو کا اردو زبان کا سب سے

بڑا یا ایک بہت بڑا افسانہ نگار ہونے کے دعوے سے انکار کا یارا کیسے ہو سکتا ہے! اُس کے بائیس کتابوں کا مصنف ہونے کے باوجود کرایے کے مکان میں رہنے، بمشکل دو وقت کی روٹی جٹا پانے، ڈسٹری کی گھٹیا شراب پینے، ایک مقدمے میں تین سو روپیوں کا جرمانہ ادا نہ کر سکنے اور سائیکل کی سواری پر مجبور ہونے کا اظہارِ غم یقیناً توجہ طلب اور دادرسی کے قابل ہے، لیکن اپنے ذہنی انتشار اور پریشان فکری کے باعث وہ ناقدریِ فن کے عوامل یا ناداریِ فن کار کے محرکات پر کہیں کوئی کارآمد گفتگو پر آمادہ نہیں نظر آتا۔ اُسے اپنی حرماں نصیبی کے مداوے کے لیے کم از کم جم خانہ وہسکی، پیکارڈ کی سواری اور تین سو روپے ماہانہ کا امریکی وظیفہ مطلوب ہے اور اس کے عوض اُسے اگلے جنم کی غلامی بھی منظور ہے۔ وہ رشک کرتا ہے کہ امریکا میں لوگ اپنے مُردوں، حتا کہ پالتو جانوروں کی لاشوں تک کی ملمع کاری کرنے یعنی سجانے سنوارنے کا اہتمام روا رکھتے ہیں اور 'ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ'۔ اسی لیے وہ امریکا جانا چاہتا ہے تاکہ وہاں جا کر اپنی کایا کلپ کرائے اور امریکی چال، امریکی بُشرٹ اور پیکارڈ سے لیس ہو کر لوٹے۔ پھر لاہور کے مال روڈ سے منہ میں پائپ دبائے پیکارڈ دوڑاتا ہوا، دوسرے ادیبوں کو یہ احساس جتائے کہ 'وہ لوگ اب تک بھاڑ ہی جھونکتے رہے ہیں'۔ اُس وقت اُس کا قلمی کریئر اگرچہ کوئی اٹھارہ برس کا رہا ہوگا، پر اُسے اپنی سلور جوبلی منانے کی عجلت ہے اور اسی للک میں اُسے چچا سام کے آگے گڑگڑانا بھی منظور تھا۔۔۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک پراگندہ روزی پراگندہ دل ادیب کی ہزاروں خواہشوں میں سے وہ چند ہیں جن پر اُس کا دم نکلتا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اِن باتوں میں اُن بلند و بالا مطالب تک پہنچنے میں ناکام رہا ہوں، جو مرتب کا مقصود رہا ہے۔

ایک طرف کمیونزم دشمن امریکا کی پیٹھ تھپتھپانے کے مشغلے اور دوسری طرح خود منٹو کی ترقی پسندوں سے اُلفت-نفرت کے سے تعلقات نے بھی کئی گل کھلا رکھے ہیں۔ کہیں پر وہ مغربی پنجاب کے گورنر کی کمیونسٹوں کے خلاف کارروائی پر شاداں و فرحاں ہے۔ کامریڈ فیروز الدین منصور کی گرفتاری کا خواہاں ہے اور احمد ندیم قاسمی، سبطِ حسن، عبداللہ ملک اور احمد راہی کا خیرخواہ تک نہیں نظر آتا تو کہیں اپنے ان ہی کامریڈ دوستوں کو اس لیے بخش دینے پر مائل ہے کہ ان سے اسے قرض مل جاتا ہے۔

خطوطِ منٹو کے (بہ اعتبارِ موضوع) دو تہائی متن میں ہم اُس کے تفنّنِ طبع اور شگفتہ قلمی کے کچھ جھلملی جلووں ہی سے دل شاد کر پاتے ہیں، اور بس۔ میرا خیال ہے اب تک ہم اُس '۔۔۔سیاسی و سماجی یا ثقافتی منظر نامے پر ہونے والے واقعات کے اخلاقی و تخلیقی دباؤ سے چچا سام سے مکالمے کی مجبوری' (ص: ۹) کو نہیں ڈھونڈ پائے ہیں جو کہ بقول اسلم اِن خطوط کے لکھے جانے کا جواز ہو سکتا ہے۔ مگر آخری تہائی کے نفسِ مضمون میں کئی مقام ایسے ہیں جہاں ہم واقعی سعادت حسن کی بجائے منٹو سے مل سکتے ہیں اور یہ وہ مقام ہیں جہاں اُس نے مذہب و سیاست پر اپنے قلم کی دھار آزمائی ہے۔

تقریباً اسی دور میں کرشن چندر نے اپنی کسی تخلیق میں ہندستان کے وزیرِ اعظم پنڈت نہرو کو مخاطب کیا تھا۔ کرشن کے مقبول زمانہ گدھے نے تو پنڈت نہرو کا انٹرویو بھی لیا تھا اور اُنھیں اپنی سواری بھی کرائی تھی، کہتے ہیں کہ اس بات پر نہرو کرشن سے خفا ہو گئے تھے۔ منٹو نے بڑی چھلانگ لگائی اور چچا سام کو خط لکھے۔ جیسا کہ وہ بھی

جانتا تھا، یہ خط چچا سام تک نہیں پہنچے۔ اس میں شک نہیں کہ ان خطوط میں کئی مقامات پر اُس نے چچا سام کے سیاسی عزائم پر سیدھے حملے کیے ہیں، پھر یوں بھی ہے کہ کھڑکی میں سے سانڈ کو دھمکانا آسان ہوتا ہے۔

بہرطور ان خطوط کے ایک تہائی کے بقدر متن میں اس کی سیاسی آگہی و بے باکی کے نظارے موجود ہیں۔ منٹو نے لکھا تھا کہ اُس کا ملک غریب اور جاہل ہے اور اس کا یہ حالِ زار انکل سام اور جان بُل کے مشترکہ ساز کا ایسا تار ہے جسے وہ چھیڑنا نہیں چاہتا، لیکن اُس نے اپنی 'برخوردارانہ حیثیت' کے باوجود یہ ساز چھیڑا اور اپنی پیشین گوئیوں کے وہ سُر پیش کیے جو سچائی کے امانت دار ثابت ہوئے۔ بھارت واقعی کمیونزم کے سحر کا گرفتار ہوا۔ پاکستانی مُلا واقعی امریکا کے لیے انتہائی کارآمد ثابت ہوا۔ روس کا آنا اور اپنا پاندان اُٹھا کر لوٹنا بھی واقعہ بنا۔ ہند چین، ہند پاک، ویت نام اور کوریا کے تصادموں سے امریکی اسلحہ ساز کارخانوں کے پوبارہ ہونے میں بھی کوئی شک نہ رہا۔ ہندستان اور پاکستان کو امریکی امداد اور ہتھیار کی متواتر سپلائی نے منٹو کی مکشوفہ انکل سام کے من کی مراد بھی پوری کر دی، وہ یوں کہ اپنی آزادی کے اڑسٹھ برس بعد بھی ہر دو ملک کے عوام جمہوریت نما اور آمریت آسا نظام فریب کے دھندلکوں میں اپنے خوابوں کی سحر ڈھونڈ رہے ہیں۔

منٹو نے بنیاد پرستوں کی بے بصیرتی، ملکی اداروں کی موقع پرستی اور بیرونی طاقتوں کی ابلہ فریبی کے مظاہر دیکھ کر طنز و مزاح کے ہلکے پھلکے پیرایے میں جس طرح ان خطوط میں مذہبی و سیاسی اداروں کو نشانہ بنایا تھا، اگر آج بھی وہ طنز برمحل، کاری اور لطف کا حامل محسوس ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان آج بھی فلم 'شعلے' کے اسرانی کی طرح انگریزوں کے زمانے کا جرنیل ('ہم آج تک نہیں بدلے') بنا ہوا ہے یا بقول اسلم امریکا کے henchman کا کردار ادا کر رہا ہے۔

منٹو نے جب، سرِ بازار ڈھیلا اُٹھا کر شلوار کے اندر ہاتھ ڈال کر ڈرائی کلین کرنے والی مخلوق کو تضحیک و استہزا کا نشانہ بنایا تھا تو وہ اُس وقت بھی دریابادی قسم کے مولاناؤں کے عتاب کا نشانہ بنا تھا۔ آج اگر اکیسویں صدی کا ملا بھی اسی سنتِ قدیمہ پر مُصر ملے تو اس سے بڑا المیہ کیا ہوگا! مرتب کو منٹو کا یہ کردار اس لیے بھی مرغوب ہے کہ کم از کم پچھلی چھے دہائی کی خوں فشاں سیاستِ اسلامی کی داستانِ آہ و فغاں کا وہ بھی شاہد یا آگاہ رہا ہے، جس میں منٹو کے اسی کردار کے استعارے لہرا رہے ہیں: ڈاڑھیاں، عمامے، تسبیحیں، شلواریں۔۔۔۔ یہاں بے اختیار ڈنمارک کی ایک ضرب المثل یاد آگئی کہ 'اگر ڈاڑھی ہی پر سب باتوں کا مدار ہوتا تو بکرا جیت میں رہتا۔'

مرتب کی یہ شکایت بجا ہے کہ پاکستان کے اربابِ دانش نے وہاں کی خرابیِ حالات کے داخلی اسباب اور اپنے طرزِ فکر کی ریاکاری کے محاسبے سے ہمیشہ گریز کیا اور محض امریکا سے بنتے بگڑتے رشتوں کے تناظر میں اُس کو کوسنے کے لیے منٹو کی سیاسی بصیرت کی ستایش کی ہے۔ یہ منتخب اور موقع پرستانہ اعترافِ فن چہ معنی دارد؟ لیکن اس سے یہ نتیجہ برآمد کرنا کہ 'ادب کو سماجی دستاویز کے طور پر پڑھنا یا پرکھنا، ادب کو ریاست اور سیاست کی نوآبادی بنانے کے مترادف ہوگا' (ص: ۱۱)، مناسب نہیں۔ منٹو کے خطوط کے ایک تہائی مواد کی کسی حد تک اہمیت اسی لیے برقرار ہے کہ وہ آج ساٹھ برس بعد کے سیاسی و مذہبی منظر نامے سے بھی مربوط نظر آتا ہے۔ ان خطوط میں نام و مقام و کردار اور زمانے کا تعلق اتنا صاف اور واضح ہے کہ ہم چاہ کر بھی بموجب اسلم منٹو کی تخلیقی و

معنوی امکانات کی وسعتوں کو، بدلتی ہوئی صورتِ حال کے ساتھ اپنے contextual حوالوں کے مراکز بھی بدلتا ہوا...' (ص:۱۱) نہیں ثابت کر سکتے، نہ ہی منٹو نے یہاں باوصف خوبیِ تحریر اپنے بنیادی فکری نکات کے ایسے استعارے خلق کیے ہیں جو زمین و زماں کے تعین سے ہٹ کر بھی درخشاں نظر آئیں۔ ممکن ہے آئندہ بھی مرتب کی غواصی وہ گہرہائے آبدار بھی نکال لائے۔ آخر ہربرٹ ریڈ نے ایسے ہی تو نہیں کہا تھا کہ 'معیاری تنقید تخلیق در تخلیق کا عمل ہے۔'

منٹو پر مرتب کی تحریریں پڑھتے ہوئے اکثر محسوس ہوا ہے کہ منٹو نے اگر کہیں محابا روا رکھا ہے، اُس نے وہاں بے محابا ہونے میں مضائقہ نہیں سمجھا۔ وہ منٹو کے ترکش میں ایسے تیر بھی رکھ دیتا ہے جو اُس کے نہیں ہیں۔ اس مقالے میں بھی جہاں منٹو کے طنز کو سیلی بر رخسار کہا جا سکتا ہے، مرتب نے اُس سے مکّوں کی بارش کرا دی ہے (ص:۲۸)۔

دیکھا جائے تو امریکی فوجی امداد کی بدولت پاکستانی ملّا کے مُسلح ہونے کے اندیشہ ہائے دور دراز کا طنز ہی ان مکتوبات کا سب سے کارگر عنصر ہے۔ اس کے علاوہ چند سیاست دانوں مثلاً مولانا بھاشانی، مسٹر سہروردی اور فیروز خان نون وغیرہ پر خوش مذاقی کے چند فقروں، تقسیمِ ملک، غلط بخشی، ناپرسی حکومت اور ڈسٹلری کی گھٹیا شراب کے ہاتھوں اپنے حالِ تباہ کے ماجرے، طبقۂ اعلا کی خوش فعلیوں پر سرسری تبصرے اور چچا سام سے بھارت کی پروا کیے بغیر پاکستان کی فوجی امداد جاری رکھنے کے اصرار کے علاوہ پاکستانی سیاست پر طنز و تنقید کا کوئی اور پہلو ان خطوط میں ہمیں نہیں ملتا۔ ایسا بھی کچھ نہیں ہے کہ 'منٹو امریکا کو محض ایک punching bag کی طرح استعمال کر رہا ہو اور اصل نشانہ پاکستان کے اہلِ سیاست ہوں' (ص:28) جیسا کہ مرتب قائل کرانا چاہتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ کہیں جگہ پاکستان تو پس منظر میں ہے اور منٹو نے اپنے خطوط کے صفحات کو امریکا اور روس جیسے لڑاکا مرغوں کی پالی بنا رکھا ہے۔ عالمی منظرنامے میں ان دو بڑی طاقتوں کی برتری کی کشاکش نے ظاہر ہے کہ منٹو کے خطوط کے لیے کافی دل چسپ سامان مہیا کر دیا ہے۔ چچا سام کو مکتوب الیہ بنانے کی مصلحت نے منٹو کو جا بجا کمیونزم کی مذمت کرنے، پاکستان سے کمیونسٹوں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کی تدبیریں اور امریکا کی سُرخ روئی کی تجویزیں پیش کرنے پر مجبور کیا ہے کہ وہاں یہی مناسب ہے۔ جب کہ تقریباً پندرہ سال قبل بمبئی میں مصوّر ویکلی کے اڈیٹر کی حیثیت سے اُس نے جواہر لعل نہرو کو لکھے اپنے ایک خط میں اُنھیں یہ باور کرانا مناسب سمجھا تھا کہ 'وہ اُن کی انقلاب انگیز سرگرمیوں اور سوشلزم کو کتنا پسند کرتا ہے۔ وہ خود روسی ادب کا مترجم اور اُس کے خاص نمبروں کا مدیر رہ چکا ہے اور یہ کہ وہ ہندی فضا کو اشتراکی افکار کے پنپنے کے لیے کتنا سازگار سمجھتا ہے' اسی کو کہتے ہیں ع چلو تم اُدھر کو، ہوا ہو جدھر کی۔ منٹو نے یہ خط مصوّر کے خاص نمبر کے لیے نہرو کے پیغام اور تصویر کی درخواست کے طور پر لکھا تھا۔

۱۹۵۳ء میں امریکی گلوکار اور اداکار پال روبسن (Paul Robeson، لیکن اشرف اور اسلم دونوں ہی کے نسخوں میں 'پال روبنسن' چھپا ہے۔) اشتراکیت پسندی کے الزام میں امریکی ظلم کا نشانہ بنا تھا۔ وہ اپنے

پاسپورٹ، تنخواہ اور سفر کرنے تک کے حق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ منٹو نے چچا سام کو اُسے گولی سے اُڑا دینے کا منصوبہ بتایا ہے۔ اسی برس چارلی چپلن نے بھی امریکی پالیسیوں سے بیزار ہو کر سوئزرلینڈ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ منٹو نے پھبتی کسی ہے کہ 'اُس مسخرے کو کیا سوجھی، ضرور اُس کو کمیونزم ہو گیا ہے۔' منٹو نے چچا سام سے پنجاب کے گورنر فیروز خان نون کو خاص طور پر نوازنے کی سفارش کی تھی، اس لیے کہ وہ کمیونسٹوں کو کچلنے میں سب سے فعال تھے۔ منٹو نے جا بجا ایسی صلاحیں دے کر اپنی برخورداری کا ثبوت دیا ہے۔

کمیونسٹوں کے سلسلے میں اُس کا یہ بیان بھی کافی دلچسپ اور حقیقت پسندانہ ہے کہ 'ہو سکتا ہے کہ (میں) قادیانی بن جاؤں، مگر کمیونسٹ تو میں کبھی نہیں بنوں گا، اس لیے کہ یہ سالے محض زبانی جمع خرچ سے کام لیتے ہیں۔ ہاتھ سے کچھ بھی دیتے دلاتے نہیں ہیں۔' (ص: ۹۰)

منٹو نے چچا سام کو لکھے ایک خط میں اپنا ایک افسانہ امریکی سفارت خانے کے کسی شخص کے ذریعے تین سو روپیوں میں خریدے جانے کا ذکر کیا ہے۔ اس پس منظر میں منٹو کی خوش گمانی کے یہ مظاہرے کہ کیوں نہ چچا سام اُس کا وظیفہ مقرر کر دیں! کیوں نہ وہ پاکستان کو دی جانے والی فوجی امداد، منٹو کے تبادلے سے مشروط کر دیں! کیوں نہ امریکی تعلقاتِ عامہ کے تحت پاکستان میں بانٹی جانے والی رقوم منٹو کی معرفت سے پہنچے! یا کیوں نہ چچا سام کم از کم اُس کی تشنگی دور کرنے کے لیے وہسکی اور علاج کے لیے ٹیرامائی سن ہی بھیج دیا کریں! منٹو کے جس میلانِ طبع کو ظاہر کرتے ہیں، اس پر فاضل مرتب قطعی خاموش ہے، جب کہ درماندۂ روزگار منٹو امریکی سفارت خانے کے چکر بھی لگا رہا تھا۔ وہ خود ہی یہ اطلاع فراہم کرتا ہے کہ 'لاہور کے امریکی سفارت خانے کے چپراسی تک اُس سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے اور وہاں کے دو تین جونیر پاکستانی افسر تو اُس کا نام سنتے ہی اُسے گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔' (ص: ۲۷) یہاں پر بے اختیار شمیم عباس کا ایک شعر یاد آ گیا۔

سب بکاؤ ہیں، خریدار بھی ہیں سب کے سب
آپ سودا ہے کہیں، جو کہیں سودائی ہے

مرتب اگر ان باتوں کو منٹو کی قلمی اٹکھیلیاں سمجھتا ہے تو یہی انداز تو منٹو کے سارے خطوط میں موجود ہے! کیا وجہ ہے کہ وہ خود بھی پاکستانی دانش وروں کی طرح منٹو کے منتخب بیانات پر تو اپنے کچھ مجوزہ دعووں کی عمارت کھڑی کرنا چاہتا ہے لیکن بیشتر بیانات سے اس لیے نظریں چرانا چاہتا ہے کہ وہ اُس کے دعووں کو کہیں نہ کہیں زک پہنچاتے ہیں یا اُس کے ہیرو کی کچھ اچھی شبیہ نہیں پیش کرتے بلکہ سامراج پسند تک ثابت کر سکتے ہیں! یہاں شمس الحق عثمانی کی کہی ہوئی یہ بات صادق آتی ہے کہ 'ہمارا نقاد اپنی بات کہنے کے شوق میں زیادہ مبتلا ہے اور یہ شوق اسے متن سے ہٹا دیتا ہے۔'

کئی ادیبوں نے منٹو کے یہاں فکری بھٹکاؤ کی طرف اشارہ کیا ہے، جو کہ ان خطوط میں بھی موجود ہے یہی وجہ ہے اردو کے معروف نقادوں نے انھیں قابلِ اعتنا نہیں پایا اور منٹو کو کبھی عسکری نے اپنا سمجھا تو کبھی کامریڈوں نے غیر جانا۔

مرتب چوں کہ منٹو کی کم توجہی کی شکار تخلیقات میں بھی اُس کی عظمتِ فکر کے نئے نئے منطقے دریافت

کرنے میں کوشاں ہے، اس لیے اُس نے کہیں کہیں ماچس کی ڈبیا کو بھی بارود کا ڈھیر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے پاکستان کی بربادیٔ حالات پر وہاں کے اربابِ اقتدار اور مقتیانِ کرام کے طرزِ فکر، اُن کی ہوسِ زر، تہذیبی نرگسیت، خود فریبی اور کذب و ریاکاری کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے اور اس بنا پر تہذیبی تعصب، مذہبی تنگ نظری اور سیاسی ابتری کے موجودہ عہد تک کے کتنے ہی گناہوں کی فردِ عمل پیش کر دی ہے۔ (تفصیل کتاب کے ص: ۱۴-۱۵ پر ملاحظہ ہو۔) اور اس ساری خرابی کا مسبب اسبابِ پاکستانی دانش وروں کی کوتاہی فہم کو قرار دیا ہے کہ چوں کہ اُنھوں نے منٹو کے متن کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنے emphasis کے مراکز بدل دیے تھے، اس لیے وہ منٹو کی 'futuralogy' سے فیض نہیں اٹھا سکے۔ کبھی اسی طرح کی بات مومن نے بھی کہی تھی۔ مگس کو باغ میں جانے نہ دینا، کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا۔

دراصل ان خطوط میں منٹو نے اس دور کے حالات اور اخبارات کی شہ سرخیوں پر اپنے رواں دواں شگفتہ انداز میں کچھ بکھرے ہوئے خیالات پیش کر دیے ہیں، جنھیں آج بھی ٹک دیکھ لیا دل شاد کیا اور چل نکلے، قسم کی تحریر کہا جا سکتا ہے۔ مرتب نے ان خطوط کے کچھ سیاسی تبصروں کو 'پروفیسی' کا درجہ دینے کے لیے منٹو کے مضامین کے اقتباسات اور چند ادیبوں کے بیانات کے cut and paste سے بھی مدد لی ہے اور اُن کی اس بلند آہنگی سے تفہیم کی ہے کہ شجاع خاور کی کہی ہوئی بات یاد آگئی ع پھول جو اصلی تھے مصنوعی لگے گلدان میں۔

رشید حسن خان نے علامہ شبلی کے اسلوب کا فاضلانہ تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ شبلی کی تحریر میں رچی شعریت اور خطابت نے اُسے بلا کی رنگینی اور رعنائی بخشی ہے، لیکن یہ تحقیق کا اسلوب نہیں ہو سکتا اور تنقید کو بھی راس نہیں آتا۔ مرتب کے مضمون کے مبالغہ آمیز زورِ بیان اور اس طرح کے فقروں: 1- 'مملکتِ خداداد کے آسمان سے اُترنے والا ہر وہ جور جسے وہ براہِ راست اپنے جسم اور اپنی روح پر وصول کر رہا تھا۔ اسے پوری قوت اور استدلال کے ساتھ رد کر رہا تھا۔ (ص: ۳۵)، 2- 'یہ خطوط اندھیرے میں نکلی ہوئی چیخ کی طرح ہیں اور اس چیخ کے ساتھ بہت سے دیکھے، ان دیکھے چہرے، کہی، ان کہی بپتائیں بھی لپٹی ہوئی ہیں۔' (ص: ۳۵)، سے ظاہر ہے کہ ایسے افسانوی اسلوب اور انشائی استدلال سے بھی تنقید کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ محمد حسن عسکری نے جس پُر فریب طریقے سے منٹو کے متن کی تعبیر پیش کی تھی، اُسے مرتب نے بجا طور پر تنقید کا نشانہ بنایا ہے، لیکن خود اُس نے منٹو کے چنندہ شذرات کو جس رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیا ہے اسے بھی سراہا نہیں جا سکتا۔

دراصل 'منٹو اور چچا سام' میں شامل خطوط کا saving grace محمد اسلم پرویز کا (چچا) منٹو کے نام لکھا وہ خط ہے جو اس کتاب کے آخر میں شامل ہے۔ فرسودہ عقائد اور بنیاد پرستی کی مذمت میں اردو کے اکثر دانش وروں کی زبانِ قلم لکنت زدہ نظر آتی ہے، لیکن اسلم کو اس آتشِ نمرود میں بے خطر کودتے دیکھا گیا ہے۔ منٹو شناسی کے اس سرگرم سالار نے طنز و مزاح، مطائبات اور قولِ محال کی خوش ترکیبی سے اپنے مکتوب کو ایک طنزیہ شہ پارہ بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔

اسلم نے جس خوبی سے تقسیم کے المیے کے اُس طرف کے سیاسی و تہذیبی زوال، منٹو نوازی کی مصلحت

پسندی، اُس کی بُری کہانیوں کے بُری کہانیوں میں بدلنے کی ستم ظریفی، ثقافتی احتساب، رادھا کی بانہہ پکڑنے کے لیے عبدالباری کو کرشن مراری سے بدلنے کی مجبوری، اگلے وقتوں کے۔۔۔ ادیبوں اور ترقی پسندی کے نقیبوں کی منٹو ناپسندی کے فلیش بیک کو پیش کیا ہے اور۔۔۔ اس طرف جس طرح گاندھی جی کے قاتلوں کی راشٹریتا اور سیکولر ڈیموکریسی کے ڈھول کا پول کھولا ہے۔ اچھوتوں کی نظر نہ آنے والی ہانڈیاں اور انکل سام کی نادیدہ عالمی چاچائیت دکھائی ہے، اس کی داد دیے ہی بنتی ہے۔ اُس نے کفایت لفظی کے سلیقے سے منتخب لفظوں میں طنز کی بجلیاں بھر کر رکھ دی ہیں۔ اس خط کے کتنے ہی تلخ اور تیکھے فقرے مطالعے کے بعد بھی ذہن میں گونجتے رہ جاتے ہیں، مثلاً:

پاکستان میں 'نیا قانون' کو قطع و برید کے بعد شامل نصاب کیے جانے پر کیا کاٹ دار تبصرہ کیا ہے:

■ 'پاکستان میں کانٹ چھانٹ کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ پاکستان۔'

ترقی پسندوں کی ترقی معکوس پر اس سے بہتر طنز شاید ہی کسی نے کیا ہو:

■ 'ہمارے یہاں اب ترقی پسند نہیں نظر آتے، حالاں کہ ترقی کو پسند کرنے والے رجعت پسند بڑی تعداد میں موجود ہیں۔'

منٹو کے پاکستان چلے جانے پر بلونت گارگی نے کہا تھا کہ 'منٹو پاکستان کی حرام زدگیوں کو فاش کرنے کے لیے وہاں گیا تھا۔' اسلم کے تبصرے نے اس کی گونج ماند کر دی ہے۔ میرا ماننا ہے کہ مستقبل میں گفتۂ گارگی کی بازگشت اسلم کے قول کے بنا ادھوری کہلائے گی:

■ 'میں تو بس یہ سوچتا ہوں کہ حرام زدگیوں کا پردہ فاش کرنے کے لیے وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی۔ سیاسی حرام زادے یہاں تعداد میں کم تھوڑے ہی ہیں۔ گننے بیٹھیں گے تو ایک دو داو پر ہی نکلیں گے۔'

عالمی سیاست میں چچا سام کی 'دبنگئی' پر اسلم کا یہ تبصرہ بھی نجانے کتنی تلخیاں سموئے ہوئے ہے:

■ 'ظاہر ہے کہ چچا سام جیسا لائف ٹائم چچا جس کے پاس ہو، اس کا دشمن اگر خود کو عراق سمجھنے لگے تو اس میں کیا غلط ہے۔ اگر اوپر والے نے غلط دیسوں میں پیٹرول دیا ہے تو اس غلطی کو سدھارنے کے لیے چچا سام بھی تو عطا کیا ہے جو پیٹرول والے دیسوں کا تیل نکال سکے۔'

اگر میں اسی طرح مثالیں پیش کرتا چلا جاؤں تو مجھے تقریباً نصف مضمون نقل کرنا پڑے گا۔ میں نے اوپر کی سطروں میں اس خط کو اس مجموعے کا saving grace بتایا ہے، لیکن سچ پوچھیے تو یہ گل سر سبد ہے اور منٹو کے آٹھ خطوط پر بھاری ہے۔ اپنے کرافٹ اور ڈرافٹ کے لحاظ سے بھی یہ منٹو کی آوارہ قلمی سے بہتر ہے۔ اگرچہ اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں ہمارے مصلحت پسند نقادوں کو کچھ وقت لگے گا۔

اس خط میں مجھے ایک شذرہ بدمزہ کر گیا، جہاں مرتب کا دل بھی منٹو کی تقلید میں امریکی عورتوں کی 'ملین ڈالر ننگی ٹانگوں' پر مچلا ہے۔ اُس نے ظلم یہ ڈھایا کہ منٹو کے حسرتی نظارہ مرد کو اپنے خط میں مشتاقِ نظر عورت میں بدل دیا ہے اور ایسے پاکستانی سماج کو برقع بند قرار دیا ہے 'جہاں عورتیں شوہروں کے علاوہ کسی اور کے سامنے اپنی (ننگی) ٹانگوں کی نمائش کرنا afford نہیں کر سکتیں۔' (ص: ۹۷) اس پر مستزاد ہم کس معاشرے میں جی

رہے ہیں!' کا استفہامیہ طعنہ! معاشرے کے مثالی معیار کا کتنا اچھوتا نظریہ پیش کیا ہے مرتب نے۔ع ایسا بلند سب کا مذاقِ نظر کہاں! پاکستان پر تازیانے برسانے کے لیے ہمارے پاس ہزاروں جواز موجود ہیں برادرم۔'پاکستانی عورت کی فتنہ سامان ٹانگوں اور سینوں کے حوالے سے اُسے کوسنا کیوں پسند کیا گیا! 'طرفہ تماشا یہ کہ اس شذرے کی فتنہ سامانی کو محض آئندہ عبارت کے پیرایۂ بیان کی تزئین کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

''منٹو کی گم شدہ تحریریں' نامی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے حال ہی میں ایک مبصر نے سوال اُٹھایا ہے کہ 'آخر کسی تخلیق کار کی تمام تخلیقات کو جمع کرنے کا عمل کہاں تک بامعنی ہے؟ کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ بڑے سے بڑے تخلیق کار کی بھی ہر تخلیق بڑی نہیں ہوتی۔' کچھ اسی طرح کی بات انتظار حسین نے بھی اپنے کالم میں کہی تھی کہ ان گم شدہ چیزوں کی بازیابی سے نہ تو منٹو کا قد بڑھا اور نہ ان کے گم رہنے سے منٹو یا اردو کا کوئی نقصان ہوا تھا۔ چچا سام کو لکھے خطوط کی بازخوانی کا تو پھر بھی جواز موجود ہے، پر اس کی کئی تحریروں مثلاً احمد ندیم قاسمی کے نام لکھے خطوط، ناول 'بلا عنوان' اور کئی افسانوں اور ڈراموں کو بجا طور پر فراموش کیا جاسکتا ہے۔ ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ ممتاز شیریں سے لے کر وارث اور اسلم تک کی نصف صدی سے زائد کی منٹو فہمی کے بعد بھی آج کا نقاد منٹو کے فن کی کون سی گہرائیوں اور اَن گھائیوں کی تہ میں ہمیں پہنچانا چاہتا ہے کہ جہاں تک ہم نہیں پہنچ سکے ہیں۔ یوں بھی اردو والوں کا مزاج قرآن کے عرفان اور نبی کے پیامِ سادہ پر قانع نہ رہ کر تفاسیر کی معنی آفرینیوں اور احادیث کی معجز بیانیوں پر زیادہ فریفتہ ہے اور ان کی تفہیمات و تشریحات کے افتراق و اختلاف کی بنا پر باہم دست و گریباں ہی نہیں برسرِ پیکار بھی نظر آتا ہے۔ ایسے میں کیا ہمارے محققین کی موشگافیاں اور ناقدین کی نکتہ پردازیاں واقعی قاری کو قلم کار کے قریب لے جا رہی ہیں یا ع شُد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا، کا معاملہ ہے! کہیں ان کی نظریہ پرستیوں، مصلحت اندیشیوں، گروہ بندیوں اور ماورائے متن معنی سازیوں نے آج کے قاری اور فنکار کے بیچ خلیجیں تو نہیں حائل کر دیں!

خلاصہ یہ کہ 'منٹو اور چچا سام' کا حاصل، محمد اسلم پرویز کا 'چچا منٹو کے نام لکھا وہ خط ہے جسے ہمارے عہد کے طنزیہ ادب کی ایک عمدہ مثال کہا جاسکتا ہے۔ اسلم نے منٹو کے خطوط کی سیاسی و مذہبی طنزیات کی تشریح کا کچھ زیادہ ہی حق ادا کر دیا ہے اور ان خطوط کی مجموعی تحسین میں تو حد سے گزر گیا ہے۔ دراصل تیر کا بدف سے آگے نکل جانا بھی اُتنا ہی بُرا ہے جتنا کہ نشانے تک نہ پہنچنا۔

(۲)

'نیا ورق' (شمارہ نمبر ۴۴) میں شائع ہوئے اپنے ایک تبصراتی مضمون 'پورا منٹو اور شمس الحق عثمانی' میں محمد اسلم پرویز نے عثمانی کی تدوینِ متن کی محنتِ شاقہ کو سراہا ہے اور منٹو کی تحریروں کو 'ذاتی جائیداد اور موروثی اوقاف سمجھ کر من مانی کرنے والے مرتبوں اور پبلشروں' کو لتاڑتے ہوئے لکھا ہے:

''کہنے کی شاید ضرورت نہیں کہ پبلشروں کے لیے منٹو کی تحریریں ہمیشہ سے ہی کماؤ پوت ثابت ہوئی ہیں اور منٹو فروشی کا سلسلہ برسوں سے جاری ہے۔۔۔۔۔۔۔ ناقدین، محققین اور پبلشروں کی خوش گمانیوں اور زود یقینیوں (!) نے کاتبوں کی غلطیاں اور پروف ریڈروں کی ذہنی غیر حاضریاں جس سعادت مندی سے دوہرائی

ہیں، اس نے ایک متن سے دوسرے متن کی غلطیوں کے سلسلے کو۔۔۔الخ'' (ص: ۱۹۰)

اب اسے ستم ظریفی نہیں تو اور کیا کہا جائے کہ مرتّب کی تازہ وارد کتاب (جسے کتابچہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا) 'منٹو اور چچا سام' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جس میں یہ واضح کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا گیا کہ کتاب میں شامل چچا سام کے نام منٹو کے خطوط کا مآخذ کس کتاب کو بنایا گیا ہے!

بادی النظر میں زیر تبصرہ کتاب کے متن کا ایک ایک پیرا بازار میں دستیاب ہمایوں اشرف کے مرتبہ 'منٹو کے مضامین' (مطبوعہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۵ء) پر مبنی نظر آتا ہے، بس جو مواد وہاں ۴۹ صفحات میں موجود ہے، یہاں ۷۵ صفحات میں پھیل گیا ہے۔ اس کی اُمید کم ہی نظر آتی ہے کہ ان دونوں متون کا بنیاد گزار اور کوئی مصدر مرتّب کے پیش نظر رہا ہو، اس لیے کہ اشرف کی کتاب کی کمپوزنگ کی غلطیاں بھی اُن کی کتاب میں سلیقے سے شامل کر لی گئی ہیں، یہاں تک کہ اسمائے خاص تک کی غلطیوں کو مرتّب نے پوری سعادت مندی کے ساتھ منتقل کرنے کا اہتمام روا رکھا ہے، مثلاً: لائڈ جارج، ریٹا ہیورتھ (Rita Hyworth) اور تمارا خانم (ڈانسر) کا نام اس کتاب میں بالترتیب 'لانڈ جارج' (ص: ۵۴)، ریٹا ہیورتھ/ریٹاورتھ' (ص: ۹۱،۶۶) اور 'تمہارا خانم' (ص: ۶۶،۶۵) اپنے محل و مقام پر اسی طرح درج ہے جیسا کہ ہمایوں اشرف کے یہاں۔

ایک جگہ یہ دیکھ کر دل خوش ہوا کہ 'سنوائی' کو 'شنوائی' (ص: ۶۴) کر دیا گیا ہے، اسی طرح 'شہزادوں' کو 'شہزادوں' (ص: ۸۵)، لیکن اس سے کئی گنا افسوس حاصل ہوا جب چند مقامات پر عبارتیں ہی غائب پائیں۔ مثال کے طور پر زیر تبصرہ کتاب میں ص: ۵۸ پر تیسرے پیراگراف ('امریکی اوزاروں سے کتری ہوئی لبیں۔۔۔الخ') اور ص: ۷۲ پر پانچویں پیراگراف ('چچا جان میں اُن لوگوں کے سامنے۔۔۔الخ') میں کچھ نہ کچھ عبارت محذوف ہے جسے مکمل کرنے کے لیے اشرف کی کتاب کا صفحہ نمبر ۶۱/اور ۷۳ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ 'کفنا دفنا'، کی بجائے 'کفنا' اور 'رود باد' کی بجائے 'رد باد' جیسے کھانچے تو جگہ جگہ پڑے ہوئے ہیں، جنھیں شاید پڑھنے والوں کے ذوقِ سلیم کا امتحان لینے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔ ہم منٹو کے مواد و متن کے فروق و اغلاط کا پیچھا چھوڑ دیں تو بھی مرتّب کی تحریر [پیش لفظ (اپنی بات)، ایک مقالے (چچا سام، منٹو اور پاکستان، ایک بازیافت) اور ایک مکتوب (پاکستانی چچا منٹو کے نام ہندستانی بھتیجے کا ایک خط) پر مشتمل 47 صفحات] میں جا بجا سہو و خطا کے نشانات ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ کہیں ایسا عالم بھی نہیں ہے کہ ہم غالب کی زبان میں 'لغزشِ رفتارِ خامہ مستیِ تحریر ہے' کہہ کر در گزریں۔ لگتا ہے کہ کتاب مرتّب کی نظر ثانی کی محتاج رہی ہے یا پھر کسی بازارو پبلشر کی بے پروائی کی بھینٹ چڑھ گئی ہے۔

مناسب ہوگا کہ بات املے سے شروع کی جائے۔ ۱۹۴۳ء میں 'انجمن ترقی اردو' کی جانب سے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی اصلاحات اِملا کی تجاویز، پھر تین دہائی بعد ۷۴-1973ء میں ان تجاویز کی تشریحات اور مزید تحقیقات کی رشید حسن خان کی دستاویزی کتاب 'اردو املا' اور اسی دور میں 'ترقی اردو بورڈ' (موجودہ 'قومی اردو کونسل') کی سفارشات املا، بعد ازاں ان تجاویز، اصلاحات اور سفارشات پر ماہرین زبان کے تبصروں اور تجزیوں کا کتنا کچھ کام ہوا ہے اردو املا پر۔ مرتّب کی اس سے لاعلمی نہیں تو بے نیازی افسوس ناک ہے۔

یہاں ذیل کی فہرست 'الف' میں مرتّب کی تحریر سے متروک یا غلط طرز املا کی مثالیں پیش کی گئی ہیں اور فہرست 'ب' میں اُن الفاظ کا متداول یا اصلاح شدہ املا درج کیا گیا ہے۔

الف:

دیجئے، لیجئے، سوچئے، دیکھئے، کیجئے، چاہئے، چھوڑیئے، کئے، بھیجئے، چلئے، انہوں، جنہوں، انہیں، جنہیں، شئے، تہہ دتہہ، آعظمی، اندیکھے، آزمائش، بالکل، ابتدائی، کریہہ وغیرہ

ب:

دیجیے، لیجیے، سوچیے، دیکھیے، کیجیے، چاہیے، چھوڑیے، کیے، بھیجیے، چلیے، انھوں، جنھوں، انھیں، جنھیں، شے، تہ درتہ، اعظمی، ان دیکھے، آزمایش، بلکل، ابتدا، کریہ وغیرہ۔

شاید مرتّب کا یہ خیال ہو کہ اصلاح شدہ املے کو پوری طرح قبولِ عام حاصل نہیں ہوا ہے یا اس کی کچھ باتیں متنازعہ ہیں، لیکن اسے کیا کہا جائے کہ بھانجا، بھتیجا، وتیرہ، ڈھانچا، چٹکلا، گذشتہ، پتا اور اچمبھا جیسے لفظ اپنی اسی صحیح صورت میں تقریباً ڈیڑھ سو برس قبل چھپی ڈنکن فاربس (Duncan Forbes) کی ڈکشنری میں مل جاتے ہیں، لیکن مرتّب انھیں آج بھی بھانجہ، بھتیجہ (کہیں 'بھیتجا' بھی)، ڈھانچہ، چٹکلہ، گزشتہ، پتہ اور اچنبھا لکھنے پر مُصر ہے! اسی طرح روپیے کا املا اس کے یہاں 'روپے'، 'روپئے' اور 'روپیے' ہر کرنسی میں رائج ہے! ویسے کہیں کہیں کوئی غلط املے کا لفظ اکا دُکا جگہ جدید املے میں بھی آگیا ہے، ٹائپنگ کی 'غلطی' سے۔

اردو تحریر میں انگریزی الفاظ کا استعمال وہیں مناسب سمجھا جاتا ہے، جہاں اُن کا متبادل اردو زبان میں موجود نہ ہو یا پھر وہ انگریزی الفاظ جو مسلسل استعمال سے زبان میں دخیل ہو چکے ہوں قبول کر لیے جاتے ہیں، لیکن دیکھا گیا ہے کہ نوجوان لکھنے والوں میں بلا ضرورت انگریزی الفاظ کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے۔ مرتّب بھی اُن ہی میں شامل ہے۔ یہاں اُس کے استعمال کردہ الفاظ کی فہرست سازی مطلوب نہیں، البتہ اسپیلنگ کی چند لغزشیں، قوسین میں درست لفظوں کے ساتھ درج کی جا رہی ہیں۔ گمانِ غالب یہی ہے کہ یہ نظرِ ثانی سے رہ گئی ہیں:

● (Controversial Prone Zone) Controversial Porn Zone

● (relevant) relevent

● (futurology) futuralogy ● (paradox) parodox

● (ghetto) gheto ● (camouflage) camaflougue

● (henchman) hentch man ● (visionary) visionery ● (exile) excile

● (hard core) hardcore ● (Payroll) pay role

تقسیمِ ملک کے بعد کے پُرتشدد فسادات کے لیے 'بہیمانہ' کی نسبت (ص: ۳۲) بلکل ٹھیک ہے۔ اسے وحشیانہ اور شیطانی بھی قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن 'بے شرمانہ' کی تخصیص کے ساتھ انھیں orgy show قرار دینا محلِ نظر ہے۔ 'orgy' کے معنی ہیں: 'بدمستوں کی محفل جس میں شراب اور فحاشی شامل ہو' یا 'کسی بھی کارروائی میں بے جا جوش وخروش، غلو'۔ 'بے شرمانہ' کی صفت اُن فسادات کی خوں چکانی اور سنگینی کو ظاہر کرنے سے قاصر

ہے۔ مزید یہ کہ show سے بنی ترکیب ہی واہیات ہے۔ اس کے علاوہ منٹو نے اپنے خطوط میں جس انگریزی فلم 'بیدنگ بیوٹی' (!) کا ذکر کیا ہے، تعجب ہے کہ شیدائے منٹو اسلم کو اس کے نام میں کوئی عجب نظر نہیں آیا! اس نام کی کوئی فلم ہالی ووڈ کی فلم ہسٹری میں نہیں ہے۔ ہالی ووڈ کی کچھ فلمیں دوسرے ملکوں میں تبدیلی نام کے ساتھ بھی پیش ہوتی رہی ہیں، ایسے ناموں میں بھی ویسا مجہول نام کہیں نہیں ہے۔ البتہ جنوری 1952ء میں ریلیز ہوئی ڈائرکٹر vincente minnelli کی ایک فلم کا نام The Bad and The Beautiful ضرور ملتا ہے اور ممکنہ طور پر یہ وہی زمانہ ہے، جب منٹو نے اپنے خط میں 'بیدنگ بیوٹی' کا ذکر چھیڑا تھا۔

ہر اچھے لکھنے والے کی کوشش ہوتی ہے کہ تابمقدور صحت زبان کا خیال رکھے، اس کے باوجود دیکھا گیا ہے کہ مشہور و معروف مصنفین کے یہاں بھی ادبی لغزشیں اور زبان کی غلطیاں مل جاتی ہیں۔ کہا گیا ہے کہ ان سے بچنا محال ہے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ایک مبصر یا نقاد انھیں نظر انداز کردے اور یہ توقع رکھے کہ اس کے معاصر بھی اس کی گرفت کرنے سے باز رہیں گے۔ دراصل زبان و بیان کی لغزشیں سامنے لائی جاتی رہنی چاہئیں تا کہ اصلاح اور ترقی کا در بند نہ ہو، اسی مقصد سے یہاں کچھ مثالیں پیش کی جارہی ہیں:

● ص ۴: 'چہ جائیکہ' کی جگہ 'اگرچہ' کا محل ہے۔ ● ص ۵: '۔۔۔مملکت کے سماجی، سیاسی، انتظامی، تہذیبی، ثقافتی، مذہبی، اخلاقی، ذہنی اور جذباتی اُمور آتے ہیں'۔ اس جملے میں 'ذہنی اور جذباتی' کا ٹکڑا قطعی زائد ہے، اس لیے کہ ان تمام اُمور کی کارفرمائی ذہن و جذبات ہی سے ہے۔ ● ص: ۵ 'پورا منٹو تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اُس کی نمائندہ تحریروں کی کمک میرے خیال میں کافی نہیں'۔ یہاں 'تحریروں کی کمک' کی بجائے تحریروں کا ذخیرہ ہونا چاہیے۔ 'کمک' امدادی فوج کو کہتے ہیں۔ ● ص: ۵ '۔۔۔ایک خاص معنی میں یہ (خطوط) ہلکے پھلکے ہی ہیں لیکن غور و فکر کرنے کے عنصر سے یکسر خالی نہیں'۔ اس عبارت میں 'غور و فکر پر مائل کرنے' لکھنا چاہیے تھا۔ ● ص ۷: 'منٹو کی ادبی روایت سیاست سے نہ گھبراتی تھی اور نہ ہی۔۔۔'' 'نہ' کا مقام اول حذف کے قابل ہے۔ 'روایت' کی جگہ فہم، ذکاوت، وجدان یا کسی اور لفظ کا استعمال مناسب ہوتا، 'روایت' تو وہ اسلم اور اسیم کے لیے ثابت ہوگی۔ اسی صفحے پر ایک ہی سطر میں 'دوران' کا دوسری بار استعمال 'درمیان' کی جگہ ہوا ہے۔ ● ص ۹: 'پرتا نک جھانک' کی جگہ 'تاک جھانک' صحیح ہوگا۔ ☆ ص 11: 'کھونٹ' مؤنث ہے، سہواً مذکر استعمال ہوا ہے۔ ● ص ۳۲: ایک ہی سطر میں 'خاردار جھاڑیوں' کا جہاں دوسری بار استعمال ہوا ہے، وہاں سے اُنھیں ہٹا دینا چاہیے تا کہ تحریر و تفہیم کی راہ صاف ہو۔ ● 'کاٹ چھانٹ' اُن کی زبان پر ہر جگہ (ص: ۳۵، ۹۶، ۹۸ اور ۹۹) 'کانٹ چھانٹ' ہے اور 'سکوی' (سکوڑنا سے) سکڑی ہو گیا ہے۔ ● 'چھوں وسر ہن' (ص: 13) کے معنی میں نہیں سمجھ سکا، جو بھی ہوں۔ واوِ عطف نہیں ہوگا۔

سہوِ قلم کی کچھ مزید مثالیں درج ذیل ہیں۔ وضاحت کو غیر ضروری سمجھ کر صرف متبادل لفظ قوسین میں درج کر دیا گیا ہے:

● کسی بھی عورت پر (کا) بلا تکار کیا جا سکتا ہے۔' (ص: ۱۰۱)

• 'پاکستان کی خارجہ پالیسی کے (کی) داخلی ستم ظریفیوں ۔۔۔' (ص: ۲۳)
• 'چچا جان ایک بات کے لیے آپ کی تعریف کرنے (کرنی) ہی پڑے گی ۔' (ص: 104)
• 'اس طرح یہ خطوط اس کی زندگی کا سفر نامہ بھی ہے ۔' (ہیں) ۔ (ص: ۲۹)
• 'آپ نے پاکستان کی ٹانگوں کو نہ صرف کھول کر نمایاں کر دیا بلکہ اُن کے ڈراونے اور گھناونے پہلوؤں کو بھی کیسے مزے لے لے کر بیان کیے (کیا)۔ (ص: ۹۷)
حرفِ ربط 'کے' کی جگہ حرفِ بیانیہ 'کہ' اس دھڑلے سے استعمال کیا گیا ہے کہ ناطقہ سر بگریباں ہے اِسے کیا کہیے!
• 'نہ صرف محسوس کر رہا تھا بلکہ بغیر کسی تامل اور تکلف کہ اپنے پڑھنے ۔۔۔' (ص: ۱۳)
• 'موئذن کی رسم آپ (نے) بڑے سلیقے سے ادا کی، لیکن پورے کہ پورے ملک کو اپنے استرے کے نیچے لے آنا ۔۔۔' (ص: ۹۷)
• 'چچا جان ۔۔۔ سماجی و سیاسی حالات سرحد کے دونوں طرف جوں کہ توں قائم ہیں ۔' (ص: ۱۰۳)
• '۔۔۔ سب کہ سب یا تو آپ کے چچا کے داغی غلام ہیں یا کان پکڑی باندیاں ۔' (ص: ۱۰۳)
اسی طرح حرفِ بیانیہ کی جگہ حرفِ ربط کے غلط استعمال کی مثالیں بھی موجود ہیں:
• '۔۔ یہ بھی ہر کوئی جانتا ہے کہ اگر ان کے ہاتھ جتنے 'کے' لمبے ہیں، اگر اس سے بھی لمبے ہوتے تو ۔۔' (ص: ۱۰۲)
چوں کہ بازاری پبلشروں کو کام سونپ دیے جانے پر ٹائپنگ کی غلطیوں سے مفر محال ہے، اس لیے 'پیشین گوئیوں' کی جگہ 'پیشن گوئیوں' اور 'ماورائے تنقید' کی بجائے 'مارو ائے تنقید' (ص: ۱۶) جیسی بیسیوں غلطیوں کی تفصیلات میں جا کر میں قارئین کا وقت برباد کرنا نہیں چاہتا۔ اس ضمن میں کل کے کاتبوں سے لے کر آج کے ٹائپسٹوں تک ایک ہی حال ہے، ع وہی اک چال بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔ پبلشر کی نالائقی کی اس سے بڑھ کر مثال کیا ہوگی کہ اسلم کے خط کی شہ سُرخی 'پاکستانی چچا منٹو کے نام' میں خط کشیدہ دو لفظوں کو مکھی پر مکھی کی طرح یوں چڑھا رکھا ہے کہ ایک بھی پڑھا نہ جائے۔ یوں تو اسلم کا طرزِ تحریر واضح، طنز سے معمور اور پُر زور ہے۔ ہم اُن کی باتوں سے پوری طرح اتفاق نہ کریں تب بھی اُسلوب کی اثر آفرینی سے انکار ممکن نہیں، پھر بھی کہیں کہیں ژولیدہ بیانی راہ پا گئی ہے۔
• 'منٹو اور چچا سام' کے انتساب کی عبارت یوں ہے:
'منٹو صاحب! آپ کے ان خطوط کی رسید آپ کی بھتیجے ساجد رشید کے حوالے کر رہا ہوں۔'
محمد اسلم پرویز، 26 فروری 2015ء
مجھے کوشش کے باوجود اس انتساب میں تفنّنِ طبع کا کوئی پہلو نہیں ملا۔ آخر منٹو کے خطوط کی رسید مکتوب الیہ چچا سام یا اُن کے کسی سکریٹری کی بجائے محمد اسلم پرویز نے کس حیثیت سے دینے کی زحمت کی ہے؟ ساٹھ برس بعد رسید دینے کی کیا تک ہے؟ وہ رسید بھی ساجد رشید کے حوالے سے پہنچانا جو کہ چار برس پہلے راہی ملکِ

عدم ہو چکے ہیں! اور ہاں متوفی کے نام کے ساتھ لفظ 'صاحب' کا استعمال مناسب نہیں سمجھا جاتا۔

● اپنے مقدمے کے ص: ۳۵ پر مرتب رقم طراز ہے: "۔۔۔اس کے افسانوں کو پاکستانی سرکار نے نصاب میں شامل کر لیا مگر کانٹ چھانٹ کر (اس فقرے پر مجھے اعتراض کانٹ چھانٹ پر اتنا نہیں جتنا کہ لفظ 'مگر' پر ہے) گویا پورا منٹو ہمیں ابھی تک قبول نہیں ہے۔ 'اگر' اور 'مگر' جیسے الفاظ اب بھی اس کی جان سے چمٹے ہوئے ہیں۔"

۔مرتب کے محولہ بالا فقرے کو 'اگر اور مگر' کے بنا ذیل میں درج کیا جارہا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ اب بھی اُس کے لیے قابل قبول ہوگا!

'اُس کے افسانوں کو کاٹ چھانٹ کر پاکستانی سرکار نے نصاب میں شامل کر لیا ہے۔'

● اسی مضمون نما مقدمے کے ص: ۸ سے شروع ہو کر ص: ۹ پہ ختم ہونے والے ایک طویل پیراگراف کے اول و آخر کے فقرے یوں ہیں:

"جس وقت منٹو نے چچا سام کے نام یہ خط لکھے

سیاسی موضوعات سے تانک جھانک کرنے والے افسانے بھی منٹو نے اسی دور میں لکھے۔" اس کے فوراً بعد غیر ضروری طور پر یہ اطلاع دوہرائی گئی ہے کہ 'ان سیاسی افسانوں سے قطع نظر چچا سام کے نام منٹو کے یہ نو خط اس وقت کی ہی یادگار ہیں۔' (ص: ۹)

● کبھی احمد ندیم قاسمی کو کہے گئے منٹو کے اس قول پر کہ 'تم ادب کے وزیر خارجہ ہو اور ہم ادب کے وزیر داخلہ ہیں۔' مرتب نے ایک جگہ یہ متوازن تبصرہ کیا ہے کہ 'میرے خیال میں اس کی فنکارانہ سرشت کو اس طرح نہ تو کسی ایک مخصوص وزارت کے تابع لایا جاسکتا ہے اور نہ ہی مختلف قلم دانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔' (ص: ۴) لیکن اسی مقالے میں آگے چل کر منٹو کی سیاسی بصیرت کی داد و ستائش کی جھونک میں رقم طراز ہے: 'اس کا اصل میدان تو ادب کے وزیر خارجہ ہی کا ہے۔' (ص: ۳۶)

● مندرجہ ذیل فقرے سے قاری خود پتا لگانے کی کوشش کریں کہ چچا سام سے اس کا بھتیجا دور ہے یا نزدیک!

'چچا سام کے بھتیجے کی حیثیت سے حواس، اعصاب، جذبات اور اخلاقیات کے منطقوں پر اس کا حصہ ہونے کے باوجود اس نے ایک فنکارانہ دوری قائم رکھی۔ سماج سے علاحدہ ہونے کے باوصف چچا سام کا یہ فرماں بردار، وفادار اور تابع دار لیکن مفلس بھتیجا اس میں ڈوبا ہوا ہے اور اس میں رچا بسا ہونے کے باوجود حاشیے پر ہے۔' (ص: ۲۷)

● منٹو نے اپنے مضامین 'اللہ کا بڑا فضل ہے'، 'سویرے جو کل میری آنکھ کھلی'، 'ترقی یافتہ قبرستان' اور 'دیکھ کبیرا رویا' میں جس طرح فرقہ پرستوں کی فتنہ سامانیوں، بنیاد پرستوں کی بداعمالیوں اور ابنائے زمانہ کی موقع پرستیوں اور عالمی سیاست کی فریب کاریوں کو طنز و تنقید کا نشانہ بنایا ہے، ان خطوط کے افکار پریشاں میں ہم اُس کی کچھ جھلکیاں ہی دیکھ پاتے ہیں۔ مرتب بھی لگ بھگ ہم خیال نظر آتا ہے، جہاں وہ منٹو کے چند مضامین کا

نام بنام ذکر کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہے کہ 'اُن میں جس طرح منٹو اپنے سیاسی و سماجی مشاہدات سے لطیفے اخذ کر رہا تھا، اس کی کچھ دھڑکتی ہوئی تصویریں ان خطوط میں بھی جا بجا ملتی ہیں' (ص: ۱۰)۔ تصویروں کے دھڑکنے کو چھوڑ دیں تب بھی 'کچھ' اور 'جا بجا' کی اُلجھن پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اسی مضمون میں آگے چل کر اپنی سابق رائے کے برعکس مرتب کی یہ تحریر ہمیں متحیر کر دیتی ہے کہ 'چچا سام کے خطوط کی طرح ان مضامین میں بھی منٹو کا شوخ اور کٹیلا اسلوب سان پر چڑھا ہوا ہے۔' (ص: ۲۰) لگتا ہے کہ وہ خود مذبذب ہے کہ خطوط اور مضامین میں سے کس پر کسے فوقیت دے!

حال ہی میں جریدہ 'آج کل' (مئی ۲۰۱۵ء) میں شائع شدہ اپنے ایک مضمون 'منٹو کے مکالماتی افسانوں پر ایک نوٹ' میں محمد اسلم پرویز نے منٹو کے اُن افسانوں سے بحث کی ہے جو منٹو کی معروف فنی خوبیوں سے خالی ہیں، اور سراہنے لائق بات یہ ہے کہ اُس مضمون میں مجموعی طور پر منٹو کے مکالماتی افسانوں کی کمزوریوں کا منصفانہ محاکمہ کیا گیا ہے، لیکن کہیں کہیں مضمون نگار کا قلم منٹو کا گرفتارِ سحر ہو کر اس کی تحسین فن میں ایسا انداز اختیار کر گیا ہے، جسے مستحسن نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً:

■ ہر افسانے کو جداگانہ تکنیک اور موضوع کو منفرد سلیقے سے برتنے کی صورتوں اور نوعیتوں نے منٹو کی افسانوی دنیا کو قدرے متنوع اور رنگا رنگ بنا دیا تھا۔' (ص: ۱۳)

■ بحیثیت افسانہ نگار فنکارانہ تکمیل میں تجربے کی حدت اور جرأت نے بھی اس کی کلیات کو تخلیقی نوادرات سے مالا مال کیا۔' (ص: ۱۳)

دل چسپ بات یہ ہے کہ اسی پیراگراف میں اسلم کا یہ بیان بھی نظر آتا ہے کہ 'منٹو کے پاس اگر عظیم اور غیر معمولی افسانوں کی تعداد اپنے معاصرین سے زیادہ ہے تو کمزور اور پست معیار افسانے بھی اپنے ہم عصروں سے کسی طرح کم نہیں۔'

زیر تبصرہ کتاب میں بھی منٹو کی مدح میں قطعیت اور کلیت کا یہ نامناسب اسلوب دیکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

■ '۔۔۔ اُس کی ہر تحریر ایک خیال، ایک جرح۔۔۔ داخلی سچائی کے احساس سے مالا مال' (ص: ۵)

■ 'کسی بھی تخلیقی تجربے میں منٹو اپنے وقت کے سوالوں۔' الخ (ص: ۴)

محتاط اہلِ قلم 'ہر افسانے'، 'کلیات'، 'ہر تحریر'، 'کسی بھی' جیسی قطعیت سے گریز کرتے ہوئے 'عموماً'، 'زیادہ تر'، 'اکثر' اور 'تقریباً' جیسے لفظوں سے عبارت سازی کرنا پسند کرتے ہیں۔

زبان و بیان کی لغزشوں کی متذکرہ چند مثالیں میں نے صرف مرتب کی تحریر کو سامنے رکھ کر بیان کی ہیں۔ منٹو کے یہاں بموجب اسلم '۔۔۔ ایک متن سے دوسرے متن کی غلطیوں کے سلسلے کو۔۔۔' چھیڑنا خارج از بحث سمجھا ہے۔ ایم آر پبلی کیشنز کی مطبوعہ یہ مختصر سی کتاب غلطیوں کی پوٹ ہے، جب کہ کتاب کے پیش لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرتب کو پروف ریڈنگ میں چھ مشہور ادیبوں نے بھی مدد فرمائی ہے۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔ ....(غیر مطبوعہ)

■■

افسانہ

ساجد رشید

جلتے پروں سے اُڑان

ریشم جیسے ملائم اور دھنک جیسے رنگین پروں سے سر نکال کر پرندے نے جب اپنے بازوؤں کو پھٹ پھٹایا تو ان پر ٹھہرے اوس کے ننھے قطرے مشرق کی بھوری پہاڑیوں سے جھانکتے سورج کی کرنوں سے ایسے دمک اٹھے جیسے پگھلے سونے کا فوارہ پھوٹ پڑا ہو۔ اس نے سرخ چونچ کو کھول کر فرحت بخش ہوا کو اپنے سینے میں بھر کر بڑی تازگی محسوس کی اور سر جھٹک کر آس پاس دیکھا۔ سب کچھ وہی تھا مگر کتنا دلکش!

سورج کی نارنجی کرنوں سے تمتمائی بھوری پہاڑیاں۔ پہاڑی کے پیروں کو دھوتی گہرے نیلے پانیوں والی ندی۔ دوسری جانب ندی میں گرتا دودھ جیسا جھرنا۔ کنارے پر بکھرا مخمل سا سبزہ اور ان پر جھلملاتی اوس کی بوندیں۔ خودرو پودوں پر منڈلاتی خوش رنگ تتلیاں۔ چھوٹے چھوٹے پتنگے۔ دائیں طرف تازہ سبز پتوں سے ڈھکا، گھنا جنگل۔ پیڑوں کی لچکدار مضبوط شاخوں پر پھدکتی چڑیاں اور ان کی چہکار۔ سرمئی نم مٹی پر تیز رفتاری

سے رینگتی چونٹیاں۔ جا بجا بکھرے سوکھے پتے ہوا سے کھڑکتے پتوں پر کانوں کو کھڑا کر لینے والے معصوم آنکھوں والے ہرنوں کا جھنڈ..... سب کچھ وہی تھا مگر کتنا دلکش!

چڑیوں کی چہکار، جھرنے کی جھر جھر، ہوا کے بہاؤ پر بہتی ندی کی کلکلاہٹ، سوکھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ، ندی کے کنارے صبح کی پہلی دھوپ سینکتے مینڈکوں کی ٹرٹراہٹ، پیڑوں کے تنوں پر چڑھتی اترتی گلہریوں کی چک چکاہٹ، سفید جھینگروں کی سیٹیاں اور ہم آغوش ہوتی لچکیلی شاخوں کی سرسراہٹ۔ ان آوازوں کی نغمگی سے سارا عالم گونج رہا تھا..... سب کچھ وہی تھا مگر کتنا دلکش!

پرندے نے سینہ پھلا کر آسمان دیکھا، بے داغ آسمان آج بھی اتنا ہی نیلا اور اتنا ہی چمکدار تھا جتنا کہ کل تھا۔ پرندے نے تنکوں سے بنے خوبصورت گھونسلے پر الوداعی نظر ڈالی اور دانے دنکے کی تلاش میں پر پھڑپھڑا کر اڑ گیا۔ اڑا اور اڑتا گیا۔ اوپر.. اوپر... بہت اوپر.....

ٹھیک پرندے کے سر پر آ کر سورج نے اسے معمول کے مطابق سبزہ زار میں اترنے پر مجبور کر دیا۔ دور تک سبزہ تھا اور دانے اس قدر بکھرے پڑے تھے کہ پرندے کو ہمیشہ کی طرح آج بھی سوچنا پڑا...."کہاں سے شروع کیا جائے۔

دانا چگتے چگتے وہ سیر ہو گیا تب اس نے دیکھا کہ سورج کا سایہ اس کے قدموں تلے نہیں ہے۔ بلکہ کچھ لمبا ہو گیا ہے۔ پرندے نے مٹی میں چونچ رگڑ کر قریب کی ندی سے شیتل جل پیا اور پھر ایک بار ہوا کو چیرتا فضا میں اڑتا چلا گیا۔ دانے سے پیٹ کے بھاری پن کو ہلکا کرنے کے لیے یہ اس کا معمول تھا۔ اسے ہر اڑان پر یوں محسوس ہوتا جیسے وہ بس ابھی چمکتے نیلے آسمان کو چوم لے گا۔ آسمان کو چومنے کی یہ خواہش اسے بس اوپر ہی اوپر لیے چلی جاتی۔ آسمان ابھی بہت اوپر تھا اور پروں میں تھکن رینگنے لگی تھی۔ اس نے آسمان کو چھونے کا فیصلہ ہمیشہ کی طرح کل پر ڈالا اور نیچے اترنے لگا۔

پرندے نے جب سر کو خم کر کے نیچے بکھری دنیا کو دیکھنا چاہا تو اچانک ہی اس کی پرواز تھم گئی۔ اس کا ننھا سا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ انہونی سی بات تھی۔ کہیں میں اندھا تو نہیں ہو گیا؟ اس نے آنکھوں میں لہراتے دھند لکے کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ نیچے سارے میں سیاہی مائل دھند پھیلی ہوئی تھی۔ دھند ایسی کہ پیڑ، پودے، ندی، نالے، پہاڑ، جھرنے اور میدان جانے کہاں کھو گئے تھے۔ کیا یہ سویرے کی دھند ہے؟ لیکن سویرا ابھی کیسے چلا آیا؟ اور پھر سویرے کی دھند تو بڑی خوشگوار ہوتی ہے وہ ایسی کثیف اور مٹ میلی تو نہیں ہوتی اور پھر اس میں خنکی بھی تو ہوتی ہے..... تو پھر یہ کیا ہے؟ دھواں اس کی آنکھوں میں گھس کر چن چناہٹ پیدا کرنے لگا تھا۔ پروں پر اپنے چھوٹے سے جسم کا توازن برقرار رکھتے ہوئے جب وہ دھوئیں کے کثیف بادل میں اترا تو اس کے سینے میں چنگاریاں اگر گئیں۔ پھیپھڑوں میں دھواں بھر گیا اور حلق میں چونٹیاں کاٹنے لگیں۔ سینے میں امنڈتے دھوئیں کی اذیب اور اکھڑتی سانس سے گھبرا کر اس نے بے اختیار چونچ کھول دی۔ مگر تکلیف سے نجات تو کیا ملتی سینے کی جلد بڑھتی ہی چلی گئی۔ تب خود کو بچانے کی کوشش میں وہ بے اختیار پر چلانے لگا۔ بالآخر وہ دھوئیں کی کثیف چادر کو چیر کر نیچے کھلے میں چلا آیا یہاں گھٹن کچھ کم تھی۔

زخمی سورج آسمان کے بھیگے مشرقی کنارے سے ٹکرا کر اپنا گاڑھا لہو چھوڑ گیا تھا۔ جو دھیرے دھیرے پھیل کر سیاہ ہو رہا تھا۔ مغرب میں گرتے سورج کا چہرہ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے زرد پڑ گیا تھا۔ فضا میں حبس اور ہوا میں حدت تھی۔ پرندہ تھک کر چور ہو چکا تھا۔ سینے میں درد ریت کے ذرے کی طرح رڑک رہا تھا۔ بازو ایسے شل ہو رہے تھے جیسے انھیں جاڑا مار گیا ہو۔ وہ اب کسی پیڑ کی مضبوط شاخ پر بیٹھ کر ستانا چاہ رہا تھا۔ اس نے تھکن سے بوجھ آنکھوں سے نیچے دیکھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ اس کے مختصر وجود میں ننھا سا دل جیسے اپنی دھڑکن بھول گیا۔ اسے ایک لمحے کے لیے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا، اسے لگا کہ تھکن نے اس کی آنکھوں کو گمراہ کیا ہے۔ اس نے بازوؤں کو جلدی جلدی حرکت دی کچھ اور نیچے آیا۔ مگر منظر بدلا نہیں کچھ اور واضح ہو گیا۔ اس نے دیکھا اور دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ یہ سب کیا ہے؟ وہ سب کہاں ہے؟ اس نے سوچا اور سوچ کر تڑپ اٹھا۔ آنکھوں نے جو کچھ بھی دیکھا وہ پرندے کے لیے حیرت انگیز تھا۔ سورج کے ڈھیر ہونے تک سارا عالم کیسے بدل گیا۔ کہاں ہیں وہ پیڑ، وہ پودے، وہ میدان۔ وہ سبزہ زار؟ کہاں ہیں ندیاں، وہ نالے وہ جھرنے؟ کہاں ہیں وہ غار، وہ ٹیلے، وہ پہاڑ؟ کہاں ہیں وہ ہرن وہ چونٹیاں، وہ مینڈک؟ یہ کیسا تغیر ہے؟ اُف یہ کیسا تغیر ہے؟؟

جنگل پہاڑوں اور ندیوں کی جگہ اب آسمان سے سر ٹکراتی سیسہ پلائی عمارتیں تھیں سیکڑوں ایکڑ میں پھیلی اسلحہ ساز فیکٹریاں تھیں۔ بڑے بڑے راڈر تھے۔ دیو پیکر ایٹمی تجربہ گاہیں تھیں۔ سینہ تانے ٹی۔ وی۔ ٹاور کھڑے تھے۔ بڑی بڑی دوربینیں تھیں جن میں ماہرین فلکیات کی آنکھیں گڑی رہتی تھیں۔ برقی تاروں کا ایک جال تھا اور ایک کنارے پر ترتیب سے بنی ایٹمی بھٹیاں تھیں جن کی کشادہ چمنیاں آج دھواں اور زہر اگل رہی تھیں۔ دھواں اس قدر تھا جیسے کسی بہت بڑے سوکھے جنگل کو آگ لگ گئی ہو، اسلحہ ساز فیکٹریاں اور ایٹمی بھٹیوں کی چمنیوں سے گاڑھا کالا دھواں ہاتھیوں کی طرح جھومتے ہوئے نکلتا اور فضا میں چادر کی طرح تن جاتا۔ کل کا نیلا شفاف آسمان اب یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے اس پر بے پناہ گرد جم گئی ہو۔ آسمان پر کسی مجرم کی طرح رینگتی سیاہی سے خوفزدہ ہو کر پرندہ اپنے گھونسلے میں اترنے کے لیے بے چین ہو گیا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ سورج بجھنے کے بعد اپنے گھونسلے کو لوٹا ہو۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اندھیرے میں گھرتا جا رہا تھا۔

تھکن سے ٹوٹتے پنکھوں سے پرندہ کچھ اور نیچے آیا تو فضا میں دوڑتے مواصلاتی پیغامات اس کے پروں سے الجھ الجھ کر پرواز میں رکاوٹیں پیدا کرنے لگے۔ تھکن بازوؤں میں سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھی اور اس کو اپنا وجود ناقابل برداشت بوجھ محسوس ہونے لگا تھا۔ اس نے پھولتی سانسوں سے سر کو خم کر کے اندھیرے میں ڈوبتے لوہے، سیمنٹ اور کنکریٹ کے پہاڑوں کو دیکھا۔ کہیں کوئی پیڑ، کوئی شاخ، کوئی سبز پتہ؟ مگر کہیں کچھ بھی نہیں! اُف یہ میں کس جہاں میں آ پھنسا ہوں۔ کیا میری پرواز اتنی اونچی تھی کہ میں اپنے حدود سے باہر نکل آیا؟ مجھے لوٹنا ہو گا۔ مگر بازوؤں سے اٹھتی ٹیس ارادے پر بجلی بن کر گری۔

اب تو بس چند ہی لمحوں کی پرواز کی سکت ہے مجھ میں، اس کے بعد تو مجھے کہیں تو اترنا ہو گا۔

مگر کہاں؟

اس نے نیچے دیکھا۔سب کچھ وہی بدلا ہوا منظر تھا۔

ٹی وی ٹاور تھا جو غیر مرئی مناظر کو منتشر کر رہا تھا..... یہاں بھی نہیں!

بڑے بڑے نیون سائن بورڈ ٹنگے ہوئے تھے..... یہاں بھی نہیں!

سیمنٹ کنکریٹ کے اسکائی اسکریپر منہ چڑھا رہے تھے..... یہاں بھی نہیں!

اسلحہ ساز فیکٹریوں کی دھواں اگلتی چمنیاں تھیں..... یہاں بھی نہیں!

دیو پیکر دوربینیں تھیں جو کائنات کے سارے اسرار سے واقف تھیں..... یہاں بھی نہیں!

بڑی بڑی ایٹمی بھٹیاں تھیں جو آگ اور زہر اگل رہی تھیں..... نہیں یہاں بھی نہیں!

تب کہاں؟ سوچ کر خود ہی لرز گیا۔

کیا میں واپس لوٹ سکوں گا۔ان ندیوں، پہاڑوں اور جنگلوں کو جہاں سے میں اڑا تھا؟

کیا اب میں اپنے نرم نرم گھونسلے میں اتر سکوں گا؟

کیا اب کبھی نیلے آسمان کی وسعت میں تیرتے ہوئے میں نظروں کی آخری سرحد تک پھیلے گھاس کے میدان کا نظارہ کر سکوں گا؟

میری پیاس کو کیا وہ شیتل جل مل سکے گا؟

گھنے جنگلوں کی گھری چھایا میں سستاتے کسی ہرن کی پیٹھ پر بیٹھ کر اس کی گردن کو گدگدا سکوں گا؟

کیا نم مٹی میں میں اپنے پنجوں کے نشان دیکھ سکوں گا؟

سوالات نے خوف میں ڈھل کر پرندے کو بدحواس کر دیا۔کسی پیڑ کی زندہ شاخ کو پانے کے لیے اس نے زناٹے سے ایک غوطہ لگایا اور ایک دیو پیکر عمارت کی کھڑکی کے مضبوط شیشے سے جا ٹکرایا۔اور پھر تو وہ کسی ڈوبتے جہاز کی طرح ڈولتے ہوئے یکے بعد دیگرے اندھے دھوئیں میں ڈوبتی عمارتوں کی نہ جانے کتنی کھڑکیوں کے شیشوں سے سر ٹکراتا پھرا مگر واپسی کا راستہ جیسے وہ کھل جا سم سم کی طرح بھول چکا تھا۔اب اس کے حواس جواب دے چکے تھے۔وہ تھکن اور خوف سے لرزتے جسم کو پھر نہ سنبھال سکا اور ایک ایٹمی بھٹی کے عین منہ پر اپنا توازن کھو بیٹھا۔زہر نے پھیپھڑوں میں کانٹے بوئے اور شعلوں نے پروں کو چاٹ اور گرد آلود تاریک آسمان پر دور تک ایک روشن لکیر پھیلتی چلی گئی۔جب آگ پروں کو جلاتی دل تک پہونچی تھی تب پرندے نے تڑپ کر نیچے اگے لوہے، آگ اور دھوئیں کے جنگل پر آخری نگاہ ڈال کر سوچا تھا کیا یہ میری آخری پرواز ہے؟ اس سفاک ٹھوس زمین میں سے کوئی بیج اپنی ننھی سبز بانہوں سے سیمنٹ کنکریٹ کے ان پہاڑوں کو چیر کر ایک تناور درخت بننے کے لیے سر نہیں نکالے گا.........!

☆

وہ سارے ماہرین فلکیات جن کی آنکھیں بڑی بڑی دوربینوں میں گڑی رہتی ہیں اور جو کائنات میں نمودار ہونے والے ایک ایک ستارے کی خبر رکھتے ہیں وہ عین اپنے سر پر ایک پرندے کے وجود کے خاک ہو کر فضا میں بکھرنے کے حادثے سے لاعلم رہے!! ■■

سلام بن رزاق

جلتے پروں سے اُڑان - ایک تجزیہ

جس زمانے میں ساجد رشید نے لکھنا شروع کیا اُس وقت افسانے کی فضا پر ہیئت پرستی ابہام اور تجریدیت کی مصنوعی دھند چھائی ہوئی تھی جس میں افسانے کے خدوخال اس قدر مسخ ہو گئے تھے کہ بیشتر افسانے دیوانے کی بڑ معلوم ہوتے تھے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر گیان چند جین کی مندرجہ ذیل رائے دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ جدید افسانے کی تکنیک کے بارے میں وہ اپنے مشہور مضمون 'اینٹی افسانے' میں رقم طراز ہیں۔

"جدید افسانہ نگار کوشش کرتا ہے کہ ایک پیراگراف کا دوسرے سے کوئی تسلسل نہ ہونے پائے اور اگر ایک پیراگراف کے مختلف جملے بھی ایک دوسرے سے غیر متعلق ہوں تو سونے پر سہاگہ ہے۔ نئے افسانے میں جدید ذہن اور ذات کے المیے کو پیش کیا جاتا ہے۔ ایک المیہ یہ بھی ہے کہ پیش کرنے والا اس المیے کو واقعی پیش کرنا نہیں چاہتا۔"

۱۹۷۸ء کے بعد سے اردو افسانے پر چھائی ہوئی یہ مسموم دھند پگھلنے لگی اور افسانے کے نقوش زیادہ واضح، زیادہ روشن نظر آنے لگے۔

ساجد رشید بھی ۸۰۔۱۹۷۰ء کے درمیان اُبھرنے والے افسانہ نگاروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ایک کمیٹڈ افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے اپنے پہلے مجموعے 'ریت گھڑی' کے دیباچے میں اپنے ادبی نظریے بنام سیاسی شعور کے تعلق سے واضح طور پر لکھا ہے۔

"میں سیاسی اور سماجی شعور کی کہانیاں لکھتا ہوں، میں انسانی اور غیر انسانی رشتوں کی صداقت پر بھی کہانیاں لکھتا ہوں۔ میں کہانی کو کہانی مان کر لکھتا ہوں۔"

وہ ایک کمیٹڈ افسانہ نگار ضرور تھے مگر اُنھوں نے اپنے افسانے کو کسی نظریے کی چوکھٹ پر قربان نہیں کیا۔ اُن کی کہانیاں مطالعاتی وصف سے سرشار ہوتی ہیں۔ جنھیں پڑھتے ہوئے کسی ژولیدگی کا احساس نہیں ہوتا، یہ کہانیاں قاری کو لطف اندوزی کے ساتھ ساتھ زندگی کے نشیب و فراز کو اپنے طور پر انگیز کرنے کا شعور بھی عطا

کرتی ہیں۔ نیز اپنے عہد کی بھیانک سچائیوں کو اُن کے صحیح تناظر میں دیکھنے پرکھنے اور اُن پر غور کرنے کی دعوت بھی دیتی ہیں۔

اگرچہ اُن کی بیشتر کہانیاں بیانیہ اسلوب میں لکھی گئی ہیں مگر اُن کا بیانیہ اکہری حقیقت نگاری کی تصویر کشی نہیں کرتا بلکہ ذرا غور کرنے پر اُس کے معنیاتی ابعاد بھی روشن ہوتے نظر آتے ہیں۔

ساجد رشید کے افسانوں کا غالب اسلوب اگرچہ بیانیہ ہے تاہم انھوں نے بعض افسانے علامتی یا تمثیلی پیرائے میں بھی لکھے ہیں 'ہانکا'، 'خواب'، 'ریت گھڑی' اور 'جلتے پروں سے اُڑان' جیسے افسانے اس کی روشن مثال ہیں۔

یہاں اُن کے پہلے مجموعے 'ریت گھڑی' میں شامل افسانہ 'جلتے پروں سے اُڑان' کا مختصراً تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ افسانہ ثابت کرتا ہے کہ ساجد رشید علامتی یا تمثیلی انداز میں بھی کامیاب افسانے لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ 'جلتے پروں سے اُڑان' افسانے کا عنوان ہی اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ افسانے میں کسی سلگتے موضوع کو گرفت کیا گیا ہے۔ مختصراً کہانی چند جملوں میں یوں بیان کی جا سکتی ہے کہ ایک پرندہ حسب معمول ایک صبح دانہ چگنے کے بعد آسمانوں کی سیر پر نکل جاتا ہے۔ دوران پرواز اُسے اچانک احساس ہوتا ہے کہ زمین اور زمین کی ہر شئے ایک کثیف دھوئیں میں ڈوب گئی ہے۔ وہ اپنے تھکے پروں کے ساتھ زمین پر اُترنا چاہتا ہے مگر اب زمین پر لہلہاتے سبزہ زاروں، شاداب درختوں، لچکتی بل کھاتی ٹہنیوں کی جگہ اسٹیل اور سمنٹ کنکریٹ کی بے رحم سنگین عمارتوں، کارخانوں، فیکٹریوں اور اُن کی چمنیوں سے نکلتے زہریلے دھوئیں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ بالآخر پرندہ ایک ایٹمی بھٹی کی حرارت سے جھلس کر راکھ ہو جاتا ہے۔ یہ کہانی ایک نظر میں ایک معمولی بیانیہ کہانی معلوم ہوتی ہے جو ایک پرندے کی المناک موت پر ختم ہو جاتی ہے مگر بنظر غائر دیکھیں تو اس سیدھی سادی بیانیہ کہانی کے پیچھے انسانی سفر کی طویل داستان سانس لیتی نظر آتی ہے۔ کہانی کے ابتدائی حصے میں پرندہ زمین پر اُتر کر دیکھتا ہے "دور تک سبزہ زار تھا اور دانے اس قدر بکھرے پڑے تھے کہ پرندے کو ہمیشہ کی طرح آج بھی سوچنا پڑا، کہاں سے شروع کیا جائے۔"

یہ جملے انسانی تاریخ کے اُن سنہرے ایام کی طرف اشارہ کرتے ہیں جب زمین کی کوکھ کو ایٹمی تجربات اور سائنسی آلائشوں نے بانجھ نہیں کیا تھا۔ اور کھانے والوں کے مقابلے میں اناج کہیں زیادہ پیدا ہوتا تھا۔ تاحد نظر کھیتیاں اور سبزہ زار لہلہاتے نظر آتے تھے اور درختوں کی ٹہنیاں پھلوں سے جھکی پڑتی تھیں۔ پھر اچانک منظر بدلتا ہے۔ افسانہ نگار نے پرندے کی ایک اُڑان کے ذریعے صدیوں کے اوراق اُلٹ دیے اور قاری پرندے کے ساتھ اپنے آپ کو عہد ماضی کے پُر کیف لمحات سے نکل کر زمانہ حال کی زہر آلود فضا میں سانس لیتا محسوس کرتا ہے۔ کہانی میں سائنس کی جبریت اور گھٹن کو اس خوبی سے بیان کیا گیا ہے کہ کہانی عہد حاضر کے انسان کا المیہ بن جاتی ہے اور ہمارے ذہن میں یک بیک ناگاساکی اور ہیروشیما کی تباہ کاریوں کے ہولناک مناظر رقص کرنے لگتے ہیں۔ افسانہ نگار نے یہ کہانی غالباً بھوپال گیس المیے، سے پہلے لکھی تھی مگر افسانے کے بعض جملوں کو پڑھتے ہوئے ہمارے ذہن میں 'بھوپال گیس المیے' کی بھیانک یاد بھی تازہ ہو جاتی ہے۔ یہ نکتہ اس

بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ، ادیب کی سوچ ہمیشہ اپنے عہد سے ایک قدم آگے چلتی ہے۔ اس کہانی میں پرندہ انسان کی اُس خواہش ازلی کا استعارہ بن کر اُبھرتا ہے جو ابتدائے آفرنیش سے اُس کے سینے میں پرورش پا رہی ہے یعنی فطرت سے ہم آہنگ ہونے کی خواہش معصوم۔ مگر المیہ یہ ہے کہ انسان کی اس خواہش اور فطرت کے درمیان اب جدید ٹکنالوجی اور سائنس کی بے رحم اور ناقابل شکست دیواریں ایستادہ ہیں جنھیں منہدم کیے بغیر انسان فطرت سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا اور جنھیں منہدم کرنا اب تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ افسانے کا یہ پیراگراف دیکھیے:

"پرندہ دوران پرواز اچانک زمین پر نگاہ ڈالتا ہے اور یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ جنگل، پہاڑوں اور ندیوں کی جگہ اب آسمان سے سر ٹکراتی سیسہ پلائی عمارتیں تھیں، سینکڑوں ایکڑ میں پھیلی اسلحہ ساز فیکٹریاں تھیں، بڑے بڑے راڈر تھے، دیو پیکر ایٹمی تجربہ گاہیں تھیں، سینہ تانے ٹی وی ٹاور کھڑے تھے، بڑی بڑی دوربینیں تھیں جن میں ماہرین فلکیات کی آنکھیں گڑی رہتی تھیں، برقی تاروں کا ایک جال تھا اور ایک سرے پر ترتیب سے بنی ایٹمی بھٹیاں تھیں جن کی کشادہ چمنیاں آگ، دھواں اور زہر اُگل رہی تھیں"۔

اس پیراگراف کے توسط سے افسانہ نگار نے موجودہ عہد کی مشینی بے حسی، کرختگی اور اس کی زہرناکی کی ایک ہیبت ناک تصویر ہماری نظروں کے سامنے کھڑی کر دی ہے کہ کس طرح مشینوں اور کل پرزوں کے اس جنگل میں انسان اُس پرندے کی مانند اپنے 'مامن کی تلاش' میں سرگرداں ہے۔

کہانی میں جب پرندہ اُڑتے اُڑتے تھک کر چور ہو جاتا ہے اور زمین پر اُترنے کے لیے اُسے کوئی مناسب اور محفوظ جگہ نظر نہیں آتی تب وہ خود ہی یہ سوچ کر لرز جاتا ہے کہ کیا میں واپس لوٹ سکوں گا؟ اُن پرندوں، پہاڑوں اور جنگلوں کو جہاں سے میں اُڑا تھا دوبارہ دیکھ سکوں گا؟ افسانہ نگار پرندے کے استعارے میں آج کے انسان سے بہت اہم سوال پوچھ رہا ہے۔ کیا وہ اس اسٹیل اور سمنٹ کی دنیا سے نکل کر دوبارہ کبھی فطرت کی ان نعمتوں کو پا سکے گا، جنھیں وہ بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے؟

افسانے کا اختتام ایک المناک نوٹ پر ختم ہوتا ہے اور قاری کے ذہن میں ایک اندیشہ ناک سوال چھوڑ جاتا ہے۔ جب آگ پروں کو جلاتی ہے، دل تک پہنچتی ہے تب پرندے نے تڑپ کر نیچے آگ، لوہے، اور دھوئیں کے جنگل پر آخری نگاہ ڈال کر سوچا تھا، کیا یہ میری آخری پرواز ہے؟ اب اس سفاک اور ٹھوس زمین میں سے کوئی بیج اپنی ننھی سبز باہوں سے سمنٹ کنکریٹ کے ان پہاڑوں کو چیر کر ایک تناور درخت بننے کے لیے سر نہیں نکالے گا؟

افسانہ ختم ہو جاتا ہے مگر قاری کے ذہن میں افسانے کا تاثر تادیر ایک دہکتے انگارے کی طرح سلگتا رہتا ہے..... یہی اس افسانے کی کامیابی ہے۔

■■

تبصرے کے لیے برائے کرم کتابیں نہ بھجوائیں، ہم اپنی ترجیحات پر کتابیں منتخب کرتے ہیں۔ (ادارہ)

عقیدت مندانہ جذبے کا اظہار

عمر دراز مانگ کر لائے تھے چار ماہ
ساجد رشید: فن اور شخصیت

☆ مرتب: اشتیاق سعید ☆ مُبصر: یس. ایم. عباس

ضخامت: ۲۴۸، قیمت: ۲۰۰ روپے، ناشر: نیوز ٹاؤن پبلی کیشنز، ممبئی

دُنیا نے محبت کے نہ جانے کتنے طور و انداز دیکھے ہیں اور دیکھتی رہے گی۔ کتنے ہی لبوں نے خلوص و محبت کی کہانیاں دہرائی ہیں اور دہراتے رہیں گے۔ محبت ایک عظیم اور پاکیزہ جذبہ ہے جس کی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا، مگر اس بات پر سب متفق ہیں کہ یہ جذبہ بہر طور قربانی چاہتا ہے۔ یوں ہر شخص محبت کے نام پر جان چھڑکنے کا مدعی ملتا ہے، مگر کہیں صرف دو گام چلتے چلتے محبت کی سانس اُکھڑ جاتی ہے، کہیں کوئی ایسا ناخوشگوار موڑ آجاتا ہے کہ یہ سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن جہاں یہ جذبہ مصلحت و مفاد پرستی سے دور ہے وہیں محبت کے نام پر جانیں بھی قربان ہو جاتی ہیں۔ شاعر ادیب کچھ زیادہ ہی سادہ، معصوم اور حساس دل پہلو میں رکھتا ہے۔ وہ محبت کا قدر دان ہوتا ہے اور بڑے سلیقے سے محبت کو نباہتا ہے۔ جب وہ اپنے دلی جذبے کا اظہار کرتا ہے تو اپنے چاہنے والے کی ذات کے بعد بھی اس کے فن کے وسیلے سے ایک تاج محل کھڑا کر دیتا ہے اور یہ تاج محل اس کی محبت کا ایک اَمٹ نقش ہوتا ہے۔

میرے سامنے اشتیاق سعید کی مرتب کردہ کتاب ''عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار ماہ۔ ساجد رشید فن اور شخصیت'' ہے اور یہ ساری باتیں میرے ذہن میں گشت کرتی جارہی ہیں۔ اشتیاق سعید بہتوں کے دوست ہیں۔ لیکن میرے نزدیک ساجد رشید واقعی خوش نصیب گذرے کہ انہیں اشتیاق سعید ایسا مخلص بلکہ عقیدت مندانہ جذبہ رکھنے والا دوست ملا۔ اشتیاق سعید آج کے اچھے افسانہ نگار ہیں اور بطور خاص گاؤں کی زندگی سے متعلق وہ اچھی کہانیاں لکھ رہے ہیں، اب تک ان کی کہانیوں کے دو مجموعے ''ہل جوتا'' اور ''حاضر غائب'' منظر عام پر آچکے ہیں جن کی پذیرائی ہوئی ہے۔ ساجد رشید افسانوں کی دنیا کا ایک روشن چراغ تھا جس گذشتہ دو تین دہائیوں میں افسانے کے ایوان میں اپنی تابانیاں بکھیرتا رہا، پھر یہ چراغ اچانک بجھ گیا۔ ع
اب کہاں ڈھونڈیں تجھے روٹھ کے جانے والے... ساجد رشید کے بارے میں ان کے ایک ہم عصر افسانہ نگار کے تاثرات دیکھیں۔ ''ساجد رشید مقصدیت اور نظریہ دونوں کے قائل ہیں... ان کی فکر واضح اور روشن ہے۔ وہ فلسفیانہ موشگافیوں کے قائل نہیں، سیدھی بات کو گھما پھرا کر کہنا انہیں پسند نہیں ہے۔ وہ وہی لکھتے ہیں جو دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں... ان کے افسانے اپنے عہد کی بھیانک سچائیوں کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھنے، پرکھنے اور ان پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں''۔ (ساجد رشید ہم عصر افسانے کی ایک توانا آواز۔ سلام بن رزاق)

ہر عہد کے اپنے کچھ مخصوص رجحانات ہوا کرتے ہیں اور یہ رجحانات سیاسی، سماجی اور معاشرتی مطالبات و ضروریات کے تحت جنم پاتے اور اُبھرتے ہیں۔ جب پسماندہ طبقے کی آواز ہر طرح اور ہر طرف سے دبائی جارہی تھی تب ترقی پسند تحریک

اپنایہ مینوفیسٹو لے کر اُبھری کہ ہمیں بہر نوع پسماندہ طبقے کی آواز کو اُبھارنا ہے اور ادب میں اپنے رویے کو بدلنے کے لیے پریم چند نے شعرا اور اُدبا سے اپنی ذہنیتوں کو بدلنے کی درخواست کی۔ زندگی میں معیارِ حُسن کو بدلنے کی بات، ذہنی فکر و انداز کو بدلنے کی تلقین تھی اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی تحریک کو ملا۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ آج قومی یکجہتی، اتحاد اور یگانگت کی شدید ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ آئے دن سماج میں جو افراتفری پھیلتی جارہی ہے، بڑے بڑے ہنگامے کھڑے کئے جاتے ہیں اور فرقہ واریت موردِ الزام بنتی ہے وہ دراصل گندی ذہنیت ہوتی ہے اور یہ کسی ایک طرف سے نہیں ہوتی۔ حالات کا تجزیہ کیجئے اور بلا کسی عینک کو لگائے ہوئے معاملے کی تہہ کھولیے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بات کسی فرقے اور عقیدے کی نہیں بلکہ مخصوص ذہنیت کی ہے اور ایسی ذہنیت جو صحت مند نہیں کہی جاسکتی۔ اسی موضوع پر ساجد رشید نے کہانی ''راکھ'' لکھی ہے۔ جس کا بہترین تجزیہ راشد انور راشد نے کیا ہے۔

اشتیاق سعید اور ساجد رشید کے اس اجمالی تذکرے کے بعد پھر چلئے کتاب کی طرف۔ یہ دو ابواب پر مشتمل ہے۔ حصّہ اوّل میں ساجد رشید کے فن سے متعلق مضامین ہیں جن کی کُل تعداد سات ہے۔ پہلا مضمون گوپی چند نارنگ کا ہے۔ موصوف بزرگ ادیب ہیں اور فکشن پر اچھی خاصی نگاہ رکھتے ہیں، انھوں نے ساجد رشید کی کئی کہانیوں کا اپنے اس مضمون میں مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے۔ دوسرا مضمون ہم عصر افسانے کی توانا آواز بن جانے والے 'سلام بن رزاق' کا ہے۔ کہانیوں پر تجزیے بھی مناسب ہیں اور ساجد رشید کے فن کے کسی نہ کسی پہلو کو اُجاگر کرتے ہیں۔ حصّہ ثانی میں شامل مضامین یا تخلیقات ساجد رشید کی ناگہانی موت پر اُن کے احباب کے تاثرات ہیں، علاوہ ازیں ایک الٰہ آباد اور لکھنؤ کا سفرنامہ بھی شامل ہے۔ آج نہایت صبر آزما دور ہے اور بطور خاص ان لوگوں کے لیے جو اپنے مخصوص اُصول و نظریات کے ساتھ جینا چاہتے ہیں۔ ایسا شخص ہر دن حقیقت کی کتنی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکراتا رہتا ہے۔ ساجد رشید کی کہانیوں میں تمام تر سیاسی، سماجی حقیقتیں اُبھر کر آتی ہیں اور سچے سماجی شعور کے لیے حقیقت پسندی ناگزیر ہے۔ ساجد رشید انسانی اور غیر انسانی رویوں، اخلاقی اقدار کی شکست اور آپسی رشتوں کو حقیقت پسندانہ نظر و انداز سے دیکھا ہے۔

''ساجد رشید بحیثیت ایک انسان اور فنکار'' میں یہ تاثرات ملاحظہ ہوں۔ ''جرأت اور بے باکی، حق پسندی و انصاف آج کے دور میں ہر ایک کے بس کی بات نہیں، یہ ایک سچا فنکار دردمند اور پُر سوز دل رکھنے والا حساس ترین انسان اور اُصولوں کے لیے زندگی کو خطرے میں ڈالنے والا جیالا شخص ہی کر سکتا ہے۔ چنانچہ ساجد رشید کے یہی باغیانہ تیور جرأت و بے باکی اور حق و انصاف کے لیے سینہ سپر ہو جانے والی دیوانگی ان کی تحریروں میں بھی نمایاں ہوئے بغیر نہ رہ سکی'' (ایم نسیم اعظمی)

حصّہ ثانی میں جیسا کہ خود کتاب کے مرتب اشتیاق سعید نے ہی اس باب کو تاثرات پر مشتمل کیا ہے۔ 'یاد گلی'، 'ساجد ہمارا دوست'، 'سچائی پر ڈٹے رہے'، 'وہ کسی ولی سے کم نہیں'، 'صاف دل ادیب'، 'بیباک اور نڈر سپاہی' اور 'عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار ماہ' وہ تخلیقات ہیں جن میں مختلف انداز سے ساجد رشید کے فکر و فن، ان کی شخصیت، ان کی انسان دوستی، ان کی حقیقت پسندی کو مختلف انداز سے اُبھارا گیا ہے۔ ایسی تخلیقات کو پڑھتے ہوئے کہیں کہیں ہماری آنکھیں حیرت سے کھلی رہ جاتی ہیں اور کہیں نم بھی ہو جاتی ہیں۔ کتاب کے مرتب اشتیاق سعید نے جتنی تگ و دو کے بعد منزل پائی وہ ایک الگ کہانی ہے۔ ان کے دیباچہ 'ٹھیس نہ لگ جائے ان آبگینوں کو' میں ساجد رشید کے رفیقانِ رہ شوق کی، ان کے مابعد کی سرد مہری، لاتعلقی بلکہ قدرے خود غرضی، لالچ اور کینہ پروری کی جو بے لاگ اور سچی تصویریں اشتیاق سعید نے پیش کی ہیں انھیں ان کا جرأت مندانہ اقدام کہا جاسکتا ہے۔ ادب میں بھی کیا کچھ ہوتا ہے ان کی تحریر نے کچھ ایسا ہی تاثر دیا ہے۔ لیکن یہ نڈر، بے باک، بیلاگ باتیں کرنے والا، بایں سیلِ غم و سیلِ حوادث آخر کار وہ سب کچھ کر گزرا جو اس نے ساجد رشید کی دوستی میں اپنا ادبی فریضہ سمجھا۔

عہد ساز افسانہ نگار پر خصوصی نمبر

سہ ماہی تکمیل - شوکت حیات نمبر

☆ مدیر: اصغر حسین قریشی، منظہر سلیم ☆ مبصر: م۔ ناگ
صفحات: ۲۷۲، قیمت: ۲۵۰ روپیے، ناشر: تکمیل پبلی کیشنز، بھیونڈی

سہ ماہی 'تکمیل' کا شوکت حیات کا خصوصی شمارہ یعنی شوکت حیات نمبر منظر عام پر آیا ہے۔ شوکت حیات ایک عہد ساز افسانہ نگار ہیں۔ جنھوں نے افسانوں کے ذریعے اپنی قلم کاری کا لوہا منوایا اور اپنا راستہ خود تلاش کیا، نیز افسانوں سے متعلق اپنی تھیوری بھی پیش کی۔ وارث علوی نے لکھا ہے "شوکت حیات ان جیالے لوگوں میں سے ہیں جو نہ کسی نقاد کی توجہ کی پرواکرتے ہیں نہ دوسروں کی بخشی ہوئی بے ساکھیوں پر راہ ادب طے کرتے ہیں۔ وہ اپنا راستہ خود بناتے ہیں اور اپنے اظہار و بیان کے طریقے آپ ہی ایجاد کرتے ہیں۔

اردو کے موقر رسائل میں ایک طویل عرصے تک افسانے شائع ہوتے رہے، ہر قماش کے قاری نے انھیں پسند کیا اور ناقدین نے بھی پذیرائی کی۔ ایک طویل مدت کے بعد ان کا افسانوں کا مجموعہ 'گنبد کے کبوتر' شائع ہوا۔ گنبد کے کبوتر کی اشاعت پر ادب میں ہلچل سی مچ گئی۔ ناقدین، مبصرین اور رسائل میں ان کے افسانوں کا خوب تذکرہ ہوا۔ لیکن اپنے پہلے ہی مجموعے سے جو مقبولیت اور قبولیت انھیں حاصل ہوئی وہ بہت کم قلم کاروں کے حصے میں آتی ہے۔

شوکت حیات نے جب افسانہ نگاری شروع کی تھی تو وہ عدو ترقی پسندی اور جدیدیت کے اُتار کا دور تھا۔ ان کے یہاں زندگی سانس لیتی ہے، آس پاس کے ماحول اور کردار ان کے افسانوں میں ایک نئی جہت پاتے ہیں۔ ان کے افسانے عصری حسیت اور سماجی سروکار کے افسانے ہیں۔ ان کی فکر اور رویے اپنے عہد سے میل کھاتے ہیں۔ انھوں نے عصری افسانوں کی آفاقیت کے لیے نامیاتیت کی تھیوری پیش کی۔ نامیاتی افسانے وہ ہیں جو کسی بھی عہد کے ہوں لیکن ہر عہد میں فکری و فنی سطح پر grow کرنے کی صلاحیتیں اور نئے عہد کے تقاضوں کے تحت متن کے نئے معنیاتی نظام قائم رکھنے کی صلاحیتیں رکھتے ہوں۔ انھوں نے پچویشن سیریز کے افسانے بھی لکھے، وہ طرح طرح کے تجربے کرتے رہے۔

شوکت حیات نمبر میں 'میں کیوں لکھتا ہوں' کے تحت شوکت حیات کا مضمون 'میری تھیوری اور میرے افسانے' اس نمبر کا خاصا ہے۔ ان کے فن سے متعلق ناقدوں اور ہم عصر افسانہ نگاروں کی آرا دی گئی ہیں۔ جس میں گوپی چند نارنگ، شمس الرحمن فاروقی، جوگندر پال، اقبال مجید، قمر رئیس سرفہرست ہیں۔ تصویریں بھی ہیں۔ شوکت حیات کے فن پر مضامین وارث علوی، مہدی جعفر، عبدالصمد، سلام بن رزاق جیسے اہم قلم کاروں نے مضامین تحریر کیے ہیں۔ شوکت حیات سے تین انٹرویوز بھی شامل کے گئے ہیں، جو غضنفر اقبال، محمد غالب نشتر اور ظہیر انصاری نے لیے ہیں۔ ان کے تیرہ اہم افسانہ نگاروں پر چودہ تجزیے ہیں۔ افسانوں کے ساتھ تجزیے پڑھتے ہوئے ایک الگ ہی لطف آتا ہے۔ مضامین میں شوکت کے فن کو سمجھنے سمجھانے کی اچھی کوشش ہے۔ بلاشبہ شوکت حیات جدید نسل میں سب سے زیادہ منفرد تیز گام اور تجربہ پسند تخلیق کار ہیں۔ ان کے انفرادی رجحان 'نامیت' اور 'بے نام نسل' کی اہمیت معنویت اور قدر و قیمت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جس کے تحت ان کا اپنا ایک آزادانہ افسانوی نظام فکر وجود پذیر ہوا ہے۔ چند اہم افسانوں پر یادگار تجزیے شائع ہوئے ہیں جیسے اسلم جمشید پوری، اسد اللہ، علی احمد فاطمی وغیرہ۔ مرحوم منظہر سلیم نے کافی جدوجہد کے بعد یہ نمبر شائع کیا ہے۔ مجموعی طور پر ایک خوشگوار تاثر پیدا ہوتا ہے۔ شوکت حیات کے فن کو سمجھنے کے لیے یہ نمبر (امید ہے) قارئین ادب اور اسکالرز کے لیے راہ نما بنے گا۔

ریختہ فاؤنڈیشن کا قارئین کے لیے نایاب تحفہ

اوراقِ خزانی (شعری مجموعہ)

☆ شاعر: احمد مشتاق ☆ مبصر: مصحف اقبال توصیفی

صفحات: ۱۴۴ ، قیمت: ۲۵۰/روپیے، ناشر: ناگپور

ہندستان میں احمد مشتاق کے قارئین کے لیے 'اوراقِ خزانی' ایک ایسا تحفہ ہے جس کے لیے ہم ریختہ فاؤنڈیشن کا جس قدر شکریہ ادا کریں کم ہے۔ زیرِ نظر کتاب احمد مشتاق کے غیر مطبوعہ کلام پر مشتمل ہے جس میں 'مقدمہ' کے عنوان کے تحت شمیم حنفی نے اس شاعری پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ جب یہ کتاب مجھے ملی تو اس کا نام 'اوراقِ خزانی' دیکھ کر ایک لمحے کے لیے مجھ اُداسی کا احساس ہوا۔ میں نے سوچا احمد مشتاق نے یہ نام کیوں رکھا ہوگا۔ پھر مجھے اُنہی کا ایک شعر یاد آگیا ع ہنرِ غم کو چشم کم سے نہ دیکھ / اس سے بہتر ہنر نہیں کوئی۔ اور یہی سچ ہے۔ کبھی خشک پتوں پر ہم گزرتے موسموں کے نام لکھیں تو وہ اپنا رنگ بدل کر سبز ہو جاتے ہیں۔ یہ خزاں ہی تو ہے، جو بہار کے قدموں کی چاپ اس طرح سناتی ہے کہ میز پر رکھی ہوئی بلیک اینڈ وائٹ تصویر اچانک رنگوں میں نہا جاتی ہے۔ ایسے ہی کسی لمحے میں احمد مشتاق کے ہونٹوں پر میر کا یہ مصرعہ آیا ہوگا ع کچھ لکھا ہے تجھے ہر برگ پہ اے رشکِ بہار، جو انھوں نے اس کتاب کے سرنامے کے طور پر درج کیا ہے۔

احمد مشتاق کی شاعری کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ وہ ہمیں ایسی دنیاؤں کی سیر کراتے ہیں جو بہ یک وقت ہمارے لیے اجنبی ہیں اور جانی پہچانی بھی۔ اجنبی اس لیے کہ ہم نے وہ شہر وہ گاؤں نہیں دیکھے، اُن لوگوں سے ہماری رسم و راہ نہیں جو احمد مشتاق کے لیے رگِ جاں سے بھی قریب تر ہیں۔ جانی پہچانی اس لیے کہ یہی تو ہماری حدیثِ دل ہے۔ پھر ہم ان شب و روز میں جینے لگتے ہیں جن میں احمد مشتاق کی سانسیں بسی ہوئی ہیں۔ نیا شہر، نئے بازار، دوکانیں، بادل، مٹی ہر شئے جانی پہچانی لگتی ہے۔ ایک جانی پہچانی سی مہک ع 'باسی پھول میں جیسے خوشبو پھول پہننے والے کی'۔ احمد مشتاق کی شاعری پڑھتے ہوئے خواب اور بیداری کی یہ ملی جلی کیفیت ہمہ وقت ہم پر طاری رہتی ہے۔

احمد مشتاق کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ (جسے اکثر نقادوں نے سراہا ہے) کہ وہ نہایت آسانی سے محسوس کو غیر محسوس اور کبھی کسی غیر محسوس جذبے کو اس طرح محسوس پیکر میں ڈھال دیتے ہیں کہ خیال ایک جسم شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کوئی شخص ہمارے ساتھ بیٹھا ہے۔ چائے پی رہا ہے، کبھی ہمارے ساتھ روتا ہے، کبھی ہنستا ہے، باتیں کر رہا ہے۔

یار سب جمع ہوئے رات کی تاریکی میں
کوئی رو کر تو کوئی بال بنا کر آیا

اس شعر میں ہمیں ایک ایسا ہی شخص اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ ملتا ہے۔ عسکری اور فاروقی صاحب کے خیال میں یہ حقیقی کردار ہیں۔ لفظی روسومیات کا مجموعہ نہیں۔ فاروق نے عسکری صاحب کے اس خیال کی تائید تو کی ہے کہ فراق کی شاعری میں ہمیں ایک انوکھا عاشق، ایک انوکھا معشوق نظر آتا ہے۔ لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ کردار، اردو شاعری میں پہلے سے موجود ہے اور اس کے پیش رو حقیقتاً میر ہیں۔ (''اردو غزل کی روایت اور فراق- پس نوشت''، شمس الرحمن فاروقی)۔ پھر فاروقی کو جب یہی انوکھا شخص، انوکھا عاشق ایک نئے روپ، نئے لباس میں جلوہ گر نظر آتا ہے تو اُنھیں احمد مشتاق کی شاعری اور بھلی لگتی ہے اور کیوں نہ لگے ہم جب اس انوکھے شخص سے ملتے ہیں (جس کا نام احمد مشتاق ہے) اور پھر جدا ہوتے ہیں تو بار بار اس سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ احمد مشتاق کی شاعری ایک مجموعہ خوبی ہے۔ اس کی کئی خصوصیات ہمیں متوجہ کرتی ہیں، مثلاً یہی کہ وہ نہایت سادہ الفاظ میں عام سی بات اس طرح کہہ جاتے ہیں کہ اس کے پیچھے ایک پورا منظر آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے۔ ع

اک زمانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے/ اور اب کوئی کہیں کوئی کہیں رہتا ہے، جیسے یہ شعر ہمیں ایک بکھرے ہوئے خاندان کی کہانی سناتا ہے۔ ہم جس پس منظر کا انتخاب چاہیں کرلیں۔ یہ خوبی ہمیں اور شاعروں کے ہاں بھی ملے گی۔ لیکن احمد مشتاق کے ہاں اس کا رنگ کچھ اور ہے اور یہ ان کے اسلوب میں ڈھل گئی ہے۔ وہ سوچتے بہت ہیں اور بولتے کم ہیں۔ کس قدر دلچسپ بات ہے جب وہ خود کہتے ہیں ع 'محبت میں زیادہ سوچنا اچھا نہیں ہوتا/ زیادہ سوچنے سے وسوسے گھر دیکھ لیتے ہیں'۔ لیکن شاعری کا سارا حسن تو ان ہی باتوں میں ہے، ان ہی وسوسوں کے بھیس میں اچھی شاعری، شاعر کا گھر دیکھ لیتی ہے۔ وہ جو میراجی نے اعصابی خلل اور تخلیقی اظہار میں گہرے رشتے کی بات کہی ہے۔ بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ میں کہہ رہا تھا احمد مشتاق سوچتے بہت ہیں، بولتے کم ہیں بلکہ اپنے آپ سے بھی بہت دیر میں کھلتے ہیں۔ بہت دیر لگا دیتے ہیں۔ اسی لیے معاصرین کے مقابلے میں ان کے ہاں غزلوں اور غزلوں میں بھی اشعار کی تعداد بہت کم ہے۔ بہار و خزاں کے کئی موسم کئی جگ بیت جائیں تب کہیں جا کر وہ اپنا احتساب کرتے ہیں، اپنی کائنات کو ازسرِ نو ترتیب دیتے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

ہوائیں جن کی اندھی کھڑکیوں پر سر پٹکتی ہیں
میں ان کمروں پر شمعیں جلا کر دیکھ لیتا ہوں

نکلے تو اس طرح کہ دکھائی نہیں دیئے
ڈوبے تو دیر تک نظر آتے رہیں گے ہم

یاد ہے زینۂ پیچاں اس کا
در و دیوارِ مکاں یاد نہیں

جہاں تنہا ہوئے دل میں بھنور سے پڑنے لگتے ہیں
اگرچہ مدتیں گزریں کنارے سے لگے ہم کو

میں تو گم اپنے نشے میں تھا مجھے کیا معلوم
کس نے منہ پھیر لیا کس نے پذیرائی کی

شیشے کے اک گلاس میں نرگس کے پھول ہیں
اک میز پر ہیں چند رسالے پڑے ہوئے

مشتاق کوئی کان لگائے نہ لگائے
دریا کے گزرنے کی صدا آتی رہے گی

یادیں بھی کسی سے کبھی زنجیر ہوئی ہیں
باندھو بھی ہوا کو تو ہوا آتی رہے گی

کس کے بندھے ہوئے تھے ہم دامنِ ماہتاب سے
ہم بھی ادھر اُدھر گئے چاند جدھر جدھر گیا

تم نے دیکھے نہیں خزاں کے رنگ
بھول جاتے بہار کے انداز

بھولے بسرے موسموں کے درمیاں رہتا ہوں میں
اب جہاں کوئی نہیں رہتا وہاں رہتا ہوں میں

اس سے پہلے شائع ہوئی ان کی کلیات میں صفحات کی تعداد تین سو سے بھی کم ہے۔ 'اوراقِ خزانی' کی ضخامت بھی ۱۴۴ صفحات سے آگے نہیں بڑھی۔ ایسا لگتا ہے ایک چھوٹا سا خطۂ زمین ہے۔ یہ احمد مشتاق کا کنجِ تنہائی ہے۔ جس میں اُنھوں نے آس پاس کی بہت ساری زمین اور آسمان گھیر رکھا ہے۔ جس میں وقت مختلف موسموں کے بھیس میں مسلسل سفر میں ہے اور یہ سفر ختم ہی نہیں ہوتا ع 'منتیں میں شکستہ پائی کی' اور یہی احمد مشتاق کی شاعری کا اعجاز ہے۔

جانے پہچانے لحن سے مختلف شاعری

تنکے میں آشیانہ (شاعری)

☆ شاعر: اوم پربھاکر ☆ مبصر: آفاق عالم صدیقی

صفحات ۱۱۲ : ، قیمت: ۱۲۰ روپیے، ناشر: شب خون کتاب گھر، الہٰ آباد

کچھ لوگ بڑی پہلودار شخصیت کے مالک ہوتے ہیں اور ان کی شخصیت کا ہر پہلو اتنا اہم ہوتا ہے کہ اسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ پنڈت اوم نرائن اوستھی المعروف بہ اوم پربھاکر کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ وہ ہندی زبان

وادب کے قابل قدر ناقد و محقق ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین افسانہ نگار اور عمدہ شاعر بھی ہیں۔ جب کہ وہ بہ حیثیت صحافی کے بھی ایک اچھی پہچان کرتے ہیں۔ وہ اپنے کارناموں کے لیے مختلف اداروں کی رطف سے انعامات واعزازات سے بھی سرفراز کیے جاچکے ہیں۔ اوم پربھاکر صاحب نے عمر کی پختگی اور مزاج کی تربیت کے باوجود نہ صرف یہ کہ اردو زبان سیکھی بلکہ اردو میں شاعری بھی کی۔ ٹنکے میں آشیانہ کی خوبی یہ ہے کہ آدمی جب اس کتاب کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو وہ غیر ارادی طور پر اخیر تک پڑھ جاتا ہے۔ اور بہت دیر تک فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ ان غزلوں میں جو کشش، دلکشی اور تازگی ہے وہ موضوعات کے برتنے کے سلیقے کی وجہ سے ہے یا زبان کے انوکھے استعمال کی وجہ سے ہے یا پھر زندگی کو ایک بلکل نئے انداز سے دیکھنے کی وجہ سے ہے۔ اوم پربھاکر کی شاعری کی زبان نہایت سادہ مگر بڑی پرکار ہے۔ اس شاعری میں قاری کو چونکانے اور اس کے دامن دل کو تھامنے کی بڑی خوبی پائی جاتی ہے۔ جب کہ زبان کا بھی اپنا ایک انفرادی ذائقہ ہے۔ جو غالباً ہندی سوچ اور اردو زبان کے تال میل اور فکر و نظر کے پرخلوص آمیزش کا نتیجہ ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

کل شام چھت پہ جا کر دیکھا افق کی جانب
آکاش دھیرے دھیرے دھرتی نگل رہا ہے

ابھی آکے جس نے معطر کیا گھر
وہ خوشبو ہے کس کی کہاں کی ہوا ہے

سمندر یہ کہسار جنگل یہ صحرا
یہ انساں کے حق میں زمیں کی دعا ہے

گذشتہ شب کوئی چپکا گیا ہے
کواڑوں پہ ہمارے ڈر کا نقشہ

یہ تمام اشعار محض موضوع کی وجہ سے نہیں بلکہ موضوع کے برتنے کے طریقے اور زبان کے استعمال کے ایک انوکھے سلیقے کی وجہ سے متوجہ کرتے ہیں۔ دھرتی آکاش کا ملنا ایک عام بات تھی لیکن آکاش کا دھیرے دھیرے دھرتی کو نگلنا ایک بلکل نئی بات ہے اور غالباً یہی نیاپن ان کے یہاں ایک کشش پیدا کرتا ہے اور قاری ایک خاص طرح کی اپنائیت سے ان کے ساتھ ہولیتا ہے۔ ہندی شاعری میں جدیدیت کی شدت کا کبھی غلبہ نہیں ہوا۔ اور نہ انسان اپنی ذات میں گم ہونے کا مدعی نظر آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندی شاعری اور ہندی ادیبوں کی اردو شاعری زندگی سے زیادہ راست تعلق رکھنے والی شاعری کے طور پر سامنے آئی، جسے قارئین نے زیادہ اپنائیت سے پڑھا۔ اوم پربھاکر کی شاعری بھی اس طرح کی خوبیوں سے آسودہ ہے۔

جب شاعر مظاہر قدرت کو اپنی شخصیت اور اپنے وجود کا حصہ سمجھنے لگتا ہے تو وہ قطرے میں دریا دیکھنے کے قابل بن جاتا ہے اور بحر ذخار میں بھی اپنے وجود کے احساس کو قائم رکھتا ہے۔ اوم پربھاکر نے اردو غزل کی اتنی شاندار اور ثروت مند روایت کے درمیان جو اپنی انفرادیت کا احساس دلایا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ انھوں نے اردو غزل کی جملہ صفات کو قبول کرنے کے باوجود اپنے آپ کو یا اپنے اندر کی آواز کو گم نہ ہونے دیا ہے، اس آواز کو جو ایک عرصہ تک ہندی کے لحن میں گونجتی رہی ہے۔

عجب فقیر ہوں میں بھی کہ میری ہی خاطر
یہ کائنات بصورت زکوٰۃ رکھی ہے

خزاں اوڑھے کہیں بیٹھی ہے چھپ کر
اسی گلشن میں اک غنچہ پری ہے

ہمارا چاند اور سورج تمہارا
بلا جھجکے پگھلتا جارہا ہے

اوم پربھاکر کے یہاں جدیدیت کی شدت والی کیفیت نہیں پائی جاتی ہے اور نہ وجودیت اور فردیت اور ذات کی گمشدگی جیسے ٹریڈ مارک موضوعات پائے جاتے ہیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ جدیدیت کی فکری صلاحیت اور تخلیقی تازگی کے حامل بعض ایسے اشعار پائے جاتے ہیں جن سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں ہے۔

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اپنا گھر میں شہر خواب میں
رات بھر سوتا ہے کوئی اور بستر پر مرے

دبا کر چونچ میں رنگین کریں ہماری چھت پہ رکھ جائیں پرندے

لب و لہجے کے کھردرے پن اور لفظوں کے کھرے پن پر توجہ کریں تو محسوس ہوگا کہ یہ یگانہ، شاد عارفی والی زبان کا وہ رنگ ہے جو مظفر حنفی کے یہاں زیادہ واضح شکل میں نظر آتا ہے اور جسے حلاوت سے ہمکنار کرنے میں ظفر گورکھپوری اور عنبر بہرائچی نے زیادہ دلچسپی دکھائی ہے۔ مگر اوم پربھاکر کے یہاں انداز ذرا مختلف ہے کہ یہ جدیدیت میں ہندیت گھل مل کر نکھری ہے۔ جو کبیر و ولی کی زبان کے ذائقے کا احساس تو نہیں دلاتی ہے مگر زمین سے جڑی اور اپنی خاک و باد سے آسودہ زبان کے حسن کا جادو ضرور جگاتی ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

موہشی میں نہ دانہ ہے نہ پانی کبھی تھے اس لیے کھونٹا گڑا ہے

پرانے چوٹ کھائے پتھروں کے چاک سینوں میں لیے چھینی ہتھوڑا ہاتھ میں معمار زندہ ہیں

طوفاں کے بعد دیکھا گلشن کے ہر شجر پہ بے دم پڑی تھی خوشبو اوڑھے کفن ہوا کا

شکیل گوالیاری کی یہ بات بھی درست معلوم ہوتی ہے کہ اوم پربھاکر کی غزل میں الفاظ اور بندشوں پر نام نہاد و عقلیت اور دانشوری کی چھاپ نہیں ہے۔ وہ ان الفاظ و تراکیب کا انتخاب کرتے ہیں۔ جو وجدانی کیفیت کے ساتھ ان کے لاشعور کی سطح پر خود بخود ابھرتے ہیں۔ بہر حال اس مطالعے سے اتنی بات واضح ہو جاتی ہے کہ ''تنکے میں آشیانہ'' غزلوں کا ایسا مجموعہ ہے جس کا اپنا ذائقہ ہے، کیونکہ اس کا رنگ و آہنگ غزل کے روایتی رنگ و آہنگ اور غزل کے جانے پہچانے لحن سے مختلف ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اوم پربھاکر کی غزلوں کی بنیادی خوبی زندگی کی مٹی سے سوندھے پن کی کشید ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ ان کی شاعری کے مطالعے کے دوران قاری تہذیبی ارتفاع کی بہ نسبت فطری ارتقا کی کیفیت کو زیادہ شدت سے محسوس کرتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ کلچر زیادہ مزین اور روشن ہوتا ہے۔ جب کہ نیچر ایک خاص طرح کے کھردرے پن اور کرارے پن سے آسودہ ہوتا ہے۔ یہی کرارہ پن ''تنکے میں آشیانہ'' کی شاعری کو لائق توجہ بناتا ہے۔ جس میں ایک خاص طرح کا اپنا پن گھل مل کر ملگجی روشنی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ جو شہروں کی چکا چوند کر دینے والی اور خوف زدہ کر دینے والی روشنی کی بہ نسبت زیادہ اپنائیت بھری اور بصیرت افروز معلوم ہوتی ہے۔

اطراف: سوچ کا نیا کینواس

اطراف (شعری مجموعہ)

☆ شاعر: عبید حارث ☆ مبصر: م۔ناگ

صفحات: ۱۶۰ ، قیمت: ۸۹ روپیے ، ناشر: نیشنل ہیومن فار ریذنڈ فل فاؤنڈیشن، ناگپور

'اطراف' نوجوان شاعر عبید حارث کا اولین شعری مجموعہ ہے۔ گزشتہ پانچ برسوں میں ان کے کلام سے ہم متعارف ہوتے رہے ہیں۔ مختلف چھوٹے بڑے رسالوں اور اخبارات کے ادبی صفحات پر۔ ادھر دس پندرہ برسوں میں نوجوان شعرا کے جو بھی مجموعے آئے ان پر ایک سرسری نظر ڈالیں اور عبید کے مجموعے کا مطالعہ کریں تو ان کا قد نکلتا ہوا لگتا ہے۔ آج جب کہ بے شمار کتابیں ہر روز منظرِ عام پہ آجاتی ہیں اور وہ بھی ایسی جاذب نظر کے بس دیکھتے رہیے۔ کمپیوٹر ڈیزائننگ نے کتابوں کو واقعی دیکھنے کی چیز بنا دیا ہے۔ مگر افسوس کہ ان میں سے بیشتر کتابوں کا سارا حسن ظاہر تک ہی محدود ہوتا ہے۔ اس صورت میں قاری کے ذوقِ جمال کی تسکین تو ہوتی ہے، ذوقِ مطالعہ کی تسکین نہیں ہوتی۔

عبید حارث اپنے مجموعے اپنے تیور سے متعارف کرا دیتے ہیں اور جا بجا آئندہ پرواز کے اشارے بھی دیتے ہیں۔ ان

کا کلام پڑھ کر لگتا ہے کہ تخلیقی آنچ کی گرمی ہر لمحہ شاعر کو بے چین رکھتی ہے۔ شاعری میں پختگی بھی ہے اور تہہ داری کا بھی احساس ہوتا ہے۔ کم لفظوں میں اپنی بات کہتے ہیں۔ عموماً ایسی خصوصیات نئے شعرا کے اولین مجموعوں میں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ عبید نے اپنی غزلوں اور نظموں میں قرطاس کے کینواس پر جو رنگ بکھیرے ہیں، ان میں تازگی اور انوکھا پن ہے۔ شاعر معاشرے سے زیادہ اپنے وجود اور وجود سے زیادہ زندگی کے سروکار کو فوکس کرتا ہے۔ اشعار دیکھیے:

بھرا رہتا ہے کمرے میں اندھیرا ۔۔۔ ہماری نیند بھی اب کھو گئی ہے

بھی ایک کشتی میں جب آ گئے ۔۔۔ انھیں لے کے دریا روانہ ہوا

وہ میری خطاؤں کو فراموش تو کر دے ۔۔۔ جھوٹا ہی سہی اب مجھے رونا نہیں آتا

سیر ساحل سے تو دل اوب گیا ۔۔۔ اب سمندر میں اتر جائیں کیا

کوئی مجھ سے پوچھے کہ اس شعری مجموعے میں نیا کیا ہے؟ تو میرا جواب ہوگا، سوچ نئی ہے اور چیزوں کو دیکھنے کا زاویہ منفرد ہے۔ مجھے ایک بات جو اس مجموعے میں سب سے زیادہ پسند آئی وہ ہے سماجی سروکار کو ذرا سا Tilt کر کے عبید نے نئے معنی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مجھے تو کہیں کہیں ایسا لگا کہ وہ ایک Bioscope لے کر بیٹھا ہے اور چوڑیوں کے ٹوٹے ہوئے رنگین ٹکڑوں کو گھما گھما کر نئے نئے ڈیزائن بنا رہا ہے۔ اشعار دیکھیے:

زندگی ڈھل رہی ہے نئے رنگ میں ۔۔۔ شاعری بھی نئے رنگ کی چاہیے

کاٹتے رہتے ہیں اس کو رات دن ۔۔۔ کھیت اور کھلیان سی ہے زندگی

تہہ در تہہ کھلتی ہی رہتی ہے سدا ۔۔۔ میرا کے دیوان سی ہے زندگی

عبید کی کچھ نظمیں المیہ ہیں تو کچھ لمحہ فکریہ بن جاتی ہیں اور کچھ نظمیں پینٹنگز کے اسٹروکس کا احساس دلا کر کہانی بیان کرتی ہیں۔ رنگ اور نقش سے ان کا ناطہ ہے، اسلیے کینواس بھی بڑا لگتا ہے اور شاعری میں زندگی کے کئی شیڈس آ گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کے شعر نظموں کے synopsis ہیں، نظموں میں وہ پھیل کر بیان ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ نظموں میں یہ پھیلاؤ عیب بھی بن گیا ہے، جیسے 'آج کی لڑکی'۔ عبید پڑاؤ پر دم لے کر منزل کی طرف بڑھنے کی بات نہیں کرتے۔ نظم 'سفر کرنا پڑے گا' میں وہ کہتے ہیں۔ ایک راستہ ختم ہوگا تو مذید راستے نکلیں گے، صرف چلتے رہنا ہے۔ نظموں میں سوالیہ اشارے پوشیدہ ہیں کہ میں ایسا کیوں ہوں؟ اور جیسا ہوں ویسا کیوں ہوں؟ 'کالی رات' کے عنوان سے مرد طوائف پر نظم ہے وہ بڑی سرسری سی لگتی ہے۔ لیکن دیگر میں تازگی اور معنویت کا بھرپور احساس جاگتا ہے۔ ایک بڑی پیاری نظم 'چپ ہو جاؤ! نہیں روتے' تو دل کو چھو جاتی ہے۔ ان کے یہاں تازگی اتنی vergin ہے کہ لگتا ہے کہیں پڑھتے پڑھتے باسی نہ ہو جائے۔ 'گڈریا اور بھیڑیں' اور 'میرے اطراف' اچھی نظمیں ہیں۔ شاعری میں دل کو چھونے والا نیا پن محسوس ہوتا ہے، اسی لیے ہمیں ندا اور علوی یاد آتے ہیں۔ عبید نے اپنے والد مدحت الاختر کے شعری اثرات سے اپنے آپ کو بچا کر رکھا ہے۔ یہ اچھی بات ہے۔ عبید میں نئے شاعروں کی طرح کم وقت میں بہت کچھ نیا کہنے کی عجلت نظر نہیں آتی۔ وہ دھیمے لہجے میں بڑی سادگی کے ساتھ اپنا اطراف رقم کرتا ہے۔ نئے تخلیق کاروں کے پاس نئی عینکیں ہیں، وہ اپنے طور پر دنیا دیکھنا چاہتا ہیں۔ ایک قابل توجہ مجموعہ دینے کے بعد بھی عبید اپنی فنی کاوشوں سے مطمئن نظر نہیں آتے، انھیں آگے بہت دور جانا ہے، اسی لیے تو کہتے ہیں

یہ تو ہے مشقِ سخن حارث میاں ۔۔۔ شاعری کو اک زمانہ چاہیے

■■

خطوط

چند سطریں اور...

حسن کمال کو مبارک باد...

☆شارب ردولوی (لکھنؤ)

گوشۂ جیلانی بانو بہت اچھا ہے۔ مجھے علم نہیں تھا ورنہ میں بھی مضمون لکھتا لیکن اب لکھوں گا۔ حسن کمال کو میری طرف سے بے حد اہم مسئلے پر قلم اٹھانے اور بہت اچھے انداز میں اس کو پیش کرنے پر مبارک باد دیں۔ ان کے مضامین حالاتِ حاضرہ پر اخبارات میں برابر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ میں بہت کم ہی انھیں پڑھ پاتا ہوں لیکن اس کے لیے انھیں خاص طور پر دعائیں۔

ادبی ذوق کا پول کھل گیا...

☆رفیق حسن (پونہ)

نیاورق ۴۴ کا اداریہ بعنوان 'تعصب کی جڑیں' موجودہ لسانی صورتِ حال پر بیباکی سے لکھا ہوا سچائی پر مشتمل اچھا اداریہ ہے۔ افسانوی باب میں ٹھیکرا (عبدالصمد)، کرم جلا کر مجان (حسین الحق)، باؤ زنمبر ۴۴ (ف۔س۔اعجاز) اور سرخ نشان (اظہار الاسلام) معیاری اور پُر اثر افسانے ہیں۔ 'گوشہ جیلانی بانو' مختصر بھی، اور تشنہ بھی، اس میں جو مواد ہے وہ افسانہ نگار کی نہ شخصیت کا احاطہ کرتا ہے نہ فن کا۔ آصف فرخی کا مضمون بس خلوص سے لکھی ہوئی ایک تحریر ہے۔ صغیر افراہیم نے جیلانی بانو کے ایک افسانے کی قرأت میں دو متضاد زوایے ڈھونڈے ہیں یہ زاویہ نظر نیا ضرور ہے لیکن یہ طوالت کی نذر ہو گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ کہنا کچھ چاہتے تھے اور کہہ کچھ گئے۔ اس مضمون میں خود ان کی تضاد بیانی در آئی ہے۔ ابوذر ہاشمی نے افسانہ نگار کی کہانیوں میں نسائی رنگ پر گفتگو کی ہے لیکن رنگ پھیکا ہے اس کے باوجود جیلانی بانو کے افسانوں میں نسائی پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی تحریک نئے نقادوں کو ملتی ہے۔ جیلانی بانو کا افسانہ 'عباس نے کہا...' مشہور افسانہ ہے، اس پر عبدالسمیع کا جائزہ سونے پر سہاگہ۔ اس گوشے میں مظہر الزماں خان کا جیلانی بانو سے لیا ہوا انٹرویو پڑھ کر افسوس ہوا۔ کئی جگہ سوالات میں Repetation ہے اور جوابات غیر زوردار، سرسری اور فراریت آمیز لگے۔ معلوم ہوا کہ محترمہ نے ترقی پسند ادب کے بعد کے ادب کا تو مطالعہ کیا ہی نہیں اور یہ بھی پتہ چلا کہ محترمہ کو ترقی پسند ادب کے نقاد اور فکشن کا بھی گیان نہیں۔ کم از کم وہ اسی ادب کے محاسن بیان کر دیتیں۔ میں یہ باتیں یوں ہی نہیں لکھ رہا ہوں، چاہوں تو اس انٹرویو سے اقتباسات پیش کر سکتا ہوں لیکن مُدیر کے نام لکھے خط میں اس کی گنجائش نہیں۔ قارئین نے یہ انٹرویو پڑھ لیا ہوگا۔ اُنھیں بھی یقیناً حیرت ہوئی ہوگی۔ بہر حال اس انٹرویو سے جیلانی بانو کے ادبی ذوق کا پول کھل گیا۔ اور محترمہ کی تنگ نظری اور ہم عصر ادیبوں کی تخلیقات سے بے توجہی اور بیزارگی ظاہر ہوگئی۔ دیگر مشمولات میں نظام صدیقی، حسن کمال اور اسیم کاویانی کے مضامین دل کو چھوتے ہیں۔ نظمیں اور غزلیں بھی خوب ہیں۔ جاوید صدیقی کا خاکہ 'فقیر بادشاہ' ایم ایف حسین پر لاجواب خاکہ ہے۔ م۔ناگ کے سوانحی ناول 'دکھی من

میرے کا اک باب زبان اسلوب اور مواد کے لحاظ سے دلچسپ ہے۔ گوشہ ارتضی نشاط میں شاعر کی نثری نظمیں پسند آئیں اور دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن' آزاد نظم اور نثری نظم کے تعلق سے ایسی کہی ہیں جوان اصناف کی اہمیت کو ملواتی ہیں۔ جتیندر بلو کا سوانحی کولاژ بھی پسند آیا۔ محمد اسلم پرویز کا مضمون اور نورالحسنین کا جائزہ پُر مغز اور جاندار ہیں۔ کامیو کے ناول کا ترجمہ بھی اچھا اور تجزیہ بھی خوب ہے۔

...جو کچھ لکھا، دل کو چھوتا ہے۔

☆منیر سیفی (پٹنہ)

شمارہ ۴۴ کے سرورق کے بعد پہلے صفحے پر کا اسکیچ ہمارے عہد کا منہ بولتا شاہکار ہے۔ نیز آپ کا اداریہ 'تعصب کی جڑیں' دل دہلا دینے والا ہے۔ 'ہندستانی پرچار سبھا' کے عہدیداران کے لیے دعا کے علاوہ ہمیں سنجیدگی سے غور و فکر بھی کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے ہمیں سر جوڑ کر بیٹھنا ہوگا۔ مشمولہ افسانے عصری آگہی سے مملو ہیں اور ہمارے عہد کی جیتی جاگتی تصاویر ہیں۔ جیلانی بانو ایک لیجنڈ ہیں اور ہمیں ان پر فخر ہے۔ ایک عرصہ کے بعد نظام صدیقی کا 'نئے عہد کی تخلیقیت میں منٹو کی بازیافت' نظر نواز ہوا۔ جو موصوف کی عرق ریزی کا غماز ہے۔ جاوید صدیقی کا خاکہ بہت دلچسپ ہے، مزہ لے کر پڑھا۔ موصوف بات کہنے کا سلیقہ جانتے ہیں اور انھیں زبان و بیان پر بلا کی قدرت حاصل ہے۔ انھوں نے مقبول فدا حسین پر جو کچھ لکھا ہے، دل کو چھوتا ہے۔ مقبول فدا حسین وہ چیز دیکھ لیتے تھے جو دوسروں کو نظر نہیں آتی ہے۔ مادھوری دکشت پر فدا ہونے کی وجہ (میری سمجھ سے) یہی رہی ہوگی۔ م۔ ناگ کا سوانحی ناول اور جتیندر بلو کی آپ بیتی پڑھ کر جہاں طبیعت ملول ہوتی ہے وہیں کچھ کر گزرنے کا ایک نیا حوصلہ بھی ملتا ہے۔ محمد اسلم پرویز نے 'پورا منٹو اور شمس الحق عثمانی' کے تعلق سے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ سلیم خان نے 'خوابیدہ چراغوں کی پرنور داستان' کے حوالے سے نورالحسنین کا ناول 'ایوانوں کے خوابیدہ چراغ' کا بھرپور تجزیہ پیش کیا ہے۔ ناول کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک عہد یعنی مغلیہ سلطنت کا ترجمان ہے۔ البیئر کامیو کا ناول 'طاعون' کا ترجمہ و تلخیص اور اس کا تجزیاتی مطالعہ پیش کر کے ناصر بغدادی نے بڑا کام کیا ہے۔ تبصرے بھی بے لاگ اور متوازن ہیں۔

کتاب دار میں دستیاب مطبوعات

کتاب دار پبلی کیشنز

کلام ☆ ڈاکٹر راحت اندوری ۳۰۰

مشاعرے کی تہذیب اور نہرو سینٹر کے مشاعرے ☆ نہرو سینٹر ۲۰۰

ہندوستان کی جنگ آزادی کے مسلمان مجاہدین (تاریخ) ☆ میوارام گپت ستوریا زیر طبع

پاکستان نامہ (پاکستان پر اخباری کالم) ☆ فیروز اشرف ۲۵۰

اندھی سرنگ (ناول) ☆ ویدراہی ۱۵۰

جہاز پر کیا ہوا؟ (افسانے) ☆ انور قمر ۱۲۰

ایک مردہ سر کی حکایت (افسانے) ☆ ساجد رشید ۱۵۰

دستخط (سہ ماہی نیا ورق کے اداریے) ☆ ساجد رشید ۳۰۰

دوپہر اور دوسرے ڈرامے ☆ ساجد رشید زیر طبع

لنگر خانہ (خاکے) ☆ جاوید صدیقی ۲۵۰

رہو گی تم وہی (ہندی کہانیاں) ☆ سدھا اروڑا ☆ ترجمہ: حیدر جعفری سید ۱۵۰

تازیانہ (شاعری) ☆ جاوید ناصر ۲۰۰

جزیرہ مری عافیت کا (شاعری) ☆ شفیق عباس ۲۰۰

شب کی دیوار میں روزن (شاعری) ☆ عبداللہ کمال ۲۵۰

شعور عروض ☆ شعور اعظمی ۱۲۵

پنکھ ہوتے تو... (ڈرامہ) ☆ محمد اسلم پرویز ۱۰۰

نخلستان کی تلاش (ناول) ☆ رحمن عباس ۵۰

ہنگام جنوں (انتخاب) ☆ محمد ریحان ۱۵۰

مجمیات ☆ نجم الدین ایس. عارف ۲۰۰

انور اسعید ☆ ڈاکٹر شائستہ خان ۲۵۰

اردو کے منتخب افسانے ☆ الیاس شوقی ۶۰

اردو کے منتخب ڈرامے ☆ قاسم امام ۶۰

عرفانِ ادب ۷۰

منتخب غزلیں اور نظمیں ۴۰

انتخاب مخدوم محی الدین ☆ کتاب دار ۳۰

انتخاب اردو نظم ☆ قاسم امام ۳۰

مشاہیر ادب (منتخب ادیبوں کی تصاویر) ۶۰

سہ ماہی نیا ورق ۵۰

خان پبلی کیشنز

ایک اور بجوکا (افسانے) ۱۵۰

مونالیزا کی مسکراہٹ (افسانے) ۱۵۰

فساد، کرفیو، کرفیو کے بعد (منی افسانے) ۱۳۰

یہ ہے بمبئی میری جان (۴ ناولٹ) ۱۵۰

اور بجوکا ننگا ہوگیا! (کہانیاں) ۲۰۰

کل یگ کا بجوکا (یک سطری کہانیاں) ۱۲۰

سلم بچ ملینئر (افسانے اور یک سطری کہانیاں) ۲۰۰

☆ عبدالعزیز خان

قلم پبلی کیشنز

غزل کا محبوب اور دوسرے مضامین ☆ وارث علوی ۲۵۰

کہرام (شاعری) ☆ ارتضیٰ نشاط ۱۵۰

صد حساب آرزو (شاعری) ☆ الیاس شوقی ۱۵۰

فکشن پر مکالمہ (تنقید) ☆ الیاس شوقی ۱۵۰

خیال کی دستک (ڈرامے) ☆ ساگر سرحدی ۶۵

پنکھ کھلے تو (شاعری) ☆ شمیم عباس ۲۵۰

آخری پڑاؤ (افسانے) ☆ جتندر بلو ۲۰۰

درد کی حد سے پرے (افسانے) ☆ جتندر بلو ۲۰۰

چکر (افسانے) ☆ جتندر بلو ۲۰۰

ہوتا ہے شب و روز (ڈرامے) ☆ رفعت شمیم ۱۰۰

دو اہم ڈرامے (ڈرامے) ☆ رفعت شمیم ۱۰۰

شیشے کے کھلونے (ڈرامے) ☆ رفعت شمیم ۷۵

جل کے آگ ہوئے (ڈرامے) ☆ رفعت شمیم ۱۰۰

کاغذ کی کشتیاں (شاعری) ☆ مصطفےٰ شہاب ۲۰۰

کتاب دار میں دستیاب مطبوعات

جب دیوں کے سر اُٹھے (شاعری)
☆ بلال فرید ۱۵۰
تنقیدی تحریریں (تنقید) ☆ احمد سہیل ۱۵۰
چند ادبی شخصیتیں-انتخاب (خاکے)
☆ شاہد احمد دہلوی ۶۵
زمین زمین (شاعری) ☆ اخترالایمان ۷۵
وشواس گھات (ناول) ☆ جتندر بلو ۱۷۵
حاصل یہی (شاعری) ☆ حسن کمال ۱۵۰
مقتدر خواتین برار (تحقیق)
☆ نورالسعید اختر ۲۰۰
سجاد ظہیر کا دورِ اسیری ☆ اندر جہان بھسین ۴۰۰
سر سید برار (تحقیق) ☆ ڈاکٹر نورالسعید اختر ۲۵۰
سوغاتِ دکن (تحقیق) ☆ ڈاکٹر نورالسعید اختر ۲۵۰
غلام صوفی حیدری (تحقیق) ڈاکٹر نورالسعید اختر ۲۰۰
اسلامی ترقی پسندی (تحقیق) ☆ علی جواد زیدی ۱۵۰

کاویانی پبلی کیشنز

انتخابِ گگن (رسالہ گگن کا انتخاب دو جلدوں میں) ۱۲۰۰
ہندستانی مسلمان (رسالہ گگن کا خاص نمبر) ۵۰۰

اردو مرکز پبلی کیشنز

پندرہ پانچ پچھتر (نظمیں) ☆ گلزار ۱۵۰
پچھلے پنے (افسانے، خاکے اور نظمیں) ☆ گلزار ۱۵۰
یہ شہر موہے لگے ہے بن ☆ جابر حسین ۲۵۰
انگارے اور ہتھیلیاں ☆ جابر حسین ۲۵۰

بک ایمپوریم

واردات (افسانے) ☆ پریم چند ۷۵
اردو تنقید پر ایک نظر ☆ کلیم الدین احمد ۲۰۰
اردو شاعری پر ایک نظر (اول) کلیم الدین احمد ۲۰۰
اردو شاعری پر ایک نظر (دوم) کلیم الدین احمد ۴۰۰
آنجکٹو نصاب (یو جی سی نیٹ) ۲۰۰

نیوز ٹاؤن پبلشرز

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار ماہ
ساجد رشید: فن اور شخصیت ۲۰۰
حاضر غائب (افسانے) ☆ اشتیاق سعید ۲۵۰
غلط پتہ (افسانے) ☆ م. ناگ ۱۵۰
چوتھی سیٹ کا مسافر (افسانچے) ☆ م. ناگ ۱۷۵

عرشیہ پبلی کیشنز

دستخط (نیا ورق کے اداریے) ☆ اسیم کاویانی ۳۰۰
شام شعر یاراں ☆ مشتاق احمد یوسفی ۴۹۹
بشر دوستی اور نئی ترقی پسندی ☆ اقبال مجید ۲۳۰
عزازیل (ناول) ☆ یعقوب یاور ۲۵۰
دل مَن (ناول) ☆ یعقوب یاور ۲۵۰
اقبال اور الہ آباد ☆ علی احمد فاطمی ۳۰۰
سردار جعفری کے ڈرامے ☆ شکیل الزماں ۳۰۰
یہ کس کا خواب تماشا ہے (شمیم حنفی کے کالم) ۴۰۰
اردو افسانے کا سفر (اول دوم) ☆ نجمہ رحمانی ۱۰۰۰
تانیثیت اور ادب ☆ انور پاشا ۴۰۰
بلراج مین را ایک نا تمام سفر ☆ سرورالہدیٰ ۳۰۰
کلیات بانی ☆ منچندا بانی ۳۵۰
مہاماری (ناول) ☆ شموئل احمد ۲۰۰
نعمت خانہ (ناول) ☆ خالد جاوید ۴۴۰
خدا کے سائے میں آنکھ مچولی ☆ رحمن عباس ۲۰۰
قاضی عبدالستار: اسرار و گفتار ☆ راشد انور راشد ۳۰۰

کتاب دار میں دستیاب مطبوعات

سب کا ہے ماہتاب (شاعری) ☆ ندا فاضلی ۱۵۰
دن اور داستان (ناول) ☆ انتظار حسین ۲۰۰
چاند گہن (ناول) ☆ انتظار حسین ۲۰۰
قبض زماں (ناول) ☆ شمس الرحمن فاروقی ۲۰۰
نمک (ناول) ☆ اقبال مجید ۲۰۰
طاؤس چمن کی مینا (افسانے) ☆ نیر مسعود ۳۰۰
جرمنی میں نصف صدی ☆ عارف نقوی ۳۰۰
داستان گوئی ☆ محمود فاروقی ۳۰۰
شکست کی آواز (ناول) ☆ عبد الصمد ۳۰۰
ریت (ناول) ☆ بھگوان داس مورول ۳۰۰
کتھا چار جنموں کی ☆ ستیہ پال آنند ۶۰۰
ادبی تحریک و رجحانات (اول، دوم) ۱۶۵۰
نیا افسانہ، نئے نام ☆ نور الحسنین ۱۹۱
ایوانوں کے خوابیدہ چراغ (ناول) ☆ نور الحسنین ۳۸۰
اختر الایمان کی نثری نگارشات ۱۵۰
درد کا شجر ☆ عابد سہیل ۳۵۰
بین (افسانے) ☆ صدیق عالم ۲۵۰
ادب کولاژ ☆ حقانی القاسمی ۳۶۰
منتخب دلت افسانے ☆ متحسن کمار ۶۰۰
کمان (کلیات مظفر حنفی۔ اول) ۵۰۰
تیزاب میں تیرتے پھول (کلیات مظفر حنفی۔ دوم) ۵۰۰
سب سے چھوٹا غم ☆ عابد سہیل ۲۰۰
شہر شہر آوارگی (دیویندر ستیارتھی کے افسانے) ۱۱۱۰
ایک انجانے خوف کی ریہرسل ☆ مشرف عالم ذوقی ۳۰۰
تنقید جستہ جستہ ☆ سید محمد عقیل رضوی ۳۵۰
خانوادۂ ملکہ نورجہاں بیگم کی ادبی خدمات ۲۰۰

ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز

اردو کی بہترین مثنویاں ☆ فرمان فتح پوری ۱۴۰
اردو فکشن کی مختصر تاریخ ☆ فرمان فتح پوری ۲۵۰
اقوال یوسفی اور دیگر مضامین ☆ مظہر احمد ۱۵۰
انڈیا ونس فریڈم (ہماری آزادی) ☆ مولانا آزاد ۲۵۰
آسمانِ فلم کے درخشندہ ستارے ☆ جاوید حمید ۱۸۲
آوازِ دوست ☆ مختار مسعود ۲۰۰
لوحِ ایام ☆ مختار مسعود ۴۰۰
بہار میں مسلم معاشرت ☆ محمد عرفان ۲۲۵
تذکرۂ سخن ورانِ بڑودہ ☆ ظہیر صبا قادری ۳۰۰
تفہیم شبلی ☆ ارشاد نیازی ۴۰۰
جاپان چلو جاپان چلو ☆ مجتبیٰ حسین ۱۰۰
جدید اردو غزل ☆ راحت بدر ۳۰۰
دلی والے دیدہ و شنیدہ (خاکے) ☆ عظیم اختر ۲۲۵
سخن ہائے ناگفتنی ☆ مشفق خواجہ ۲۲۰
سو ہے وہ بھی آدمی ☆ مجتبیٰ حسین ۱۰۰
شامِ شعرِ یاراں ☆ مشتاق احمد یوسفی ۴۰۰
فلم جگت کے پاپا جی، پرتھوی راج ☆ یوگ راج ۷۵
کلیات پروین شاکر ☆ پروین شاکر ۲۰۰
محاسن خطوط غالب مع انتخاب خطوط غالب ۱۸۰
منٹو اور چچا سام ☆ محمد اسلم پرویز ۱۲۰
منٹو خاکے ☆ مظہر احمد ۲۵۰
مہاراشٹر کی مختصر تاریخ ☆ پرویز عالم ۲۴۰
ناقابل فراموش ☆ دیوان سنگھ مفتوں ۵۹۵
وہ جو کہہ گئے ☆ عظیم صدیقی ۲۵۰
ہمارے لیے منٹو صاحب ☆ شمس الرحمن فاروقی ۱۰۰

کتاب دار میں دستیاب مطبوعات

تخلیق کار پبلشرز

باد صبا کا انتظار ☆ سید محمد اشرف ۲۰۰
وہ بھی ایک زمانہ تھا ☆ انیس امروہوی ۲۵۰
وہ جن کی یاد آتی ہے ☆ انیس امروہوی ۳۰۰
ادبی و فلمی شخصیات ☆ شفیق احمد ۳۰۰
گلوکار اعظم محمد رفیع ☆ تنویر حسین ۲۸۰
دلی جو ایک شہر تھا ☆ شاہد احمد دہلوی ۲۸۰
راستہ بند ہے (ناول) ☆ مصطفیٰ کریم ۲۲۰
لیکن ☆ جون ایلیا ۲۰۰
گویا ☆ جون ایلیا ۲۵۰
گمان ☆ جون ایلیا ۲۰۰
شریر بیوی (مزاحیہ افسانے) ☆ عظیم بیگ چغتائی ۱۶۰
کہی ان کہی (افسانے) ☆ علی امام نقوی ۱۶۰
مکھوٹوں کے درمیان (ڈرامے) ☆ صادقہ نواب ۲۵۰
مثنوی یوسف زلیخا ☆ احمد علی شکیل ۲۲۰
شکستہ ستون پر دھوپ (ناول) ☆ عطیہ حسین ۳۰۰
اردو کلچر اور تقسیم کی روایت ☆ شمیم حنفی ۲۸۰
تتلیاں ڈھونڈنے والی (افسانے) ☆ زاہدہ حنا ۲۸۰
عورت زندگی کا زنداں ☆ زاہدہ حنا ۲۵۰
جہانِ دگر (افسانے) ☆ فیاض رفعت ۳۰۰
صاعقہ (ناول) ☆ رضیہ بٹ ۲۵۰
چاردیواری (ناول) ☆ شوکت صدیقی ۵۰۰
گھنگھرو ٹوٹ گئے (سوانح عمری) ☆ قتیل شفائی ۴۴۰
میں ساحر ہوں ۲۹۵
بہشت زہرا ☆ ناصر شرما ۳۶۰
مہر وفا (ناول) ☆ سلیم خان ۲۵۰
فقر و رعنا (ناول) ☆ سلیم خان ۲۵۰

کتابی دنیا

تین ناول نگار ☆ رضی عابدی ۱۰۰
اردو کے بہترین شخصی خاکے ☆ مبین مرزا ۲۵۰
ترجمے کا فن ☆ مرزا حامد بیگ ۶۰
فسانے منٹو کے ☆ خالد اشرف ۳۰۰
کلیات حسرت ☆ حسرت موہانی ۲۵۰
کلیات مومن ☆ مومن خاں مومن ۳۰۰
کلیاتِ نظیر ☆ نظیر اکبر آبادی ۴۰۰
اداس نسلیں ☆ عبداللہ حسین ۳۰۰
کلیات ساحر ☆ ساحر لدھیانوی ۱۵۰
کلیاتِ اصغر ☆ اصغر گونڈوی ۱۰۰
دوگونہ (امیر خسرو کی غزلوں کا اردو ترجمہ) ۱۳۰
ضدی ☆ عصمت چغتائی ۱۰۰
ٹیڑھی لکیر ☆ عصمت چغتائی ۲۵۰
معصومہ ☆ عصمت چغتائی ۱۰۰
سودائی، دل کی دنیا ☆ عصمت چغتائی ۱۲۵
جنگلی کبوتر، باندی، تین اناڑی ☆ عصمت چغتائی ۱۲۵
ایک قطرہ خون ☆ عصمت چغتائی ۲۰۰
عجیب آدمی ☆ عصمت چغتائی ۱۲۵
ابن الوقت ☆ ڈپٹی نذیر احمد ۱۵۰
بنات النعش ☆ ڈپٹی نذیر احمد ۱۲۵
توبۃ النصوح ☆ ڈپٹی نذیر احمد ۱۲۵
فسانہ مبتلا ☆ ڈپٹی نذیر احمد ۱۲۵
مراۃ العروس ☆ ڈپٹی نذیر احمد ۱۲۵
رات ☆ عبداللہ حسین ۱۰۰
عصمت چغتائی کے سو افسانے (۴ حصے) ۱۰۰۰
بدن بازار (طوائفیت کے موضوع پر افسانے) ۱۵۰

نیاورق فاؤنڈیشن کے زیراہتمام دوروزہ سیمی نار

"وارث علوی - حیات وخدمات" ۱۴/اور ۱۵ دسمبر ۲۰۱۳ء

دائیں سے راشد انور راشد، شمس الحق عثمانی، بشر نواز اور الیاس شوقی

شمیم حنفی، شمس الحق عثمانی، بشر نواز، مولانا ابوظفر حسان ندوی، سلام بن رزاق
بیگ احساس، ظہیر انور، ترنم ریاض اور ارجمند آرا

LITERARY MAGAZINE NAYA WARAQ
36/38,Umerkhadi Cross Lane, Mumbai - 400 009.
Post Box No.: 5030, Chinch Bunder Post office, Mumbai - 400 009.